شبلی شناسی کے سو سال

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

شبلی شناسی کے سو سال

(رسائل کے خصوصی شماروں کا مطالعہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شبلی شناسی کے سو سال

(رسائل کے خصوصی شماروں کا مطالعہ)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ادبی دائرہ اعظم گڑھ

(سلسلہ مطبوعات ادبی دائرہ نمبر ۱۶)

- نام کتاب : شبلی شناسی کے سو سال
- مصنف : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
- ناشر : مصنف
- مطبع : اصیلہ پریس، دہلی
- طبع اول : فروری ۲۰۱۴ء
- قیمت : Rs:350/-

ملنے کے پتے

۱۔ ادبی دائرہ ۱۳/۱۰۷، پورہ غلامی، رحمت نگر اعظم گڑھ، ۲۷۶۰۰۱

۲۔ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، شبلی روڈ، اعظم گڑھ، یوپی، ۲۷۶۰۰۱

email: azmi408@gmail.com - Mob: 9838573645

www.drmiazmi.webs.com

شبلی صدی [۱۸ر نومبر ۲۰۱۴ء]
کے موقع پر علامہ شبلی کو ایک خراج عقیدت

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

اپنے بچوں

عفت، عشرت

اور

عثمان و علی

کے نام

ترتیب

دیباچہ

جناب پروفیسر اختر الواسع

اعزازی ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔نئی دہلی

برصغیر کی جن شخصیات کے علمی اور ادبی کارناموں کو بین الاقوامی سطح پر پذیرائی ملی اور اسے ترجمے کے ذریعہ دیگر زبانوں میں منتقل کیا گیا ان میں علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت سب سے نمایاں ہے۔علامہ کی وفات کو ایک صدی ہونے والی ہے مگر ان کے علمی اکتسابات پر نظر ڈالیں تو آج بھی نہ صرف وہ معنویت کے حامل ہیں بلکہ ان کے علمی ذخیرہ سے اخذ و استفادہ کا سلسلہ برابر جاری ہے۔علامہ کی کتابوں اور مقالات پر غور وخوض اور ان کی تعبیر وتفہیم کے ساتھ ساتھ تنقید وتوصیف میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔شبلی علم وتحقیق اور تنقید کا باقاعدہ موضوع بن چکے ہیں۔شبلی کی زندگی میں ہی ان کی کتابوں پر تبصرہ کی شکل میں بہت کچھ لکھا گیا اور ان کے بعد یہ سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔آج اس کا دائرہ برصغیر کی سرحدوں سے کہیں آگے جا چکا ہے۔عالم عرب اور بعض دیگر ممالک میں بھی ترجمہ کے ذریعہ شبلی کی علمی شخصیت سے لوگ واقف ہیں۔علمی دنیا میں علامہ شبلی نعمانی نے برصغیر کی ایسی مستحکم نمائندگی کی ہے کہ اب تک اس کا کوئی بدل نہیں مل سکا۔شبلی کی ایک اور صفت جس کا ذکر ضروری ہے وہ یہ کہ ان کے اندر اسلامی شعائر کے تئیں غیر معمولی حمیت وغیرت تھی۔طبقۂ علماء میں ان جیسی غیرت وحمیت، وسیع اسلامی لٹریچر کی فراہمی اور علمی کاموں میں آیندہ نسل کی تیاری کی مثالیں شاذ ہیں۔شبلی کے علمی مرتبے کے پیش نظر ان پر جس قدر لکھا جائے کم ہے۔خوشی کی بات ہے کہ علمی اور ادبی دونوں حلقوں میں

شبلی پر خاطر خواہ کام ہو رہا ہے۔

حالیہ دہائی کے دوران ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے قلم نے مطالعہ شبلی کے باب میں نہ صرف اعتبار حاصل کیا بلکہ علمی حلقوں نے ان کے کاموں کو سراہا بھی ہے۔ڈاکٹر الیاس الاعظمی نے مطالعہ شبلی کے نئے نئے گوشے وا کیے ہیں۔یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ شبلیات کے مطالعہ میں ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی کی کتابوں سے صرف نظر ممکن نہیں۔''متعلقات شبلی'' سے،''شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' تک ڈاکٹر الیاس اعظمی نے اپنی جس تنقیدی و تحقیقی بصیرت کا ثبوت دیا ہے وہ قابل قدر اور قابل رشک دونوں ہے۔

شبلی جیسی جامع الکمال شخصیت کا مکمل احاطہ چند ایک کتابوں میں تو ممکن ہی نہیں ہے اور ایسی صورت میں جبکہ ان کی بہت سی چیزیں ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں (اخبارات و رسائل) اس کا خاطر خواہ اندازہ مکاتیب شبلی اور شبلی کے نام اہل علم کے خطوط سے لگایا جاسکتا ہے۔(ان چیزوں کو جمع کرنے میں ایک صدی بیت گئی) معارف کے حالیہ شماروں میں اسلامی یونی ورسٹی کے قیام سے متعلق شبلی کی تجویز سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ایسی صورت میں الیاس الاعظمی کے کام کی وقعت یوں بھی دو چند ہو جاتی ہے کہ ان کے پیش نظر پورے شبلی کی بازیافت ہے۔انھوں نے شبلی پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ایک جامع اشاریہ''کتابیات شبلی'' کی صورت میں جمع کر دیا ہے۔اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک صدی کے دوران شبلی پر کس قدر کام ہوا ہے۔چونکہ تاریخ، ادب، سیرت وسوانح کے ساتھ ساتھ شاعری بھی شبلی کا خاص میدان تھا اس لیے ان تمام گوشوں کا احاطہ کرنا کسی ایک فرد کے لیے آسان نہیں۔خوش آیند بات ہے کہ ڈاکٹر الیاس الاعظمی مطالعات شبلی کے حوالے سے انتہائی اہمیت کے حامل کام کر رہے ہیں۔

تازہ ترین کتاب''شبلی شناسی کے سو سال'' دراصل رسائل کے خصوصی شماروں کا مطالعہ ہے۔یہ بارہ رسالے ہیں جنھوں نے علامہ شبلی کے فکر و فن پر خصوصی نمبر شائع کیے تھے۔پہلا رسالہ ماہنامہ خضر راہ ہے جس نے ۱۹۳۰ء میں علامہ شبلی پر خصوصی شمارہ شائع کیا اور آخری

رسالہ اسلام اور عصر جدید ہے جس نے ۲۰۰۸ء میں علامہ شبلی پر خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا تھا، اس میں جہاں علامہ شبلی کے افکار و خیالات پر روشنی ڈالی گئی تھی وہیں ان کی بعض منتخب تحریریں بھی شامل کی گئی تھیں جسے بے حد پسند کیا گیا تھا۔ یہ شبلی شناسی کی ایک صدی کا مطالعہ ہے جس میں علم و دانش کی روایت کا جائزہ بھی ہے اور اس کی خوشگوار یادیں بھی۔ کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ ان میں سے بہت سے رسائل غیر معروف ہیں مگر ان کی علمی و ادبی خدمات نے ان کو شہرت بخش دی۔

تقریباً ایک صدی کو محیط ان رسالوں کی خصوصی اشاعت سے مطالعہ شبلی کی بعض اہم راہیں بھی کھل سکتی ہیں، نیز اس سے یہ بھی اندازہ ہوسکتا کہ ان رسالوں نے شبلی کے کس پہلو کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ شبلی کے معاصر ناقدین اور بعد کے ادوار میں شبلی شناسی کی روایت کو آگے بڑھانے والوں کے بنیادی امتیازات کیا تھے۔ اور اب اس سمت میں کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ دراصل اس کتاب سے لائحہ عمل یا سمت متعین کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ شبلی کا قائم کردہ ادارہ ''دارالمصنفین'' اس کے رفقا اور شبلی پر داد تحقیق دینے والے اپنے لیے موضوعات منتخب کر سکتے ہیں اور ایک پروگرام کے تحت جو گوشے باقی رہ جاتے ہیں ان پر کام بھی کر سکتے ہیں۔ اس سے نہ صرف علم و تحقیق کا کارواں تیز گام ہوگا بلکہ شبلی شناسی کی روایت بھی آگے بڑھے گی۔

ڈاکٹر الیاس الاعظمی کی یہ کوشش اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں شبلی پر منعقد ہونے والی بعض ایسی مجلسوں کی روداد بھی رقم کر دی ہے جس کو جاننے والے بہت کم ہیں اور اس طرح زبانی بیانیہ نہ صرف ضبط تحریر میں آگیا بلکہ شبلی کے بارے میں جو مجلسی خیالات ہیں وہ بھی سامنے آگئے۔ کتاب کا ایک دلچسپ پہلو شبلی سے معنون شاہراہیں اور عمارتیں ہیں، جن کا ذکر بہت کم ہوا ہے۔ عام طور پر شخصیات کے مطالعے اس نوع کے بہت کم ہوئے۔ اس کے لیے بلاشبہ ڈاکٹر الیاس اعظمی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

پروفیسر اختر الواسع

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی

حرف آغاز

زندہ جاوید تحریروں کا یہ امتیاز ہے کہ وہ صدیوں تک اپنی اثر انگیزی قائم رکھتی ہیں۔
علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے علمی، ادبی، تاریخی اور تحقیقی کارناموں پر ایک صدی کا عرصہ گذر چکا ہے، مگر ان کی تابانی میں ابتک کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی اثر انگیزی میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان سے اخذ و استفادہ کی نئی نئی راہیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ان پر مضامین و مقالات اور کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ ملکی اور عالمی زبانوں میں ان کی کتابوں کے ترجمے اور ان کے افکار و خیالات کے تجزیئے ہو رہے ہیں۔ ہندوستانی زبانوں ملیالم، کنڑ، تمل، مراٹھی، بنگالی کے ساتھ عربی، فارسی، تاجک، پشتو اور انگریزی کے اہل قلم نے ان کی نگارشات سے دلچسپی لی ہے اور خاص طور پر ان کے تراجم نے شبلی کی تحریروں کے دائرہ اثر کو ہمہ گیری عطا کر دی ہے، اور ان کی عظمت و انفرادیت کا آوازہ ہندوستان سے نکل کر ایشیا کے دیگر ممالک، عالم اسلام اور یورپ تک بلند ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں [۱۸۹۷-۱۹۶۹ء] سابق صدر جمہوریہ ہند نے ۱۹۶۴ء میں دارالمصنفین کی طلائی تقریبات کے موقع پر اپنے خطبے میں کہا تھا کہ مولانا شبلی کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات نے بلاواسطہ ہندوستان اور بالواسطہ ساری دنیا کے تہذیبی سرمائے میں قابل قدر اضافہ کیا۔ (افکار ذاکر ص ۷۶) اب پچاس سال بعد اس سرمائے میں مزید اس قدر اضافہ ہو چکا ہے کہ اس کا جائزہ ایک مستقل مطالعے اور مقالے کا متقاضی ہے۔

۱۸ر نومبر ۲۰۱۴ء کو علامہ شبلی کی وفات پر ایک صدی مکمل ہو جائے گی اور زندہ قوموں کی طرح شاید ہم بھی اپنے اس عظیم محسن کو یاد کریں اور ان کی گراں قدر علمی، ادبی اور تاریخی

خدمات کے مطالعہ اوران کے اثرات ومعنویت کی تلاش کا نیا سلسلہ شروع ہو۔اس موقع پر بیتی صدی میں علامہ شبلی پر کس قدر علمی وتحقیقی کام انجام پائے۔کون کون سی کتابیں اور مضامین و مقالات لکھے گئے۔اوران میں کس طرح کے خیالات کا اظہار کیا گیا۔افکار ونظریات شبلی سے ملک وملت کو کیا فائدہ پہنچا اور کیا پہنچ سکتا ہے۔؟ یہ اوراس طرح کے دیگر امور کا جائزہ یقینی طور پراس میں شامل ہوگا۔زیر نظر کتاب اسی جائزہ کا ایک ادنیٰ حصہ ہے۔

شبلی شناسی میں سب سے اہم کردار اردو رسائل و جرائد کا ہے۔ان میں سیکڑوں مضامین ومقالات شائع ہوئے۔اور یہ روایت اب بھی باقی ہے بلکہ ادھر چند برسوں میں اس میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔اس سلسلہ کی ایک اہم کوشش رسائل وجرائد کے''شبلی نمبر'' ہیں۔ اب تک ایک درجن رسائل نے''شبلی نمبر'' شائع کئے ہیں۔جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ ماہنامہ خضرراہ ،۲۔ ماہنامہ خاور،۳۔مجلّہ البصیر،۴۔ماہنامہ صبا،۵۔ ماہنامہ درس، ۶۔ ماہنامہ ادیب، ۷۔ کریسنٹ، ۸۔ہفت روزہ ہماری زبان ۹۔ سہ ماہی اردوادب،۱۰۔سہ ماہی فکرونظر،۱۱۔شبلی نیشنل کالج میگزین،۱۲۔سہ ماہی اسلام اورعصر جدید۔

یہ خصوصی شمارے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے مختلف شہروں لکھنؤ، ڈھاکا، چنیوٹ، حیدرآباد، علی گڑھ، لاہور، دہلی اوراعظم گڑھ سے شائع ہوئے۔

اس کتاب میں انہیں رسائل وجرائد کے''شبلی نمبر'' کا مفصل مطالعہ وجائزہ پیش کیا گیا ہے اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان میں شامل مضامین ومقالات کا بھرپور تعارف وتجزیہ اوران کے مشمولات کا مکمل ذکر آجائے۔اور مقالہ نگاروں نے جن بنیادی خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا ذکرانہیں کے الفاظ میں پیش کردیا جائے۔یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ جن مقالات میں موضوع کا حق ادا نہیں ہوا ہے یا جو کمیاں رہ گئی ہیں،ان کی نشاندہی کردی جائے۔

ان رسائل میں علامہ شبلی کی شخصیت اور افکار وخیالات پر جو مضامین لکھے گئے ہیں ان میں بڑا تنوع ہے۔وہ ان کے مختلف شعبہ ہائے زندگی پر محیط ہیں اوران میں شبلیات کے حوالے سے بعض نئے گوشے اور تجزیے بھی سامنے آئے ہیں۔بحیثیت مجموعی اس میں علامہ شبلی

کی حیات وخدمات کا ایک جامع مرقع آ گیا ہے۔

ماہنامہ خضر راہ لکھنو پہلا رسالہ تھا جس نے شبلی نمبر نکالا۔ یہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں بعض ایسے مضامین بھی شامل ہیں جو علامہ شبلی کی زندگی میں سپرد قلم کئے گئے اور آخری ''شبلی نمبر'' ۲۰۰۸ء میں سہ ماہی اسلام اور عصر جدید دہلی کا شائع ہوا ہے۔ اس طرح تقریباً سو سال میں وقفہ وقفہ سے رسائل وجرائد علامہ شبلی کو خراج عقیدت پیش کرتے رہے۔ ان کے ذکر وجائزہ میں شبلی شناسی کے عہد بعہد ارتقاء اور ہر عہد میں علامہ شبلی کے افکار ونظریات کے مطالعے کا ایک منظر نامہ بھی سامنے آتا ہے۔

ہر بڑے مفکر کی طرح علامہ شبلی بھی کشمکش اور اختلاف ونزاع سے دوچار ہوئے۔ ان پر اور ان کے کاموں پر اعتراضات ہوئے۔ ان کی کاوشوں میں کیڑے نکالنے کی کوشش کی گئی۔ یہ ناروا کوششیں ان کی زندگی میں بھی ہوئیں اور ان کی وفات کے بعد بھی برسوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کا ذکر بھی اس کتاب میں کسی قدر آ گیا ہے۔

شروع میں شبلی شناسی کا ایک اجمالی جائزہ بطور مقدمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ان تقریبات کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے جو ہندوستان پاکستان میں علامہ شبلی کی یاد میں منعقد ہوئیں۔ ان تقریبات میں اس عہد کے اہل علم اور مشاہیر علم وادب نے جن تاثرات اور خیالات کا اظہار کیا ہے انہیں بھی نقل کر دیا گیا ہے۔ اور خاص طور پر سیمناروں میں پڑھے گئے مقالات کی فہرست اور عناوین درج کئے گئے ہیں۔ ہندو پاک میں علامہ شبلی کے نام پر اب تک جو ادارے قائم ہوئے اسی حصہ میں ان کی بھی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔

اردو میں غالب شناسی اور اقبال شناسی دو مستقل موضوعات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب واقبال کے افکار ونظریات پر سیکڑوں کتابیں سپرد قلم کی گئی ہیں۔ اور ان پر تحقیقات و تصنیفات کے لئے متعدد ادارے مثلاً غالب انسٹی ٹیوٹ، غالب اکیڈمی، اقبال اکادمی، اقبال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ وغیرہ قائم کیے گئے، جنہوں نے غالب واقبال شناسی کا بڑے پیمانے پر کام کیا۔ شبلی شناسی کی کوشش اگرچہ اس پیمانے پر نہیں ہوئی اور اسے ایک مستقل موضوع کا درجہ بھی

نہیں دیا گیا، حتیٰ کہ خود ان کے قائم کردہ تصنیفی مرکز دارالمصنفین کے مقاصد میں بھی شبلی شناسی شامل نہیں رہی، تاہم حقیقت یہ ہے کہ اردو میں شبلیات کا ایک بڑا ذخیرہ ہے اور یہ حق ہے کہ شبلی کی جامع کمال شخصیت اور ان کے افکار و نظریات اور قوم و ملت کے لئے ان کی جدوجہد کو مستقل موضوع قرار دے کر اس کا مطالعہ کیا جائے۔ زیر نظر جائزہ میں یہ خیال بھی پیش نظر رہا ہے۔

گذشتہ تقریباً ۱۰۰ ارسال کے درمیان ہندو پاک کے جن رسائل کے شبلی نمبر نکلے، ان میں اب بیشتر کم یاب بلکہ نایاب ہیں۔ ماہنامہ خاور ڈھاکا اور ماہنامہ درس علی گڑھ کے ''شبلی نمبر'' ابتک دستیاب نہ ہو سکے، حالانکہ ان کے حصول کے لئے راقم نے علی گڑھ سے ڈھاکا تک کے کتب خانوں اور اہل علم سے رابطہ قائم کیا اور تلاش و جستجو کی حتیٰ الوسع کوشش کی۔ اہل علم سے گذارش ہے کہ اگر ان کے متعلق کسی قسم کی معلومات دستیاب ہوں تو راقم کو ضرور مطلع فرمائیں۔

ماہنامہ خضر راہ کا شبلی نمبر مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ البتہ اس کے مدیر حامد ندوی جو رئیس احمد جعفری [۱۹۱۴ء-۱۹۶۸ء] اور مولانا محمد حنیف ندوی [م: ۱۲/ جولائی ۱۹۸۷ء] کے احباب میں تھے، ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے اور یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ ماہنامہ خضر راہ کب جاری ہوا اور کب تک جاری رہا۔ اس کے چند متفرق شمارے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ اور مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہیں۔ ایک شمارہ [نومبر ۱۹۲۹ء] کتب خانہ شبلی ندوہ میں بھی ہے۔

صبا حیدر آباد اور البصیر چنیوٹ کے شبلی نمبر دارالمصنفین کے کتب خانہ میں اور مجلّہ کریسنٹ لاہور کا شبلی نمبر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ اور جامعہ پنجاب لاہور کے کتب خانہ میں ہے۔ یہیں سے ہمارے کرم فرما ڈاکٹر محمد عبداللہ استاذ شیخ زاید اسلامک سینٹر لاہور نے ہمیں یہ علمی تحفہ بھیجا تھا، اس کے لئے میں ان کا بے حد ممنون ہیں۔ خضر راہ کا شبلی نمبر مکرمی ڈاکٹر مظفر عالم صاحب خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے فراہم کیا ہے۔ اس علم دوستی پر ان کی صحت و تندرستی اور ترقی درجات کے لئے دل سے دعا گو ہوں۔ ادیب کے ''شبلی نمبر'' کا عکس برادر مکرم مولانا سہیل احمد اصلاحی [پرنسپل شبلی انٹر کالج اعظم گڑھ] نے فراہم کیا۔ عزیز دوست

ڈاکٹر عمیر منظر نے بعض مضامین کے عکس اور متعدد مفید مشورے دئے۔ ڈاکٹر محمد ارشد خاں کا بھی مجھے تعاون حاصل رہا۔ اس کرم فرمائی کے لئے میں ان احباب کا بے حد شکر گذار ہوں۔

گرامی قدر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب [ڈائرکٹر دار المصنفین شبلی اکیڈمی] کی شبلیات پر گہری نظر ہے۔ ان کے مفید مشورے اور استاذ گرامی ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی [سابق صدر شعبہ عربی، شبلی نیشنل پی۔ جی۔ کالج اعظم گڑھ] کی تصحیح و نظر ثانی نے اس کی افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ میں اپنے ان بزرگوں کی صحت و سلامتی کے لئے خاص طور پر دعا گو ہوں۔

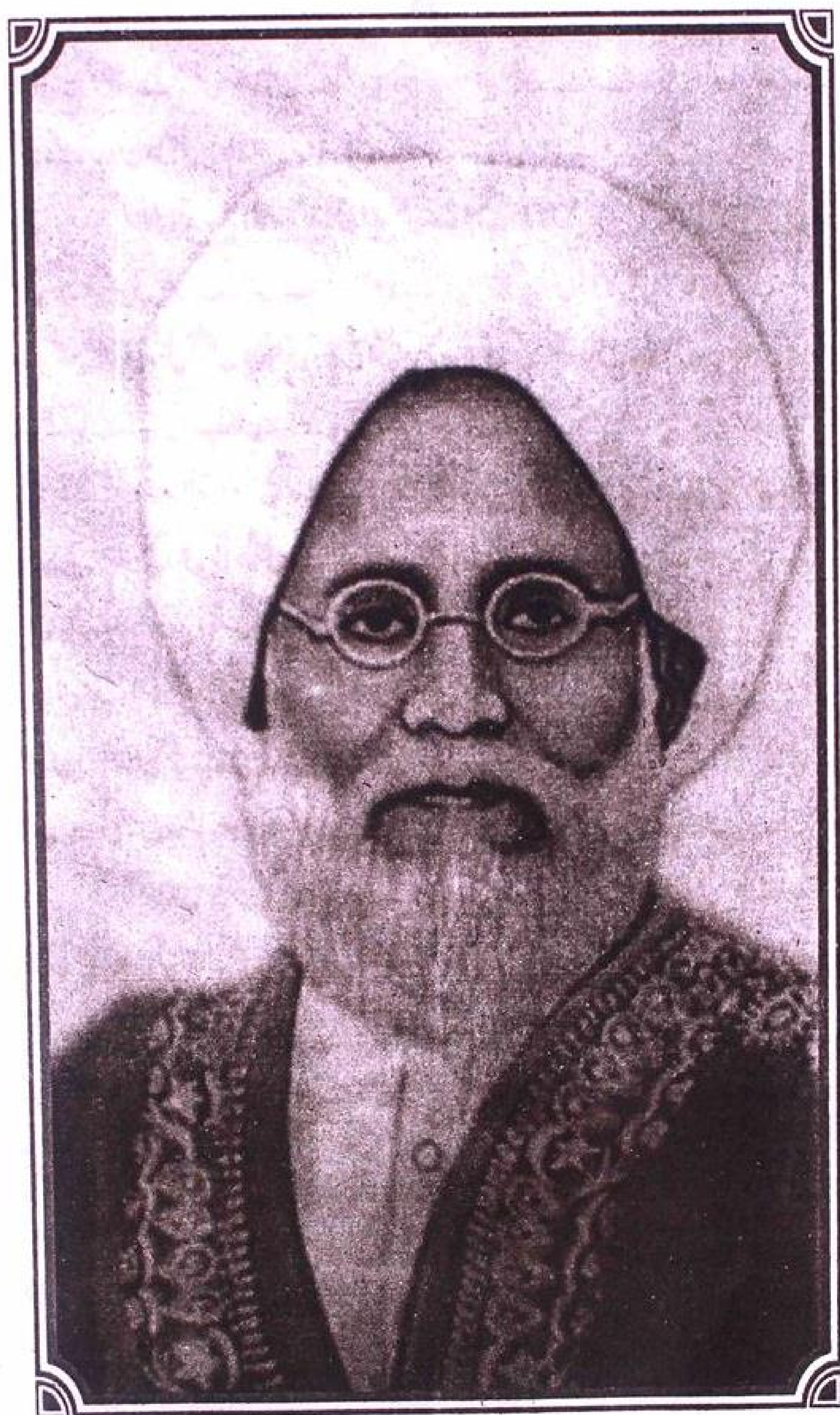
پروفیسر اختر الواسع صاحب ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی علامہ شبلی کے ایک بڑے عقیدت مند ہیں۔ انہوں نے علامہ شبلی کے ۱۵۰ ویں سال ولادت پر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سمینار منعقد کر کے انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ پھر سہ ماہی مجلّہ ''اسلام اور عصر جدید'' کا گراں قدر شبلی نمبر شائع کیا۔ شبلی صدی تقریبات [۲۰۱۴ء] کا بھی وہ اعلان کر چکے ہیں۔ حق تھا کہ زیر نظر کتاب کا وہ مقدمہ لکھتے۔ یہ حق بھی انہوں نے عقیدت شبلی میں سرشار ہو کر ادا کیا ہے۔ اس کے لئے میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

آخر میں موضوع کی مناسبت سے ایک ضمیمہ ''ماہنامہ لسان الصدق اور علامہ شبلی'' شامل کیا ہے۔ یہ مقالہ بھی اصلاً ایک رسالہ کی شبلی شناسی ہی کا جائزہ ہے، بلکہ لسان الصدق پہلا رسالہ ہے جس نے فکر شبلی کی اولاً ترجمانی کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اس رسالہ میں علامہ شبلی کے متعلق جو کچھ شائع ہوا ہے اس کی تمام تفصیلات بالخصوص انجمن ترقی اردو کے سلسلہ میں علامہ شبلی کی ابتدائی کاوشوں کا مفصل ذکر آ گیا ہے۔

۱۵ر جنوری ۲۰۱۴ء

محمد الیاس الاعظمی

رفیق اعزازی، دار المصنفین اعظم گڑھ



علامہ محمد شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء

شبلی شناسی

علامہ شبلیؒ [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے فضل وکمال اور لازوال علمی وتحقیقی کارناموں کا مطالعہ، ان کی اہمیت وافادیت اور عہد حاضر میں ان کی معنویت کا ذکر، ان کی تصنیفات کی مقبولیت اور ملکی و عالمی سطح پر ہونے والے ان کے تراجم کی تفصیلات کی جمع وتدوین شبلی شناسی کا بنیادی حصہ ہے۔ راقم الحروف نے ۵۲۷ رصفحات کی کتاب ''آثار شبلی'' میں یہی تفصیلات یکجا کرنے اور انہیں سلیقہ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

شبلی شناسی کے سلسلے کا دوسرا اہم اور بنیادی کام یہ ہے کہ علامہ شبلی کی کاوشوں اور کارناموں کے مطالعہ وتجزیہ پر دنیا بھر کے اہل قلم نے کیا کام کیا ہے۔ کون کون سی کتابیں اور کس قدر مضامین ومقالات لکھے گئے۔ بالفاظ دیگر شبلی کے علمی، ادبی اور تاریخی کارناموں کا کس قدر جائزہ لیا گیا اور اس کا کن کن نوعیتوں اور جہتوں سے مطالعہ کیا گیا۔ اس کی ایک ایک تفصیل اور اشاریہ'' کتابیات شبلی'' میں درج کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں دارالمصنفین نے شائع کی ہیں۔

عالم اسلام میں علامہ شبلی کو کس درجہ شہرت ومقبولیت ملی، ان کی تصنیفات کے ساتھ کس درجہ اعتنا کیا گیا اور ان کی تصنیفات کے تراجم کی کون کون سی کوششیں ہوئیں اور کن اہل قلم نے شبلی شناسی پر توجہ دی اور انہوں نے کون سے کارنامے انجام دئے۔ اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ اس کی تفصیلات کئی برس پہلے ''عالم اسلام میں شبلی شناسی'' کے عنوان سے ایک طویل مقالہ میں قلم بند کی گئی تھیں۔ یہ مقالہ ''متعلقات شبلی'' میں شامل ہے۔

ان کوششوں کے علاوہ شبلی شناسی کے کئی ایسے گوشے ہیں جن کا ذکر ومطالعہ اب بھی

بڑی اہمیت رکھتا ہے، مثلاً علامہ شبلی پر حیات شبلی سے آثار شبلی تک جو کتابیں لکھی گئیں وہ کس درجہ معیاری تھیں یا یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالات کے حوالہ سے شبلی شناسی پر کس درجہ توجہ دی گئی اور شبلی شناسی میں ان کا کیا حصہ ہے۔؟ قدر دان شبلی نے ان کی افکار ونظریات کی تفہیم وتوسیع کے لئے کون کون سے ادارے قائم کئے۔ اہل علم وکمال نے سمینار اور یوم شبلی کے ذریعہ کس درجہ شبلی شناسی میں حصہ لیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رسائل وجرائد نے شبلی شناسی میں کیا کردار ادا کیا؟۔ ان کے ذکر کے بغیر سلسلہ ''شبلی شناسی'' کو مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

شبلی شناسی کا آغاز سر سید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] کے قلم سے ہوا۔ ۱۸۸۷ء میں شبلی کی پہلی تاریخی کتاب ''المامون'' شائع ہوئی، اس کا پہلا ایڈیشن چند ماہ میں ختم ہو گیا، اس کا دوسرا ایڈیشن سر سید احمد خاں کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا۔ اس وقت شبلی کی کتاب پر سر سید کا مقدمہ لکھنا ایک بڑی بات تھی۔ سر سید اپنے عہد میں مسلمانوں کے سب سے بڑے بہی خواہ تھے۔ وہ شبلی سے چالیس سال بڑے تھے۔ ان کی سادہ وسلیس نثر اردو میں داد تصنیف دینے والوں کے لئے نمونہ تھی۔ در اصل انہیں نے اردو نثر کو ذرہ سے آفتاب بنایا۔ انہوں نے المامون کے دیباچہ میں شبلی کے اسلوب نگارش کی بھرپور داد دی اور لکھا کہ:

> ''ہمارے لائق مصنف نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بھی بدستور اپنی اصل صورت پر موجود ہے۔ جو خوب صورت ہے، خوب صورت ہے، جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے۔ نہ خوب صورتی کو زیادہ خوب صورت بنایا اور نہ بھونڈے پن کو بھونڈا اور در حقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے۔'' (المامون دیباچہ ص ۳)

شبلی کی تصنیفی کدوکاوش اور استناد کے بارے میں لکھا کہ:

> ''مصنف نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس کا حوالہ معتبر ماخذ سے نہ دیا ہو۔ ہر ایک جزئی بات پر بھی اس کتاب کا جس سے وہ بات لی گئی ہے

حوالہ دیا ہے۔ اس کے حاشیوں پر جس قدر کتابوں کے حوالے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے میں کس قدر جاں کاہی ہوئی ہوگی اور مصنف کو کتنے ہزاروں ورق الٹنے پڑے ہوں گے۔''

(المامون ص۳۔ دیباچہ)

یہی وہ پہلی تحریر ہے جس نے ہندوستان میں اہل علم کے ایک بڑے طبقے کو شبلی کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے بعد ۱۸۹۲ء میں شبلی کا ایک اور معرکۃ الآراء تحقیقی کارنامہ سامنے آیا۔ انہوں نے الجزیہ کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں جزیہ کی حقیقت اور حیثیت واضح کی اور اس سلسلے میں مخالفین کے الزامات کا جائزہ لے کر ثابت کیا کہ جزیہ کوئی ظلم و جبر نہ تھا بلکہ غیر قوموں کے حق میں ایک رحمت تھا۔ اس تحقیق کے بارے میں سر سید نے لکھا کہ:

''اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے کالج کے پروفیسر مولوی محمد شبلی نعمانی نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بہت فائدہ پہونچایا ہے۔ المامون، سیرۃ النعمان، کتب خانہ اسکندریہ اور الجزیہ بے مثل اور بے نظیر کتابیں ہیں۔ اگر وہ نعوذ باللہ رسالہ الجزیہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہیں کہ فاتو بسورۃ من مثلہ تو کچھ تعجب نہ ہوگا۔ ایسا بے جا اور غلط الزام مسلمانوں پر تھا جس کا آج تک کسی نے ایسے عمدگی سے حل نہیں کیا تھا۔''

(مقالات سر سید جلد ۷ ص ۳۲۵)

سبقت کی نیت سے مولوی سراج الدین ایڈیٹر سرمور گزٹ ناہن [راجستھان] نے سیرۃ الفاروق لکھی تو سر سید نے ان کی اس کوشش کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اس موقع پر انہوں نے یہ بھی لکھا کہ ''اگر ایک ہی موضوع پر دس شخص بھی لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر نرالی ہوگی۔ (بحوالہ حیات شبلی ص ۲۳۵)

سر سید احمد خاں کے قلم سے شبلی کی تحریروں کی یہ ایسی تحسین و ستائش تھی جس کی مثال ان کی بعد کی زندگی میں بھی مشکل ہی سے ملے گی۔

علامہ شبلی کی زندگی میں ان کے علم وفضل اور بلند مقام ومرتبہ کا علی العموم اعتراف کیا جاتا تھا۔ ان کے علمی کمالات کی بنا پر ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کی نظر انتخاب ان پر پڑی۔ چنانچہ امیر کابل نے دارالترجمہ کی سربراہی کے لئے ان کا انتخاب کیا۔ (حیات شبلی ص ۲۷۸) شیخ رشید رضا مصری [م: ۲۲/اگست ۱۹۳۵ء] صاحب تفسیر المنار نے جامع ازہر مصر کی اصلاح کے لئے جن علماء کو نامزد کیا تھا اس میں ایک نام علامہ شبلی کا بھی تھا۔ اسی طرح جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے بام ودر سنوارنے کے لئے بھی ان کا اور ان کے عزیز و نامور شاگرد علامہ حمید الدین فراہی [۱۸۶۴-۱۹۳۰ء] کا نام تجویز ہوا، جس کے ایک رکن علامہ اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] بھی تھے۔ (ماہنامہ معارف، دسمبر ۲۰۱۳ء ص ۴۶۴)

سرسید کے علاوہ علامہ شبلی کی زندگی میں ان کے فضل وکمال کا اعتراف کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان کے احباب ومعاصرین بالخصوص خواجہ الطاف حسین حالی [۱۸۳۷-۱۹۱۴ء] نواب محسن الملک [۱۸۳۷-۱۹۰۷ء] ڈپٹی نذیر احمد دہلوی [۱۸۳۶-۱۹۱۲ء] منشی ذکاء اللہ [۱۸۳۲-۱۹۱۰ء] مولوی عبدالحلیم شرر [۱۸۶۰-۱۹۲۶ء] مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] پادری جان ملکم اور مہدی حسن افادی [۱۸۷۰-۱۹۲۱ء] وغیرہ نے عظمت شبلی اور تصنیفات شبلی کی بلند پایگی کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کیا اور بعد میں بھی یہ سلسلہ قائم رہا۔ معاصرین شبلی کے اعترافات پر مشتمل بیش تر تحریریں ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے اپنی کتاب ''شبلی معاصرین کی نظر میں'' [لکھنو: ۲۰۰۵ء] میں اور منظوم تاثرات راقم نے ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' [اعظم گڑھ: ۲۰۱۱ء] میں یکجا کردئے ہیں۔

شبلی شناسی کا ایک اور پہلو جو علی العموم نظروں سے اوجھل رہا، وہ علامہ شبلی کی تصنیفات کے جواب میں لکھی جانے والی کتابیں اور ان کا حلقہ اثر ہے۔ علامہ شبلی نے سیرۃ النعمان لکھی تو اس کے جواب میں مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی [م: ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء] نے حسن البیان فیما فی سیرۃ النعمان اور قزلباش نے ریویو سیرۃ النعمان [مطبوعہ ۱۸۹۳ء] لکھی۔ ۱۸۹۹ء میں الفاروق شائع ہوئی تو مرزا عابد علی بیگ قزلباش نے دو جلدوں میں الفرق [مطبوعہ:

۸-۱۹۰۷ء] لکھی۔ موازنہ انیس و دبیر [مطبوعہ: ۱۹۰۷ء] نکلی تو ردالموازنہ [مطبوعہ: ۱۹۰۷ء[تردیدالموازنہ [مطبوعہ ۱۹۱۰ء] اور المیز ان [مطبوعہ: ۱۹۰۸ء لکھی گئیں، یہ سلسلہ علامہ شبلی کی وفات کے بعد بھی جاری رہا، بلکہ اب تک جاری ہے۔ شعرالعجم پر تنقید شعرالعجم [۱۹۴۲ء] اور سیرۃ النبیؐ پر ''البحث القوی عن سیرۃ النبی'' اور ''مولانا شبلی بحثیت سیرت نگار'' اسی سلسلہ کی کتابیں ہیں۔ غرض ردوقدح اور جواباً لکھی جانے والی مذکورہ کتابوں کا بھی شبلی شناسی میں کم حصہ نہیں۔ یہ کتابیں اگرچہ ایک محدود حلقے میں پڑھی گئیں تاہم ان سے علامہ شبلی کے دائرہ اثر میں وسعت پیدا ہوئی۔

علامہ شبلی کی وفات [۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء] کے بعد شبلی شناسی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ شبلی کی شخصیت، تصنیفات اور افکار و خیالات کے مطالعہ و تجزیہ پر متعدد مضامین و مقالات اور کتابیں لکھی گئیں۔ اس دور میں سب سے اہم کارنامہ جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے انجام دیا۔ انہوں نے دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شبلی کی تقریباً تمام کتابوں کو اہتمام سے شائع کیا۔ مقالات شبلی، خطبات شبلی اور مکاتیب شبلی جمع کر کے گیارہ جلدوں میں شائع کیا اور آخر میں حیات شبلی جیسی معرکۃ الآرا سوانح عمری لکھی، جسے شبلی شناسی کے میدان میں سنگ میل کا درجہ حاصل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی زندگی کے آخری لمحات تک فکر شبلی کے شارح و ترجمان رہے۔

علامہ شبلی کے ایک اور عزیز شاگرد مولانا مسعود علی ندوی [۱۸۸۹-۱۹۶۷ء] کا فکر شبلی کی توسیع میں بہت نمایاں حصہ ہے۔ علامہ شبلی نے دارالمصنفین قائم کیا تو سب سے پہلے وہ اعظم گڑھ آئے، اور اس جگہ کو جہاں آج دارالمصنفین قائم ہے اسے دارالمصنفین کے قیام کے لئے بہتر جگہ قرار دیا۔ (مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۰۱) پھر علامہ شبلی کی وفات کے بعد بھی وہی سب سے پہلے اعظم گڑھ آئے اور اس طرح آئے کہ اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

دارالمصنفین قائم ہوا تو اس کے شعبہ علمی کو مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی نے سنبھالا اور شعبہ انتظامی مولانا مسعود علی ندوی کے ذمہ آیا۔ شعبہ علمی نے بڑے پیمانہ پر

تصنیف وتالیف کا کارنامہ انجام دیا اور شعبہ انتظامی نے کتابت، طباعت اور اشاعت کا کام کیا۔ نیز یہی شعبہ مالیات کی فراہمی اور نظماء ورفقاء کی تنخواہوں کا بھی نظم کرتا ہے۔ مولانا مسعود علی ندوی عملی اور انتظامی شخص تھے۔ ان کی انتظامی صلاحیتوں کے علامہ شبلی بھی معترف تھے۔ (مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۰۳)

چنانچہ انہوں نے اس قدر عمدہ نظم وانتظام کیا کہ آج تک اس کی مثال دی جاتی ہے، انہوں نے نہ صرف رفقائے دارالمصنفین کی کتابیں شائع کیں بلکہ علامہ شبلی کی تمام کتابیں ایک ایک کر کے شائع کیں۔ ان کے دور اہتمام کی تمام مطبوعات پر ''باہتمام مولوی مسعود علی ندوی'' لکھا ہوا ہے۔

انہیں عمارتوں کی تعمیر کا بڑا عمدہ ذوق تھا، بلکہ ایک زمانہ میں انہیں اعظم گڑھ کا شاہ جہاں کہا جاتا تھا۔ دارالمصنفین کی تمام اہم عمارتیں مہمان خانہ، کتب خانہ، مسجد، دفتر اور معارف پریس کی عمارتیں انہیں کے ذوق تعمیر کا نمونہ ہیں۔ اس کے علاوہ شبلی کالج کا کانوکیشن ہال بھی انہیں کا تعمیر کردہ ہے۔ یہ عمارتیں آج بھی حسن تعمیر کا نمونہ خیال کی جاتی ہیں۔ انہیں اپنے استاذ علامہ شبلی سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اس کا ایک بڑا مظہر دارالمصنفین کے قیام و انصرام میں ان کی حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی تھی جس میں انہوں نے اپنی پوری زندگی صرف کردی۔ ان کا حلقہ احباب بھی بے حد وسیع تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو ان کے خاص احباب میں تھے۔

علامہ شبلی کے دیگر تلامذہ اقبال احمد خاں سہیل [۱۸۸۶-۱۹۵۵ء] اور مولانا عبدالسلام ندوی [۱۸۸۲-۱۹۵۶ء] نے بھی وسعت بھر علامہ شبلی کی خدمات اور ان کے افکار و خیالات کی توسیع وترویج میں حصہ لیا۔ اقبال احمد خاں سہیل نے سیرت شبلی اور مولانا عبدالسلام ندوی نے حیات شبلی [غیر مطبوعہ] لکھی۔ خطبات شبلی کی جمع وتدوین کا کام بھی مولانا عبدالسلام ندوی نے انجام دیا۔ سیرۃ النبی کی تالیف میں بھی انہوں نے حصہ لیا۔ اسی طرح فکر شبلی کی توسیع میں مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنی تصنیفات کے ذریعہ حصہ لیا تو مولانا اقبال احمد خاں سہیل

نے اپنی شاعری کے حوالے سے یہ خدمت انجام دی۔ چونکہ اس طرح کی تمام تفصیلات راقم الحروف کی تصنیفات ''متعلقات شبلی'' اور'' آثار شبلی'' میں آگئی ہیں،اس لئے یہاں ان سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

جامعات میں شبلی شناسی

ہندو پاک یا دیگر ممالک کی یونیورسٹیوں میں شبلی پر جو تحقیقی مقالے لکھے گئے ان کی مکمل تفصیل اگر چہ یکجا دستیاب نہیں تاہم رسائل وجرائد میں وقتاً فوقتاً جامعات میں لکھے گئے مقالات کی جو فہرستیں شائع ہوئی ہیں یا انٹرنیٹ پر موجود ہیں ان کی مدد سے راقم نے'' کتابیات شبلی''میں ان کی ایک فہرست درج کی ہے۔ ماہر اقبالیات ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے پاکستان میں لکھے جانے والے تحقیقی مقالات پر مشتمل ایک کتاب'' جامعات میں اردو تحقیق'' مرتب کی ہے۔ مذکورہ فہرست تیار کرنے میں اس سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اس طرح اب تک جامعات میں ایم.اے.ایم.فل.اور پی.ایچ.ڈی.کے لئے لکھے جانے والے مقالات کی تعداد ۴۲ر تک پہونچتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جامعات میں شبلی کی شخصیت اور خدمات کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی مقالات لکھے گئے،البتہ شبلی کی ادبی،تنقیدی،تاریخی اور سوانحی خدمات پر مقالہ نگاروں کی توجہ زیادہ رہی۔ ان کے تفصیلی مطالعے کی ضرورت ہے۔ ابتک جن یونیورسٹیوں میں شبلی پر مقالات لکھے گئے ہیں ان کی فہرست اور تعداد یہ ہے۔

ا۔انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی ملیشیا	ار مقالہ
۲۔بنارس ہندو یونیورسٹی	ار مقالہ
۳۔بہار یونیورسٹی،مظفر پور	۴ر مقالات
۴۔پنجاب یونیورسٹی،لاہور	۲ر مقالہ اردو،فارسی
۵۔پورو انچل یونیورسٹی جون پور	۳ر مقالات
۶۔جامعہ عثمانیہ حیدرآباد	ار مقالہ

۷۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی	ا؍مقالہ
۸۔ حیدر آباد سینٹرل یونیورسٹی	ا؍مقالہ
۹۔ دہلی یونیورسٹی دہلی	۶؍مقالات
۱۰۔ راجستھان یونیورسٹی	ا؍مقالہ
۱۱۔ رانچی یونیورسٹی	ا؍مقالہ
۱۲۔ سندھ یونیورسٹی	۲؍مقالہ
۱۳۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد	۲؍مقالات
۱۴۔ قاہرہ یونیورسٹی، مصر	ا؍مقالہ
۱۵۔ کالی کٹ یونیورسٹی کیرالا	ا؍مقالہ
۱۶۔ کراچی یونیورسٹی	ا؍مقالہ
۱۷۔ کشمیر یونیورسٹی	ا؍مقالہ
۱۸۔ گورکھپور یونیورسٹی	ا؍مقالہ
۱۹۔ لکھنؤ یونیورسٹی	ا؍مقالہ
۲۰۔ للت نارائن متھلا یونیورسٹی	ا؍مقالہ
۲۱۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۵؍مقالات
۲۲۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی	۲؍مقالات
۲۳۔ میک گل یونیورسٹی	ا؍مقالہ
۲۲۔ ناگ پور یونیورسٹی	ا؍مقالہ

یقیناً ان کے علاوہ بھی تحقیقی مقالات لکھے گئے ہوں گے جن تک ہماری رسائی نہیں ہوسکی ہوگی مگر جو تفصیلات دستیاب ہیں وہ یقینی طور پر بہت اہم ہیں۔ مذکورہ بالا مقالات کے عناوین سے اندازہ ہوتا ہے کہ جامعات میں علمی اشتراک نہ ہونے اور منصوبہ بندی کے فقدان کی وجہ سے ایک ہی موضوع پر کئی مقالات لکھے گئے۔ اس کمی کے باوجود معیار تحقیق کے لحاظ

سے بعض بڑے اہم ،محققانہ اور قابل قدر مقالات بھی لکھے گئے ۔مثلاً ڈاکٹر سید نحی احمد ہاشمی [۱۹۲۵-۱۹۹۵ء] کا مقالہ ''شبلی کا ذہنی ارتقاء''، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی [۱۹۱۵-۱۹۹۸ء] کا مقالہ ''تصانیف شبلی'' جو بعد میں ''شبلی ایک دبستان'' کے نام سے مکتبہ عارفین ڈھاکا سے چھپا، اسی طرح عبداللطیف اعظمی [۱۹۱۷-۲۰۰۲ء] کا مقالہ ''مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں'' وغیرہ۔ بحیثیت مجموعی جامعات میں علامہ شبلی پر تحقیقی مقالات لکھنے کی رفتار آہستہ روی کا شکار رہی اور شعبہ کے ذمہ داروں نے بھر پور توجہ نہیں دی۔ تاہم جو کوششیں ہوئیں وہ بلاشبہ بڑی اہم اور قابل قدر ہیں۔ اردو کے معماروں بالخصوص اردو کے عناصر خمسہ پر یونیورسٹیوں میں جو تحقیقی مقالات لکھے گئے ہیں اگر ان کو پیش نظر رکھا جائے تو کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے علامہ شبلی زیادہ مقبول رہے۔

شبلی اسکول رکالج رشاہراہیں اور بزم شبلی وغیرہ

علامہ شبلی کی خدمات اور کارناموں سے متاثر ہو کر قدر دانان شبلی نے ان کے نام سے اسکول رکالج اور ادبی تنظیمیں قائم کیں۔ شبلی شناسی کا یہ بھی ایک اہم حصہ ہے، مگر ایک صدی کی طویل تاریخ میں قدر دانان شبلی کی ان کوششوں کا ذکر مشکل ہے، اس لئے کہ اس کی تفصیلات کہیں دستیاب نہیں اور نہ انہیں معلوم کرنے کا کوئی قرینہ ہے۔ البتہ مطالعہ کے دوران جو معلومات ہاتھ آگئی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

علامہ شبلی نے اعظم گڑھ میں دو تعلیمی اداروں کی بنیاد رکھی تھی ۔ایک شہر اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول کے نام سے اور دوسرا اپنے مولد موضع بندول میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان دونوں کو ان کے نام سے منسوب کیا گیا۔ مدرسہ بندول کا نام فیضان شبلی اور نیشنل اسکول کا شبلی نیشنل اسکول رکھا گیا۔ برادری کے لوگوں نے اسے بڑی ترقی دی، شبلی نیشنل اسکول پہلے انٹر کالج پھر ڈگری کالج ہوا، اب دونوں ادارے علاحدہ علاحدہ احاطہ میں قائم ہیں اور تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اعظم گڑھ مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی جس کی زیر نگرانی شبلی نیشنل انٹر کالج و ڈگری کالج سرگرم سفر ہیں، اس نے شبلی کے نام پر ایک اور تعلیمی ادارہ شبلی گرلس کالج قائم کیا ہے۔ موضع بندول میں فیضان شبلی کے علاوہ شبلی نرسری اسکول، شبلی لائبریری اور شبلی ویلفیر سوسائٹی بھی علامہ شبلی نام پر قائم ہیں۔ شبلی نرسری اسکول کی ایک شاخ موضع املو میں بھی قائم کی گئی ہے۔ دارالمصنفین کے سابق ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے صاحبزادے محمد طارق نے علامہ شبلی ہی کے نام پر شبلی چلڈرن اسکول نظام آباد میں قائم کیا ہے۔

اعظم گڑھ میں دو شاہراہیں بھی علامہ شبلی سے منسوب ہیں۔ دارالمصنفین کے سامنے جو روڈ ہے وہ شبلی روڈ ہے۔ اسی طرح علامہ شبلی کے گاؤں جانے والا روڈ بھی جے گہاں سے بندول تک شبلی روڈ ہے۔ اعظم گڑھ کے علاوہ ہندوستان کے کئی اور شہروں دہلی، حیدرآباد اور علی گڑھ وغیرہ میں بعض روڈ ان سے منسوب اور شبلی روڈ کہلاتی ہیں۔ ایک شاہراہ لاہور میں بھی ان کے نام پر ہے۔ علی گڑھ میں شبلی باغ، نئی ممبئی میں شبلی نگر اور حیدرآباد میں شبلی گنج محلے بھی انہی کے نام سے منسوب ہیں۔

۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کا جب باقاعدہ رجسٹریشن ہوا تو اس کے نام میں بھی شبلی اکیڈمی کا اضافہ کیا گیا۔ اسی زمانہ ۱۹۱۵ء میں چودھری رحمت علی [۱۸۹۷-۱۹۵۱ء] نے لاہور میں بزم شبلی قائم کی۔ انہیں علامہ شبلی سے بڑی عقیدت تھی۔

علامہ شبلی نعمانی کی وفات کے بعد ان کے ایک ممدوح اور مشہور انشاپرداز مہدی حسن افادی نے ''شبلی سوسائٹی'' کے عنوان سے ایک دلچسپ مضمون لکھا اور ''شبلی سوسائٹی'' قائم کرنے کا خیال پیش کیا۔ یہ مضمون ''افادات مہدی'' میں شامل ہے۔

آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں حافظ نذر احمد [۱۹۱۹-۲۰۱۱ء] نے چوک گڑھی شاہو لاہور پاکستان میں شبلی کالج قائم کیا۔ حافظ نذر احمد مخلص، نیک دل اور بڑے پاکباز شخص تھے۔ متعدد کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ پوری زندگی خدمت قرآن میں گذاری۔ قرآن مجید کی تعلیم کے متعلق انہوں کئی کتابیں لکھیں۔ اس سلسلے کا ان کا سب سے بڑا کارنامہ آسان اردو ترجمہ

قرآن ہے، جو ہندی، سندھی اور انگریزی زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا۔

حافظ نذر احمد اسلامیہ کالج لاہور سے وابستہ تھے۔ انہوں نے ''جائزہ مدارس عربیہ پاکستان'' کے عنوان سے ایک تحقیقی کتاب لکھی، جس کو علی العموم پسند کیا گیا، مگر شاید یہ کام اسلامیہ کالج کے ذمہ داروں کو کسی وجہ سے پسند نہیں آیا۔ چنانچہ حافظ نذر احمد کو اسلامیہ کالج سے علاحدہ کر دیا گیا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ انہیں شبلی کالج کی خدمت کا پورا موقع ہاتھ آ گیا۔ شبلی کالج لاہور پچھلے پہر کا اسکول تھا۔ حافظ نذر احمد نے اسے صبح کے اسکول کا درجہ دلایا۔ اس کی تعلیم کا آغاز ان کے درس سے ہوتا تھا۔ حافظ نذر احمد ایک دن شبلی کالج کے طلبہ کے ہاتھ میں بائبل کورس دیکھ کر تڑپ اٹھے جو انہیں مسیحیوں کی طرف سے فراہم کئے گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے قرآنی تعلیمات پر مبنی یکے بعد دیگرے پانچ مراسلاتی نصاب تیار کئے۔ وہ خود ہی انہیں چھپواتے، پیک کرتے، ٹکٹ لگاتے اور لوگوں کو مفت بھیجتے۔ یہ کام انہوں نے عرصہ تک فی سبیل اللہ انجام دیا۔ اس سے لاکھوں لوگوں نے فائدہ اٹھایا، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

حافظ نذر احمد کو علامہ شبلی سے بڑی عقیدت تھی۔ انہوں نے نہ صرف ان کے نام پر کالج قائم کیا بلکہ ایک بار لاہور میں بڑے اہتمام سے یوم شبلی بھی منعقد کیا۔ بعد میں اس میں پیش کئے گئے مقالات کو کتابی صورت میں ''مقالات یوم شبلی'' کے نام سے شائع کیا۔ اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔ شبلی کالج لاہور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۹۲ء تک قائم رہا۔ اس کے بعد غالباً حافظ نذر احمد کی معذوری کے سبب ختم ہو گیا۔

مولانا سعید انصاری وقفہ وقفہ سے دو بار دارالمصنفین کے رفیق مقرر ہوئے۔ آخر میں وہ دائرہ معارف اسلامیہ لاہور سے وابستہ ہو گئے تھے۔ لاہور میں انہوں نے علامہ شبلی کی یادگار میں شبلی مرکز قائم کیا۔ اس سے انہوں نے کئی کتابیں شائع کیں۔ خود ان کے فارسی کلام کا مجموعہ ''غزلیات فارسی'' اسی شبلی مرکز سے شائع ہوا۔ شبلی مرکز کی جانب سے ایک سہ ماہی رسالہ ''شبلی'' نکالنے کا بھی انہوں نے اعلان کیا تھا، مگر شاید یہ رسالہ منصۂ شہود پر نہیں آ سکا، اس لئے کہ ابتک اس کا کوئی شمارہ کہیں دستیاب نہیں ہوا۔

علامہ شبلی جس زمانہ میں ندوہ کے معتمد تعلیم تھے، اپنا قیمتی کتب خانہ اس پر وقف کر دیا تھا اور اپنے دوست نواب سید علی حسن خاں سے بھی ان کا کتب خانہ وقف کرایا تھا۔ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے دور نظامت میں اس کا نام ''کتب خانہ شبلی'' رکھا۔ ندوۃ العلماء اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک ایک ہاسٹل بھی علامہ شبلی سے منسوب ہیں۔

علامہ شبلی کو بمبئی سے بڑی دلچسپی تھی، لیکن وہاں ان کے نام پر اب تک کوئی یادگار قائم نہیں ہوئی۔ البتہ ۱۹۹۴ء میں اعظم گڑھ کے ایک لائق فرزند جناب انوار احمد اعظمی نے شبلی ہائی اسکول قائم کیا، جسے وہ بڑی محنت اور لیاقت سے چلا رہے ہیں۔ اللہ انہیں مزید کامیابیوں سے ہم کنار کرے۔ اس کے علاوہ مہاراشٹر کے ضلع اورنگ آباد میں بھی کسی حوصلہ مند نے ''علامہ شبلی ہائی اسکول'' قائم کیا ہے۔

۱۹۸۸ء میں علامہ شبلی سے منسوب پاکستان کے شہر فیصل آباد میں ''شبلی گروپ آف کالجز'' کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم ہوا ہے۔ اس کے تحت مندرجہ ذیل اسکول رکالج قائم ہیں اور تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں:

۱۔ شبلی کالج آف کامرس اینڈ سائنس، فیصل آباد

۲۔ شبلی کالج فار وومن، فیصل آباد

۳۔ شبلی کالج فار بوائز، فیصل آباد

۴۔ شبلی کالج، گوجرہ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ

۵۔ شبلی کالج، گجرانوالہ

۶۔ شبلی کالج، ساہی وال

۷۔ شبلی کالج، سرگودھا

''شبلی گروپ آف کالجز'' کی ویب سائٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جدید تعلیم کا ایک عمدہ اور معیاری ادارہ ہے۔ خوب صورت عمارتیں، بچوں اور بچیوں کے لئے علاحدہ ہاسٹل، کھیل کا میدان گویا ہر طرح کی سہولیات میسر ہیں۔ ''شعور'' کے نام سے انگریزی اور اردو میں

ایک سالانہ میگزین بھی شائع ہوتا ہے۔

سمینار

شبلی شناسی کا ایک میدان ملک و بیرون ملک میں منعقد ہونے والے سمینار اور یوم شبلی کی تقریبات بھی ہیں۔ شبلی پر اب تک کل دس سمینار منعقد ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے سو سال میں یہ تعداد چنداں اہمیت نہیں رکھتی، لیکن ان سمیناروں سے شبلی شناسی کو بہر حال فروغ ملا۔

علامہ شبلی پر سب سے پہلے دبستان فکر و نظر ڈھاکا نے غالباً ۶۴-۱۹۶۳ء میں سمینار منعقد کیا۔ یہ سمینار اسلامک اکیڈمی ڈھاکا کے آڈوٹوریم میں منعقد ہوا تھا۔ اس کی صدارت دارالمصنفین کے سابق ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن [۱۹۱۱ء-۱۹۸۷ء] نے کی تھی۔ یہ سمینار بقول شعیب عظیم اس قدر شاندار تھا کہ پھر ڈھاکا میں شبلی پر ایسا سمینار منعقد نہ ہوسکا۔ (ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۸۸ء، ص ۳۸۹) اس سے زیادہ اس سمینار کی تفصیلات دستیاب نہیں۔

ہندوستان میں پہلا شبلی سمینار مشہور ادیب اور ناول نگار قاضی عبدالستار صاحب نے شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں منعقد کیا۔ یہ ایک روزہ سمینار دسمبر ۱۹۸۹ء میں ہوا۔ اس کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر منظر عباس نقوی تھے۔ اس میں پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر شہریار، ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی، ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی وغیرہ نے شرکت کی اور اپنے مقالات و خیالات پیش کیے۔

یہ اگرچہ ایک روزہ سمینار تھا تاہم اس میں متعدد اہم مقالات پیش کیے گئے۔ مقالات پر بحث و مباحثہ بھی ہوا۔ اسی سمینار کا واقعہ ہے کہ کسی نے علامہ شبلی نعمانی پر بے جا اعتراضات کیے تو قاضی عبدالستار صاحب خاصے جذباتی ہوگئے اور شبلی کی لاثانی تحریر ظہور قدسی کا حصہ اپنے مخصوص انداز میں زبانی سنائی اور شبلی کے فکر و فن پر مداحانہ گفتگو کی۔ ڈاکٹر وحید اختر اور ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے بعض اعتراضات کے جوابات ایک اور مداح شبلی پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے دیے۔ اس سمینار کی روداد دستیاب نہ ہوسکی۔ یہ تفصیلات پروفیسر محمد یٰسین مظہر

صدیقی اورڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کی زبانی ہیں۔
تیسرا سمینار ۲۴-۲۵ راکتوبر ۱۹۹۲ء کو بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے منعقد کیا، اس کے روح رواں شعبہ اردو کے صدر ماہر لسانیات جناب پروفیسر عبدالستار دلوی [پ: ۱۸ راگست ۱۹۳۷ء] تھے۔ اس کا کلیدی خطبہ جناب سید حامد [پ: ۲۸ رمارچ ۱۹۲۰ء] سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے پیش کیا۔ اس دوروزہ سمینار میں ملک کے متعدد ممتاز اہل قلم نے شرکت کی اور مقالات پیش کئے۔ بعض لوگوں نے تقریریں کیں۔ ان میں ڈاکٹر رفیق زکریا [۱۹۲۶-۲۰۰۵ء] علی سردار جعفری [۱۹۱۳-۲۰۰۲ء] پروفیسر انور معظم [پ: ۱۹۲۹ء] مولانا مستقیم احسن اعظمی اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی [۱۹۳۷-۲۰۰۸ء] کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
سمینار کی روداد اور اس میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ شائع نہ ہوسکا۔ اس میں شریک اہل قلم کے اسمائے گرامی اور ان کے مقالات کے عناوین یہ ہیں:

۱۔ علامہ شبلی اور سیرۃ النبیؐ	مولانا محمد عارف عمری
۲۔ علامہ شبلی اور سرسید	ڈاکٹر خلیق انجم
۳۔ علامہ شبلی اور علی گڑھ تحریک	پروفیسر اصغر عباس
۴۔ علامہ شبلی نقوش وتاثرات	ڈاکٹر قادر حسین
۵۔ علامہ شبلی بحیثیت تنقید نگار	حکیم الطاف احمد اعظمی
۶۔ علامہ شبلی کی شعرفہمی	مولانا ضیاء الدین اصلاحی
۷۔ علامہ شبلی اور تحریک ندوہ	مولانا مستقیم احسن اعظمی
۸۔ علامہ شبلی اور تعلیم نسواں	ڈاکٹر صادقہ ذکی
۹۔ علامہ شبلی اور اسلامی افکار	ڈاکٹر انور معظم
۱۰۔ علامہ شبلی اور فلسفہ جدیدہ	محمد یونس ادیب
۱۱۔ علامہ شبلی کی فارسی شاعری	پروفیسر احمد انصاری
۱۲۔ علامہ شبلی اور دارالمصنفین	پروفیسر خورشید نعمانی

مقالات کے عناوین سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں کس قدر وقیع علمی و تحقیقی مقالات پیش کئے گئے تھے۔ ان میں چند ہی مقالات رسائل و جراید میں شائع ہو سکے، ضرورت تھی کہ ان کا مجموعہ شائع کیا جاتا مگر یہ کام اب تک نہ ہو سکا۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی کے فعال ڈائرکٹر پروفیسر عبدالستار دلوی صاحب سے توقع ہے کہ یہ مجموعہ شائع کر کے بمبئی کے شاید سب سے بڑے پرستار کو خراج عقیدت پیش کریں گے۔

نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نو را
طراز مسند جمشید و فر تاج خسرو را
بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب چوپاٹی و گلگشت اپالو را

اس سمینار کی کامیابی کا ذکر اخبارات میں ہفتوں رہا۔ ماہنامہ معارف کے مدیر مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے شذرات معارف (مئی ۱۹۸۸ء ص ۳۲۲-۳۲۴) میں اس کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

۱۴-۱۶/اپریل ۱۹۹۵ء کو انجمن ترقی اردو ہند دہلی نے اپنے پہلے سکریٹری علامہ شبلی کی یاد میں ایک سہ روزہ سمینار منعقد کیا۔ اس کے روح رواں مشہور ادیب و نقاد ڈاکٹر خلیق انجم [پ: ۲۲/دسمبر ۱۹۳۵ء] تھے۔ اس میں کل ۴۵/مقالہ نگاروں نے شرکت کی۔ سمینار سے پہلے انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے انجمن کے ترجمان ہفت روزہ ہماری زبان کا شبلی نمبر شائع کیا۔ پھر سمینار کے بعد ایک شمارے میں اس کی روداد، تصاویر اور خطبات کے اہم اقتباسات شائع کئے۔ سمینار میں پڑھے گئے ۲۵/منتخب مقالات کو پہلے سہ ماہی اردو ادب میں ''شبلی نمبر'' کے طور پر شائع کیا گیا، پھر ''شبلی کی علمی وادبی خدمات'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ یہ شبلی سمینار اس لحاظ سے بھی بہت اہم تھا کہ اس میں ملک و بیرون ملک کے ممتاز اہل علم نے شرکت کی۔ ان میں جناب شمس الرحمن فاروقی [پ: ۳۰/ستمبر ۱۹۳۵ء] ڈاکٹر رفیق زکریا، پروفیسر جگن ناتھ آزاد [۱۹۱۸ - ۲۰۰۴ء] پروفیسر نثار احمد فاروقی [۱۹۳۴-

۲۰۰۴ء] جناب رشید حسن خاں، سید مظفر حسین برنی، پروفیسر ظہورالدین اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سیمنار میں ہندوستان کے تقریباً تمام خطوں کے اہل قلم نے شرکت کی اور علامہ شبلی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اردو ادب کا جو شبلی نمبر شائع کیا ہے، اس میں سیمنار کے ۲۵ منتخب مقالات شامل ہیں، جو مقالات اس مجموعہ میں شامل نہ ہو سکے یہاں ان کی فہرست درج کی جاتی ہے۔

۱۔ شبلی کی تنقید نگاری	پروفیسر شکیل الرحمٰن
۲۔ شبلی کی نظریاتی تنقید شعر العجم کے حوالہ سے	پروفیسر عنوان چشتی
۳۔ شبلی بحیثیت سوانح نگار	جناب محمد صابرین
۴۔ شبلی کا اسلوب نثر	جناب نیاز احمد
۵۔ شبلی کی نظم گوئی	جناب ظفر اسلم
۶۔ شبلی اور شعر العجم	پروفیسر ظہورالدین
۷۔ شبلی کی تاریخ نویسی	پروفیسر محمود الحسن
۸۔ شبلی اور فکر جدید	جناب منظور احمد
۹۔ شبلی اور نواب صدر یار جنگ	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی
۱۰۔ شبلی کی اردو شاعری	فاطمہ وصیہ جائسی
۱۱۔ شبلی اور شروانی خاندان کے تعلقات	جناب مہر الٰہی
۱۲۔ شبلی اور موازنہ انیس و دبیر	ڈاکٹر محمد زماں آزردہ
۱۳۔ شبلی کی ادبی خدمات	جناب رشید حسن خاں
۱۴۔ ہمارے عہد میں شبلی کی معنویت	پروفیسر محمود الٰہی
۱۵۔ مولانا شبلی کا جرم محبت	محمد عظیم خیرآبادی
۱۶۔ مسلمانوں کی تاریخ نویسی مولانا شبلی کی نظر میں	پروفیسر نثار احمد فاروقی
۱۷۔ شبلی اور ان کے رفقاء	ڈاکٹر محمد ایوب تاباں

۱۸۔شبلی کا سفرنامہ — جناب زبیر قریشی

۱۹۔شبلی اور ہندوستانی مسلمان — پروفیسر قمر رئیس

یہ فہرست ہماری زبان کے شبلی نمبر سے نقل کی گئی ہے۔مذکورہ اہل قلم میں سے بعض نے سمینار میں شرکت نہیں کی اور بعض نے اپنے مقالات کے عناوین تبدیل کر دیے۔بہر حال شبلی پر منعقد ہونے والا یہ ایک اہم اور تاریخی سمینار تھا۔

پانچواں شبلی سمینار دارالمصنفین اعظم گڑھ نے اپنے قیام کے نوے سال بعد ۲۰۰۴ء میں ۲۸-۲۹ر اکتوبر کو منعقد کیا۔اس میں بھی ملک کے ممتاز اہل علم نے شرکت کی اور مقالات پیش کیے۔یہ سمینار مولانا ضیاء الدین اصلاحی سابق ناظم دارالمصنفین کی سرپرستی میں منعقد ہوا تھا۔اس میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ بھی وہ شائع کرنا چاہتے تھے۔اس کی جمع وترتیب کی ذمہ داری انہوں نے مجھے سونپی تھی۔سفرحج پر جاتے ہوئے انہوں نے دو کام مجھے سپرد کیے تھے،ایک یہی مقالات کی جمع وترتیب اور دوسرے شعرالعجم پنجم کی تصحیح۔افسوس کہ یہ دونوں کام بوجوہ نہ ہو سکے اور جب وہ سفرحج سے دھلے دھلائے واپس آئے تو مالک حقیقی کی طرف سے ان کا بلاوا آ گیا اور وہ سفرآخرت پر روانہ ہو گئے،جہاں سے وہ مجھ سے ان کاموں کا مواخذہ تو نہیں کر سکتے لیکن دل کچوکے لگاتا رہتا ہے۔

اس سمینار میں راقم نے ''علامہ شبلی بحیثیت مدیر'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا تھا، جسے مولانا مرحوم نے ماہنامہ معارف [فروری ۲۰۰۷ء] میں شائع کیا اور جواب میرے مجموعہ مضامین ''متعلقات شبلی'' میں شامل ہے۔دارالمصنفین کے اس سمینار میں پڑھے گئے مقالات اور مقالہ نگاروں کے نام یہ ہیں۔

۱۔شعرالعجم اور خواجہ حافظ شیرازی — پروفیسر شعیب اعظمی

۲۔علامہ شبلی کی فارسی شاعری — پروفیسر عبدالقادر جعفری

۳۔مقالات شبلی میں عربی زبان وادب — ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی

۴۔مولانا شبلی کی دینی منزلت — پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

۵۔علم الکلام — علامہ عقیل الفردی

۶۔سر سید اور شبلی — مولانا عبدالمبین ندوی

۷۔موازنہ انیس و دبیر — محمد ایوب واقف

۸۔علامہ شبلی کی انفرادیت اور معنویت — ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی

۹۔مولانا شبلی کے خطوط تدوین جدید کی ضرورت، ڈاکٹر شمس بدایونی

۱۰۔علامہ شبلی کا نظریہ تعلیم — مولانا ذی شان ہدایتی

11 Maulana Shibli's critique of orientalists an appraisal — پروفیسر عبدالعلی

۱۲۔علامہ شبلی حافظ شیراز ہند — پروفیسر عبدالحق

۱۳۔مولانا شبلی اور ندوۃ العلماء — مولانا سعید الرحمٰن اعظمی

۱۴۔علامہ شبلی کی شخصیت خطوط کے آئینے میں — پروفیسر ریاض الرحمٰن خاص شروانی

یہ دونوں مقالے دوسروں نے پڑھ کر سنائے۔

۱۵۔علامہ شبلی اور مستشرقین — حکیم الطاف احمد اعظمی

۱۶۔مطالعہ شبلی چند معروضات — پروفیسر افغان اللہ خاں

۱۷۔علامہ شبلی کی عربی تالیفات — ڈاکٹر جمشید احمد ندوی

۱۸۔علامہ شبلی اور مولانا عبدالماجد دریابادی — حافظ عمیر الصدیق ندوی

۱۹۔مسئلہ وقف علی الاولاد اور علامہ شبلی — مولوی کلیم صفات اصلاحی

۲۰۔علامہ شبلی بحیثیت مدیر — محمد الیاس الاعظمی

۲۱۔موجودہ دور میں شبلی کے اثرات اور معنویت پروفیسر خورشید نعمانی

۲۲۔علامہ شبلی بحیثیت عالم — ڈاکٹر محمد عارف عمری

۲۳۔علامہ شبلی کی فارسی شاعری — مولانا ضیاءالدین اصلاحی

۲۴۔اسلام میں غیر مسلموں کے حقوق اور علامہ شبلی پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

۲۵۔علامہ شبلی نعمانی [ہندی] ڈاکٹر نشاط پروین

دارالمصنفینؒ کے کانفرنس ہال میں شبلی کی حیات اور ان کی فکر پر دو روز تک مسلسل اظہار خیال ہوتا رہا اور بڑے بحث و مباحثے ہوئے۔شاید یہی وجہ تھی کہ اسے ایک یادگار سمینار خیال کیا گیا۔سمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ اگرچہ اب تک شائع نہیں ہوا تاہم اس سمینار سے ایک نئے سلسلے کا آغاز ہوا۔ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں اس سے قبل علامہ شبلی کے کارناموں پر محض چند ہی مضامین شائع ہوئے تھے۔مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے سمینار کے مقالات ایک ایک کر کے معارف میں شائع کئے۔اسے ماہنامہ معارف میں شبلی شناسی کے نئے دور کے آغاز سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

علامہ شبلی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔اس لحاظ سے ۲۰۰۷ء علامہ شبلی کا ۱۵۰/ویں ولادت کا سال تھا۔موقع کی مناسبت سے ملک میں ۳/سمینار منعقد ہوئے۔اس سلسلے کا پہلا سمینار ۲۴-۲۵/فروری ۲۰۰۷ء کو اپنے بانی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ نے منعقد کیا۔اس میں ملک و بیرون ملک کے متعدد اہل علم اور ارباب کمال نے شرکت کی اور مقالات پیش کئے۔صدر شعبہ اردو ڈاکٹر شباب الدین صاحب کی سربراہی میں منعقد ہونے والا یہ سمینار بھی بہت کامیاب تھا۔اس کے روح رواں شبلی کالج کے سابق پرنسپل افتخار احمد صاحب نے اسے کامیاب بنانے کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں لگا دیں۔اس میں پیش کئے گئے مقالات کا مجموعہ ڈاکٹر شباب الدین صاحب نے ''علامہ شبلی نعمانی معنویت کی بازیافت'' کے نام سے شائع کیا ہے،جس میں درج ذیل مقالات شامل ہیں:

۱۔علامہ شبلی کے بعض جاوداں کارنامے مولانا ضیاء الدین اصلاحی

۲۔سوانح مولانا روم پروفیسر کبیر احمد جائسی

۳۔شبلی کی انتقادی فکر کا ثقافتی منظرنامہ پروفیسر عبدالحق

۴۔شبلی کی تنقید نگاری پروفیسر صابر کلوروی

۵۔علامہ شبلی ڈاکٹر خلیق انجم

۶۔عہد جدید میں شبلی نعمانی کی معنویت ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر
۷۔علامہ شبلی اور عملی تنقید کے مطالبات پروفیسر فضل امام
۸۔شبلی کی معنویت مولانا عمیر الصدیق ندوی
۹۔شبلی نعمانی کی عصری معنویت جناب شمیم طارق
۱۰۔شبلی نعمانی کی اردو شاعری ایک مطالعہ ڈاکٹر رابعہ سرفراز
۱۱۔ادبی تحقیق کی روایت میں شبلی کی اولیات ڈاکٹر شمس بدایونی
۱۲۔مکاتیب شبلی میں عربی زبان وادب ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
۱۳۔عصر رواں میں شبلی کی معنویت ڈاکٹر سید عبدالباری
۱۴۔عہد حاضر میں علامہ شبلی کی فارسی نگارشات پروفیسر عبدالقادر جعفری
۱۵۔علامہ شبلی کی فارسی غزل پروفیسر عمر کمال الدین
۱۶۔جمالیات نقاد شبلی کا سماجی وتاریخی شعور ڈاکٹر غضنفر علی غضنفر
۱۷۔شبلی کے نظریہ شعر کی معنویت ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی
۱۸۔علامہ شبلی کی تعلیمی سرگرمیاں ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی
۱۹۔موازنہ انیس ودبیر کی اہمیت ڈاکٹر شباب الدین
۲۰۔علامہ شبلی کا سفرنامہ روم ومصر وشام ڈاکٹر صاحب علی
۲۱۔علامہ شبلی اور اسلامی کتب خانے ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی
۲۲۔علامہ شبلی بحیثیت مخطوط شناس ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی
۲۳۔عہد حاضر میں علامہ شبلی کی معنویت ڈاکٹر منظر حسین
۲۴۔اسکات المعتدی علی انصات المقتدی ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
۲۵۔شبلی کی تاریخی بصیرت ڈاکٹر علاء الدین خاں
۲۶۔علامہ شبلی کے سیاسی افکار ونظریات ڈاکٹر محی الدین آزاد
۲۷۔علامہ شبلی نعمانی اور اورنگ زیب ڈاکٹر محمد تعظیم

۲۸۔ سفر نامہ روم و مصر و شام　　عمیر منظر

۲۹۔ شبلی کی اردو نظمیں　　سرفراز نواز

۳۰۔ مولانا شبلی نعمانی کے تعلیمی افکار　　احمد

اس فہرست سے سمینار کی وسعت اور علمی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس میں پاکستان کے بعض ممتاز اہل قلم پروفیسر ریاض مجید، پروفیسر صابر کلوروی، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر اور ڈاکٹر رابعہ سرفراز [جی سی یونیورسٹی] نے بھی شرکت کی تھی۔ راقم نے ''عہد حاضر میں علامہ شبلی کی بعض تجویزوں اور منصوبوں کی معنویت'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا تھا، مگر چونکہ یہ مقالہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی مدیر معارف کو بے حد پسند آیا اور انہوں نے اسے ماہنامہ معارف میں اپنے خصوصی نوٹ کے ساتھ شائع کیا، اس لئے اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا گیا حالانکہ اس میں کئی مطبوعہ اور کمزور مقالات بھی شامل ہیں۔

اس سلسلے کا دوسرا اہم اور قابل ذکر سمینار ممتاز دانشور جناب پروفیسر اختر الواسع ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے منعقد کیا۔ اس میں درج ذیل مقالات پیش کئے گئے:

۱۔ علامہ شبلی نعمانی شخصیت، افکار اور کچھ نئی باتیں، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی

۲۔ برصغیر میں فکر اسلامی کے ارتقاء میں مولانا شبلی کا حصہ، غطریف شہباز ندوی

۳۔ علامہ شبلی اور فکری اجتہاد　　کبیر احمد جائسی

۴۔ علامہ شبلی اور خدمت دفاع اسلام　　ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی

۵۔ عالم اسلام میں شبلی شناسی　　ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

۶۔ جمال پرست شبلی کا سماجی اور تاریخی شعور　　غضنفر علی

۷۔ شبلی اور تعلیم　　محمد ارشد

۸۔ شبلی نعمانی اور محمد حسین ہیکل (سیرت فاروق کی روشنی میں)

جلال سعید حفناوی، مترجمہ صہیب عالم

۹۔ شبلی کی شاعری ڈاکٹر عمیر منظر

۱۰۔ کتابیات شبلی نعمانی عامرہ خاتون

ان مقالات کو مجلّہ ''اسلام اور عصر جدید دہلی'' کے شبلی نمبر کے طور پر شائع کیا گیا۔ اب اسے البلاغ پبلی کیشن نئی دہلی نے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ اس کا مفصل جائزہ زیر نظر کتاب میں شامل ہے۔

ساتواں سمینار ایک محدود پیمانے پر دہلی اردو اکیڈمی نے ۸-۹ فروری ۲۰۰۸ء کو منعقد کیا۔ یہ سمینار پروفیسر قمر رئیس کی علامہ شبلی سے خصوصی دلچسپی کا نتیجہ تھا۔ اس میں درج ذیل مقالے پیش کئے گئے:

۱۔ شبلی کی نظموں کا تہذیبی مطالعہ ڈاکٹر کوثر مظہری

۲۔ سر سید اور شبلی نعمانی پروفیسر افتخار عالم خاں

۳۔ دبستان شبلی کا ایک غیر معروف عالم مولانا شبلی متکلم، پروفیسر کبیر احمد جائسی

۴۔ شبلی اور قومی بیداری کی تحریک سید محمد اسماعیل

۵۔ شبلی اور دارالمصنفین ڈاکٹر علاء الدین خاں

۶۔ شبلی کی سخنوری ڈاکٹر عمیر منظر

۷۔ شبلی کا تنقیدی کارنامہ ڈاکٹر فرید پربتی

اس سمینار میں جس قدر مقالات پیش کئے گئے اسی قدر تقریریں ہوئیں۔ مقررین میں جناب سید حامد، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر عبدالحق، حکیم الطاف احمد اعظمی، ڈاکٹر طاہر تونسوی، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر شمس الحق عثمانی، مفتی عطاء الحق قاسمی اور گلزار دہلوی قابل ذکر ہیں۔ ان تمام مقررین نے علامہ شبلی کی عظمت کا اعتراف کیا۔

اردو اکادمی دہلی کے اس سمینار کی مفصل روداد ماہنامہ ایوان اردو دہلی مارچ ۲۰۰۸ء [ص ۶۱-۶۴] میں شائع ہوئی ہے۔

''علامہ شبلی کا علمی وفکری ورثہ'' کے عنوان سے ۱۱-۱۲ دسمبر ۲۰۱۱ء کو ایک اور سمینار

دارالمصنفین نے بڑے تزک واحتشام سے منعقد کیا۔ یہ سمینار اس لحاظ سے بڑا اہم تھا کہ اس میں ساری توجہ شبلی کے افکار ونظریات پر مرکوز رکھی گئی تھی۔ اس کے روح رواں دارالمصنفین کے ڈائرکٹر جناب پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب تھے۔ یہ سمینار ایران کلچرل ہاؤس دہلی کے تعاون سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس کا افتتاح جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کیا۔ اس میں ملک وبیرون ملک کے چند ممتاز اشخاص مثلاً ڈاکٹر کریم نجفی کلچرل اتاشی ایران دہلی، پروفیسر سید سلمان ندوی (افریقہ) ڈاکٹر علی رضا قزوہ (ایران) پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، مولانا مستقیم احسن اعظمی (صدر جمعیۃ علماء ہند، ممبئی) پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی اور ڈاکٹر مسعود عالم قاسمی وغیرہ نے شرکت کی۔ حالانکہ موسم بے حد خراب تھا جس کی وجہ سے دہلی اور بعض دوسرے شہروں سے بہت سے اہل قلم شریک نہ ہو سکے۔

اس سمینار میں شبلی کے علمی وفکری ورثہ پر دو درجن سے زاید علمی وتحقیقی مقالات محققین اور اہل قلم نے پیش کئے۔ مقالات کے عناوین اور شرکا کے نام یہ ہیں:

۱۔ علامہ شبلی کا نظریہ تعلیم — پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی

۲۔ مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ شبلی — مولانا عمر اسلم اصلاحی

۳۔ علامہ شبلی اور مدرسۃ الاصلاح — مفتی فضل الرحمٰن اصلاحی

۴۔ اصلاح نصاب تعلیم اور مولانا شبلی — ڈاکٹر قمر اقبال

۵۔ Shibli in Iran — ڈاکٹر علی رضا قزوہ

۶۔ شبلی کی تنقید موازنہ انیس ودبیر کے حوالہ سے — ڈاکٹر نسیم احمد

۷۔ تاریخ ترتیب قرآن از علامہ شبلی — ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی

۸۔ مولانا شبلی کے سیاسی تدبر کی بازیافت — ڈاکٹر شمس بدایونی

۹۔ عبدالماجد دریابادی پر شبلی کے فکروفن کا اثر — ڈاکٹر عتیق الرحمٰن

۱۰۔ علامہ شبلی اور ندوۃ العلماء — مولانا محمد صادق اصلاحی

۱۱۔ الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی شبلی کا ایک عظیم کارنامہ، ڈاکٹر عرفات ظفر

۱۲۔اسلوب شبلی مکاتیب کے حوالے سے ڈاکٹر توقیر احمد ندوی

۱۳۔پردہ پر علامہ شبلی کے افکار کا تجزیاتی مطالعہ ڈاکٹر ابوذر اصلاحی

۱۴۔ابن خلدون اور علامہ شبلی کی تاریخ نگاری کا مطالعہ، ڈاکٹر محمد ارشد

۱۵۔علامہ شبلی کا علمی وفکری سرمایہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

۱۶۔علامہ شبلی کا معارف نامہ ڈاکٹر جمشید احمد ندوی

۱۷۔تاریخ ہند سے متعلق علامہ شبلی کے بعض رسائل ومقالات کا جائزہ

ڈاکٹر علاء الدین خاں

۱۸۔مولانا شبلی کا علمی وفکری ورثہ مولانا عمیر الصدیق ندوی

۱۹۔سیرت شبلی میں استناد قرآنی مولانا محمد عارف عمری

۲۰۔حیات شبلی کے زبانی ومراسلاتی ماخذ مولانا کلیم صفات اصلاحی

۲۱۔شبلی اور معاندین شبلی جناب شمیم طارق

۲۲۔علامہ شبلی کی علمی فتوحات ڈاکٹر ایاز احمد اصلاحی

۲۳۔علامہ شبلی کی نگاہ میں مثالی مدرسہ ڈاکٹر اشہد جمال ندوی

۲۴۔مولانا شبلی کی دینی منزلت پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

۲۵۔علامہ شبلی اور دعوت اسلامی ڈاکٹر سعود عالم قاسمی

شبلی شناسی کے حوالے سے ایک اہم سمینار شعبہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں منعقد ہوا، اس کے روح رواں مشہور سیرت نگار اور نامور اہل قلم پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی تھے۔انہوں نے ایک الگ نوع سے شبلی کو خراج عقیدت پیش کیا۔علامہ شبلی پر اب تک جو سمینار منعقد ہوئے تھے وہ ان کی جامع کمال شخصیت اور فکر وفن کے مطالعے پر مبنی تھے۔پروفیسر محمد یٰسین صدیقی نے اس کے دائرے میں وسعت پیدا کی اور علامہ شبلی کی محض ایک کتاب الفاروق پر سمینار کا انعقاد کیا۔الفاروق علامہ شبلی کی سب سے پسندیدہ کتاب اور سوانحی ادب کا شاہ کار ہے۔یہ دو روزہ سمینار ۱۸-۱۹ نومبر ۲۰۰۱ء کو ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں منعقد

ہوا۔اس میں کل ۲۶ رمقالے پیش کئے گئے۔یہ مقالات ''الفاروق ایک مطالعہ'' کے نام سے ۲۰۰۲ء میں ادارہ علوم اسلامیہ ہی سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔اس میں درج ذیل مقالات شامل ہیں۔

۱۔الفاروق کا تجزیاتی مطالعہ — مولانا ضیاء الدین اصلاحی
۲۔الفاروق کے مصادر: عمومی تجزیہ — ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
۳۔الفاروق اور ازالۃ الخفاء — مفتی مشتاق احمد تجاروی
۴۔الفاروق اور شاہ ولی اللہ — ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
۵۔حضرت عمر فاروقؓ کا فہم قرآن — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام
۶۔الفاروق اور علم حدیث — محمد اسلام عمری
۷۔الفاروق کے فقہی مباحث — ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی
۸۔شبلی کی تاریخ نویسی، اصول وطریقہ کار الفاروق کے حوالے سے
ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
۹۔الفاروق اور عربی کتب سیرت فاروقی — ڈاکٹر محمد صلاح الدین
۱۰۔برطانوی مستشرقین کا مطالعہ سیرت اور الفاروق ڈاکٹر توقیر عالم
۱۱۔شبلی کی سوانحی تصنیفات اور الفاروق — ڈاکٹر عبد الحمید فاضلی
۱۲۔خطابت فاروقی الفاروق کے حوالہ سے — ڈاکٹر کفیل احمد قاسمی
۱۳۔حضرت عمر کی جامع کمالات شخصیت الفاروق کی روشنی میں
ڈاکٹر انجم آراء فلاحی
۱۴۔اسلامی ریاست الفاروق کی روشنی میں — مولانا نظام الدین اصلاحی
۱۵۔حضرت عمر کی مجلس شوریٰ اور الفاروق — ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی
۱۶۔الفاروق کے معاشی مباحث کا تجزیہ — ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی
۱۷۔الفاروق کی بعض ادبی خصوصیات — سید علیم اشرف جائسی

۱۸۔الفاروق کے تراجم　　　　ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

۱۹۔الفاروق کے بعض حواشی: ایک مطالعہ　　　　محمد جرجیس کریمی

۲۰۔علامہ شبلی نعمانی اور مولانا ابو یحیٰ امام خاں نوشیروی

کی تصانیف فاروقی [ایک مطالعہ]　　　　احسان اللہ خاں ندوی

۲۱۔الفاروق: علی گڑھ تحریک کا ایک عطیہ　　　　ڈاکٹر نذیر احمد عبدالمجید قاسمی

۲۲۔کتابیات　　　　کبیر احمد خاں

چندروز پہلے ۲۹، ۳۰ نومبر و یکم دسمبر ۲۰۱۳ء کو رابطہ ادب اسلامی نے اورنگ آباد میں ایک سمینار منعقد کیا ہے، جس کا عنوان ''ملت اسلامیہ کے مسائل و قضایا علامہ شبلی اور ان کے معاصر شعرا کے کلام میں'' تھا، اس سمینار میں بھی علامہ شبلی کی شاعری پر کئی مقالات پیش کئے گئے ہیں۔

اس طرح شبلی پر ابتک کل دس سمینار منعقد ہوئے۔ ان سمیناروں نے شبلی شناسی کی شمع کی لو تیز کی اور اہل علم کے ایک بڑے طبقے کو متاثر کرنے میں کامیاب رہے۔

یوم شبلی

علامہ شبلی کی وفات کے بعد دارالمصنفین نے ان کے یوم وفات [۱۸ر نومبر] پر قرآن خوانی کا سلسلہ شروع کیا جو آج تک قائم ہے۔ اسی طرح شبلی نیشنل کالج نے دارالمصنفین کی قرآن خوانی کے بعد ایک جلسہ منعقد کر کے شبلی کو خراج عقیدت پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور یہ سلسلہ بھی ابتک قائم ہے۔ اس کے تسلسل میں کبھی کبھی خلل بھی واقع ہوا ہے لیکن ایک دو بار اس سلسلہ کو بڑے پروقار اور شایان شان طریقے سے بھی منعقد کیا گیا ہے۔

ملک و بیرون ملک کے دیگر علمی اداروں نے بھی چند بار خصوصی طور پر ''یوم شبلی'' کے انعقاد کا اہتمام کیا ہے۔ اس میں شبلی کالج لاہور، اردو ہال حیدرآباد، اعظمی اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ کی خصوصی تقریبات خاص طور پر قابل

ذکر ہیں۔ ان پروگراموں کا ذکر ادبی حلقوں میں برسوں رہا۔ اس لئے کہ یہ رسمی پروگرام نہیں تھے بلکہ اس میں اس وقت کے ممتاز اہل قلم، محققین اور شبلی شناسوں نے شرکت کی، مقالات پیش کئے اور بعض بزرگ ادیبوں نے شبلی کے فکر وفن پر تقریریں کیں۔ یہاں ان تقریبات کی ایک مختصر روداد پیش کی جاتی ہے تا کہ اندازہ ہو سکے کہ ان پروگراموں میں شبلی اور ان کے کارناموں کو کس نوع سے خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

اس سلسلے کا پہلا پروگرام ۱۷ر نومبر ۱۹۵۷ء کو اردو ہال حیدر آباد میں منعقد ہوا۔ اس پروگرام کی تفصیلات دستیاب نہیں کہ یہ پروگرام کن لوگوں نے منعقد کیا تھا اور کون لوگ شریک تھے، البتہ اس میں پروفیسر ابوظفر عبدالواحد نے شرکت کی تھی اور اپنا مقالہ ''مقامات شبلی'' پیش کیا تھا جس کا ذکر البصیر کے شبلی نمبر میں مقالہ سے پہلے ایک نوٹ میں کیا گیا ہے۔

اس سلسلے کا دوسرا پروگرام ۹ر مئی ۱۹۶۸ء کو بزم ادب شبلی کالج لاہور نے مرکز تعمیر نو شاہراہ قائداعظم میں منعقد کیا۔ اس اجلاس میں متعدد مقررین اور اہل قلم ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر محمد عثمان، حافظ نذر احمد، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اور مولانا سید مرتضی حسین نے شرکت کی اور مقالات وخطبات پیش کئے۔ اس یوم شبلی کی صدارت ڈاکٹر سید عبداللہ نے کی۔ پروفیسر محمد عثمان نے مقالہ پیش کیا جس کا عنوان ''مولانا شبلی کے اثرات ہماری قومی زندگی پر'' تھا۔ انہوں نے واضح کیا کہ ''علامہ شبلی نے کس انداز سے مسلمانوں کی عجمی طبیعت میں عرب کا سوز دروں پیدا کیا۔'' انہوں نے کہا کہ ''مولانا شبلی اپنے دور کے دوسرے تمام علماء کے مقابلے میں جدید تقاضوں کا بہتر احساس رکھتے تھے، تاہم قیادت وسیاست علمائے کرام کے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ مولانا کی اس فکر کو برصغیر کے بعض اہل نظر نے قبول کر کے بعد میں مذہبی بنیاد پر سیاسی جماعتیں تشکیل کیں۔'' (مقالات یوم شبلی ص ۸۴)

انہوں نے یہ بھی کہا کہ ''مولانا شبلی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تاریخی کتب رقم کر کے قوم میں تاریخ کے مطالعے کے شعور کو تیز کیا اور ہندوؤں اور انگریزوں کی باہمی سازش سے مسلمانوں کی مسخ ہوتی ہوئی تاریخ کو بچالیا اور قوم کو تاریخ سے محبت کرنا سکھایا۔'' پروفیسر محمد

عثمان نے اس بات پر دکھ کا اظہار کیا کہ تاریخ کا جو ذوق مولانا شبلی نے قوم میں پیدا کیا تھا وہ اور بڑھنا چاہئے تھا مگر بڑھنا تو درکنار برقرار بھی نہ رہ سکا۔ (ایضاً)

دوسرا مقالہ پروفیسر غلام حسین ذوالفقار نے پیش کیا۔ ان کے مقالے کا عنوان ''شبلی کی تصنیفی تحریک دارالمصنفین'' تھا۔

اس یوم شبلی کی روداد ۱۰؍مئی ۱۹۶۸ء کے نوائے وقت لاہور میں شائع ہوئی ہے۔ جس میں مذکورہ مقالات اور بعض خطبات کے علاوہ کوئی اور تفصیل نہیں حالانکہ شبلی کالج لاہور کے بانی و پرنسپل اور طب نبویؐ کے مصنف حافظ نذر احمد [۱۹۱۹-۲۰۱۱ء] نے اس میں پڑھے گئے مقالات کا ایک مجموعہ ''مقالات یوم شبلی'' کے نام سے ۱۹۶۸ء میں مسلم اکیڈمی لاہور سے شائع کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں غالباً اور مقالہ نگاروں نے بھی حصہ لیا تھا، مگر رپورٹ میں اس کی تفصیل درج نہیں۔

اس موقع پر شبلی کالج لاہور کے پرنسپل حافظ نذر احمد نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''علامہ شبلی ایک پرآشوب دور میں ابھرے اور دوسرے انقلاب آفریں عہد میں روپوش ہو گئے۔ انہوں نے ایک طرف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چمن کی آبیاری کی اور دوسری طرف ندوۃ العلما جیسی منفرد درسگاہ کی بناڈالی، پھر دارالمصنفین ایسا عظیم الشان تصنیفی ادارہ قائم کیا۔

(مقالات یوم شبلی ص ۸۵)

آخر میں صدر اجلاس ڈاکٹر سید عبداللہ نے بڑی پر مغز صدارتی تقریر کی اور کہا کہ

> ''پچھلی صدی کی فکری تاریخ میں صرف دو شخصیتیں ہی نظر آتی ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ سربرآوردہ اور یکتا شخصیتیں تھیں۔ ان میں ایک سرسید احمد خاں اور دوسری شخصیت علامہ شبلی نعمانی کی تھی۔ اگرچہ دونوں کا زاویہ نظر مختلف تھا مگر مقاصد دونوں کے ایک تھے۔ سرسید احمد خاں حال کے تقاضوں سے مفاہمت کر کے مستقبل پر نظر رکھتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں علامہ شبلی اس مستقبل کے خواہاں تھے جو ماضی سے ہم آہنگ

ہو۔علامہ شبلی اسلام اور اسلامی تہذیب پر یورپ کی طرف سے لگائے گئے الزامات کا جواب پوری جرات کے ساتھ علمی اور فلسفیانہ انداز سے دینے کے حامی تھے۔اس کا ثبوت انہوں نے اپنے مضامین میں بھی مہیا کیا ہے۔

(مقالات یوم شبلی ص ۸۵-۸۶)

علامہ شبلی تعلیمی میدان میں امتزاجی نظریہ رکھتے تھے،اس کی وجہ یہ تھی کہ علامہ اپنی ملی روایات کو کسی صورت بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔وہ تعلیمی میدان میں بھی اپنی روایات کو آگے بڑھا کر اس میں جدید تعلیم کا پیوند لگانا چاہتے تھے۔ان کے نزدیک تعلیم صرف انگریزی پڑھنے کا نام نہیں تھا۔ .... علامہ شبلی ان علماء میں سے تھے جو حریت فکر اور سیاسی آزادی کے داعی تھے۔" (ایضاً ص ۸۶)

تیسرا "یوم شبلی" اعظمی اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے منعقد کیا۔ اس ایسوسی ایشن کے صدر شہاب الدین صاحب اور سکریٹری حکیم الطاف احمد اعظمی صاحب تھے۔۳/مارچ ۱۹۶۸ء کو یہ پروگرام یونین ہال میں منعقد ہوا۔اس میں ڈاکٹر نذیر احمد [۱۹۱۵-۲۰۰۸ء] مولانا سعید احمد اکبر آبادی [۱۹۰۸-۱۹۸۵ء] مولانا وحید الدین خاں، عبداللطیف اعظمی [۱۹۱۷-۲۰۰۲ء] پروفیسر کبیر احمد جائسی [۱۹۳۷-۲۰۱۳ء] اور مولوی فضل الرحمٰن ندوی وغیرہ شریک تھے۔ پروگرام کی صدارت ممتاز محقق ڈاکٹر نذیر احمد نے کی۔تلاوت قرآن کے بعد اعظمی اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے صدر شہاب الدین صاحب نے ایسوسی ایشن کے اغراض ومقاصد بیان کئے۔اس کے بعد پروفیسر کبیر احمد جائسی نے ایک مضمون "باغی شبلی" کے عنوان سے پیش کیا۔جائسی صاحب کا یہ مضمون اب تک کہیں نظر سے نہیں گذرا،شاید وہ شائع نہیں ہوا۔اس کے چند اقتباسات جو اس کی روداد میں شامل ہیں، یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

"جب ہم علامہ شبلی کی شخصیت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو ان کی پوری زندگی بغاوت اور جنگ جوئی کا ایک حسین امتزاج معلوم ہوتی ہے۔"

''شبلی کے سوانح نگاروں نے ان کے بچپن کے ان چھوٹے چھوٹے واقعات کا ذکر نہیں کیا ہے جن سے پتہ چل سکے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد ہی سے شبلی کی باغیانہ طبیعت کا کیا رنگ تھا؟ ہم کو یہ تو معلوم ہے کہ علامہ شبلی نے مولانا فاروق چریا کوٹی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی لیکن ہم اس بات سے لاعلم ہیں کہ ذہین شاگرد اور فاضل استاذ میں کس نوع کی گفتگو ہوتی تھی اور ان کو سمجھانے کے لئے استاذ کو کتنی کدوکاوش سے کام لینا پڑتا تھا۔''

''جہاں تک اپنے زمانے سے ان کی بغاوت کا سوال ہے تو اس سلسلے میں بلا تکلف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی بغاوت کی داستان سرائی سے عبارت ہے۔ مذہب، سیاست، ادب، بود و باش، نشست و برخاست، غرض کہ زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے جہاں اس بغاوت کی کارفرمائی نظر نہیں آتی۔''

''شبلی کی باغیانہ زندگی کا سب سے دلچسپ باب اس کا اختتام ہے۔ یہ باغی جب دنیا سے جنگ کرتا، وقت کی مروج قدروں کی نفی کرتا اس آستانہ پاک تک پہونچا، جس کو ہم سب رحمت للعالمین کا آستانہ کہتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھا:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چند مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

خدا ایسی بغاوت اور بغاوت کا ایسا انجام سب کو نصیب کرے۔''

(ماہنامہ جامعہ دہلی اپریل ۱۹۶۸ء۔ ص ۲۱۲-۲۱۳)

اس کے بعد مولانا وحید الدین خاں نے ایک طویل مقالہ مولانا شبلی اور علی گڑھ کے عنوان سے پیش کیا۔ انہوں نے حیات شبلی کے حوالہ سے علی گڑھ میں علامہ شبلی کو جو بلند مرتبہ حاصل تھا اس کا ذکر کیا اور کہا کہ:

''شبلی کو علی گڑھ میں یہ مقام ان کی گوناگوں صلاحیتوں کی بدولت حاصل ہوا۔ اس دور میں خیالات کو شعر کے پیراہن میں ظاہر کرنے کا خاص ذوق تھا۔ مولانا شبلی اس میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ نہایت اعلیٰ مذاق کے اشعار لکھتے تھے اور نہایت موثر لہجے میں پڑھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ میں ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی۔ کالج کے ہر جلسے اور تقریر میں مولانا کی نظم اس کے پروگرام کا ضروری جز ہوتی تھی۔''

''شبلی کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے سولہ سال جو علی گڑھ میں گذرے وہ ان کی زندگی کے بہترین سال تھے۔ اس طرح دونوں کو وہ چیز ملی جس کی دونوں میں سے ہر ایک کو ضرورت تھی۔ شبلی نے علی گڑھ کے اوپر اسلام کی تاریخی اور علمی عظمت قائم کی جس کا وہ اس وقت بے حد محتاج تھا۔ اسی طرح علی گڑھ نے شبلی کو جدید کا عرفان دیا جس کے نتیجے میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے درمیان وہ اسلامی شخصیت ابھر سکی جس کو مولانا سید سلیمان ندوی نے عہد جدید کا معلم اول کا لقب دیا ہے۔ شبلی اور علی گڑھ کے دو مختلف دھاروں کا ملنا اس امتزاج کو وجود میں لا سکا جس نے اسلامی تاریخ پر اعلیٰ ترین کتابیں تخلیق کیں۔ جس نے دار العلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی۔ جو دار المصنفین کی شکل میں ظاہر ہوا اور اس سے بھی بڑھ کر جس نے قوم کی اگلی نسلوں کو وہ رجحان اور شعور دیا جو آج بھی جدید پر قدیم کو غالب کرنے کی امانت اپنے سینوں میں لئے ہوئے ہے۔ زمانہ کی وقتی قدروں پر اسلام کی دائمی قدروں کو بالا

کرنے کے لئے بے چین ہے۔ جس طرح علی گڑھ زندہ ہے اسی طرح شبلی بھی زندہ ہے اور دونوں پھر اسی طرح ایک دوسرے سے ملیں گے جس طرح وہ ماضی میں ملے تھے۔''

(ماہنامہ جامعہ دہلی اپریل ۱۹۶۸ء ص ۲۱۴-۲۱۵)

اس کے بعد ڈاکٹر عبداللطیف اعظمی نے تقریر کی۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ انہوں نے دہلی میں شبلی اکادمی قائم کی تھی اور ان کا پی ایچ، ڈی کا مقالہ ''شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں'' اسی اکادمی سے شائع ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ:

''یوں تو شبلی کے احسان اور ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے مگر مسلم یونیورسٹی سے ان کا جتنا گہرا اور دیرپا تعلق رہا ہے اس کی بنا پر مسلم یونیورسٹی میں یوم شبلی منانا خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ شبلی نے علی گڑھ کو بہت کچھ دیا ہے۔ اتنا دیا ہے کہ اس کے احسان سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ اور سرسید کی اور سرسید تحریک کی حمایت کی ہے، مدد کی ہے، دامے درمے سخنے ہر طرح۔ انہوں نے اپنے بعض رسالوں اور کتابوں کو جو بہت مقبول تھیں یونیورسٹی کو دے دیا تھا جس کا سرسید نے بڑی احسان مندی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ شبلی کی ایک مثنوی صبح امید ہے جس کے بارے میں رام بابو سکسینہ نے اپنی مشہور کتاب تاریخ ادب اردو میں لکھا ہے کہ یہ کتاب ایک زمانہ میں اس قدر مقبول اور علی گڑھ کے طلبہ کو اتنی پسند تھی کہ اکثر اوقات وہ اس کو اسٹیج پر خوش آوازی سے پڑھتے اور لوگوں کے دلوں کو بے چین کرتے تھے۔ اس مثنوی میں شبلی نے سرسید کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں سرسید کی خدمات کی کیا عزت اور قدر تھی۔'' (ایضاً ص ۲۱۶)

انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ:

''مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے سرسید اور شبلی کے اختلافات کو بہت نمایاں کر کے پیش کیا ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دونوں کے رجحانات، دونوں کے عقائد اور دونوں کی طبیعتوں میں بڑا فرق تھا مگر پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ اتنا فرق نہیں تھا جتنا مولانا سید سلیمان ندوی اور حضرت تھانوی میں تھا۔شبلی نے علی گڑھ کی سولہ سالہ زندگی میں سرسید کی عظمت اور خدمت کا جس طرح اعتراف کیا اور ان کے ساتھ مل کر جس طرح کام کیا ہے اور ان کی شخصیت سے جس قدر متاثر نظر آتے ہیں اسے ہم ریاکاری اور مصلحت پر محمول نہیں کرسکتے۔علی گڑھ اور سرسید سے شبلی کی اس غیر معمولی محبت،ان کے بے پایاں خلوص اور ان کے گہرے تعلقات کی بنا پر علی گڑھ کو شبلی کی خدمات کا جس طرح اعتراف کرنا چاہئے تھا نہیں کیا۔ آج یوم شبلی مناکر اس فرض کو ادا کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے وہ قابل صد مبارک باد ہے۔'' (ایضاً ص ۲۱۷)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی [مدیر ماہنامہ برہان دہلی] کے فضل وکمال سے اہل علم بخوبی واقف ہیں وہ بھی اس یوم شبلی کی تقریب میں شریک تھے۔انہوں نے بھی سرسید وشبلی کے حوالے سے تقریر کی اور فرمایا کہ

''۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد نئے حالات پیدا ہوئے۔تمام بنیادیں ہل گئیں۔اس انقلاب کا اثر پورے ملک پر پڑا مگر مسلمان خاص طور پر متاثر ہوئے۔یہ اثر اتنا شدید تھا کہ سرسید جیسا عزم وہمت کا آدمی بھی مایوس اور بددل ہوگیا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ اپنے ملک سے ہجرت کر کے باہر چلا جائے۔اس انقلاب کے بعد دو رجحانات بہت نمایاں تھے۔ ایک یہ کہ نئے حالات کو جوں کا توں قبول کرلیا جائے۔دوسرا یہ کہ حالات سے کنارہ کشی اختیار کرلی جائے۔مگر ان دونوں رجحانات کے علاوہ ایک

تیسرا رجحان بھی تھا۔ وہ یہ کہ حالات کا جائزہ لے کر بنیادی قدروں کی حفاظت کی تدبیریں کی جائیں۔ سرسید اوران کے رفقاء تطبیق چاہتے تھے اور انقلاب کو اپنے لئے مفید بنانا چاہتے تھے۔ تطبیق کی خواہش اور کوشش میں سرسید اور شبلی بنیادی طور پر ایک ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ سرسید بعض معاملات میں اپنے حدود سے تجاوز کر گئے اور شاید ایسا اس لئے ہوا کہ وہ انقلاب سے براہ راست دو چار ہوئے تھے۔ اور ہمہ گیر تباہیوں کو بچشم خود دیکھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ملت کے احساس کمتری کو دور کر کے ان میں حالات کے مقابلہ کا حوصلہ پیدا کیا جائے اور زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت اور جذبہ پیدا کیا جائے۔ افسوس کہ سرسید کا قدم جادہ اعتدال سے کہیں کہیں ہٹ گیا اور تطبیق پیدا کرنے میں مرعوبیت کا شکار ہو گئے، خاص طور پر معاشرتی معاملات میں اور سرکاری ملازمت کے سلسلے میں۔ برخلاف اس کے شبلی ان مراحل سے نہیں گذرے تھے، جن سے سرسید کو گذرنا پڑا تھا۔ اس لئے شبلی کے جذبات و احساسات وہ نہیں ہو سکتے تھے جو سرسید کے تھے۔ شبلی نے سرسید کے بنیادی مقاصد سے سو فی صد اتفاق کیا۔ وہ نہ صرف سرسید کے موید بلکہ قدرداں تھے مگر ان قدردانیوں کے ساتھ شبلی مسلمانوں کی ثقافتی انفرادیت کے بھی قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نشاۃ ثانیہ مکمل طور پر صحت منداسی وقت ہو سکتی ہے، جب مسلمان قدیم ثقافت سے وابستہ رہتے ہوئے نئے حالات کو قبول کریں۔ شبلی دراصل قدیم وجدید کے سنگم تھے۔ اور دونوں کو ملانے کی انہوں نے کامیاب کوشش کی۔ شبلی اور سرسید کے باہمی تعلقات اور باہمی روابط اتنے گہرے اور اتنے مضبوط تھے کہ ایک کی تعریف کرتے وقت دوسرے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں نے مل کر مسلمانوں کی خدمت

کی ہے اور ہم دونوں کے یکساں طور پر مرہون منت ہیں۔''

(ایضاً ص ۲۱۷-۲۱۸)

ایک ریسرچ اسکالر شمسی طہرانی نے سرسید اور شبلی کے عنوان سے ایک پرجوش نظم پیش کی، جس کے دو بند عبداللطیف اعظمی نے اپنے رپورتاز میں نقل کئے ہیں۔ دوسرا بند علامہ شبلی کی مدح میں ہے۔

بخشا ہے تو نے شعروادب کو وہ بانکپن   تا حشر جس سے ہوگا سرافراز علم وفن
ہر شعبہ حیات پر تو یوں ہے ضوفگن   شبنم پہ جیسے صبح کے سورج کی ہو کرن

ابھریں گے زندگی سے اشارے نئے نئے
ٹکرائیں گے نظر سے نظارے نئے نئے

اس ''یوم شبلی'' کے بعد ۱۹۷۵ء میں شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ نے ''شبلی ہفتہ'' تقریبات کا اعلان کیا۔ شبلی کے حوالے سے یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد پروگرام تھا۔ اس میں شبلی کالج کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، لکھنو یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی اور گورکھپور یونیورسٹی کے بعض اہل علم نے شرکت کی۔ علی گڑھ سے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی [۱۹۲۷-۱۹۷۸ء] لکھنو یونیورسٹی سے ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی اور الہ آباد سے جناب شمس الرحمٰن فاروقی تشریف لائے اور گراں قدر مقالات اور خطبات پیش کئے۔ ۱۸ نومبر ۱۹۷۵ء کو شبلی ہفتہ کا افتتاح شبلی نیشنل کالج کے پرنسپل جناب شوکت سلطان صاحب [۱۹۱۳-۱۹۸۶ء] کے ہاتھوں ہوا۔ کالج ایک استاذ میجر علی حماد عباسی [م: ۱۱ر جولائی ۱۹۹۷ء] نے صدر جمہوریہ اور وزیر تعلیم کے تہنیتی پیغامات پڑھ کر سنائے۔ اس افتتاحی اجلاس میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے شبلی کی شخصیت پر بڑی پرمغز تقریر کی۔ اسی دن شام کو دوسری نشست ڈاکٹر محمد عرفان صاحب صدر شعبہ اردو، شبلی نیشنل کالج کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنا مقالہ شبلی کا تنقیدی مسلک پیش کیا۔ یہ مقالہ ان کی کتاب ''مضامین نو'' میں شامل ہے۔ پروفیسر شہریار نے ان کے منتخب مضامین کا جو مجموعہ ''مضامین خلیل الرحمٰن اعظمی'' کے نام سے مرتب کیا

ہے،اس میں بھی یہ مقالہ شامل ہے۔

اس میں انہوں نے شعر العجم کے حوالہ سے بحث کی ہے۔ان کا خیال ہے کہ شبلی تنقید میں رومانی اور جمالیاتی انداز فکر کے علم بردار ہیں۔اور وہ معاصرین کے مقابلہ میں جدید تر تنقیدی خیالات سے زیادہ قریب ہیں۔البتہ انہوں نے شعر کی بنیاد صرف جذبہ واحساس پر رکھی ہے،ادراک وشعور کو اہمیت نہیں دی۔اور شعر میں لفظ کو زیادہ اہم قرار دیا ہے۔اس لئے شعر کی معنویت اور تعمق کو پرکھنے کی صلاحیت ان کی شعریات میں بہت کم ہیں اور بڑی شاعری بغیر گہری معنویت اور فکری عنصر کے ممکن نہیں۔''(شبلی کالج میگزین ۷۶-۱۹۷۵ء ص ۸)

ڈاکٹر محمد عرفان نے صدارتی خطبے میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے مقالہ پر تبصرہ کیا اور کہا کہ

> ''جس انداز سے ڈاکٹر صاحب نے شبلی کے تنقیدی مسلک پر روشنی ڈالی ہے وہ قابل قدر ہے،لیکن اس سے اختلاف کی بہر حال گنجائش ہے۔شبلی نے شعر میں معنویت کی نفی نہیں کی ہے بلکہ اس فنی نقطہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ لفظ کو اگر سلیقے سے برتا جائے تو اس کی معنویت نہیں ابھر سکتی۔لفظ و معنی کو علاحدہ علاحدہ کر کے دیکھنا درست نہیں ہے۔لفظ کے اندر ساری معنویت مضمر ہوتی ہے اور معنی کی خوبی بھی لفظ ہی کی خوبی مانی جاتی ہے۔''
>
> (حوالہ سابق ص ۹)

۱۹ر نومبر کو شبلی ہفتہ کا دوسرا اجلاس پروفیسر وسیم الحسن کی صدارت میں منعقد ہوا۔اس میں شعبہ نباتیات گورکھپور یونیورسٹی کے ڈاکٹر ڈی این شرما نے انگریزی میں پاپولر سائنس کے موضوع پر خطبہ دیا۔۲۰ر نومبر کا جلسہ طلبہ کے معلومات عامہ مقابلہ کے لئے مختص تھا۔اس میں شبلی انٹر کالج اور ڈگری کالج کے طلبہ نے حصہ لیا اور انعامات حاصل کئے۔۲۱ر نومبر کو کالج کے کانوکیشن ہال میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔اسی دن شام کو رامائن پتی صدر شعبہ ہندی کی صدارت میں شبلی ہفتہ کے چوتھے دن کا اجلاس شروع ہوا۔اس اجلاس کے مہمان خصوصی ڈاکٹر تربھون سنگھ تھے جو بنارس ہندو یونیورسٹی سے تشریف لائے

تھے۔انہوں نے ہندی افسانوں پر تفصیل سے گفتگو کی۔شام کی نشست میں مشہور نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے یادگاری خطبہ دیا۔ان کے خطبے کا عنوان ''شبلی کا نظریہ شعر'' تھا۔ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ڈاکٹر محسن عثمانی صدر شعبہ سماجیات شبلی کالج نے فاروقی صاحب اوران کی تنقید نگاری پر روشنی ڈالی۔فاروقی صاحب نے شبلی کے نظریہ شعر پر طویل گفتگو کی اور کہا کہ چونکہ حالی کے مقدمہ شعروشاعری کی طرح شبلی کی شعریات کہیں منضبط نہیں ہیں، اس لئے اس کی قدر و قیمت کی تعیین میں دشواری ہوتی ہے۔پھر حالی وشبلی نے تخئیل پر جو بحث کی ہے اس کے متعلق کہا کہ اس سلسلے میں شبلی نے زیادہ کارآمد باتیں کہی ہیں۔انہوں نے شبلی کے نظریہ محاکات پر شعرالعجم کے حوالہ سے بحث کرتے ہوئے بتایا کہ شبلی شاعرانہ مصوری میں ابہام اور مجرد خیالات کی مصوری کی طرف جس طرح اشارہ کرتے ہیں وہ جدید تصورات سے کافی قریب ہے۔طویل گفتگو کے بعد انہوں نے مشورہ دیا کہ علامہ شبلی کے شعری تصورات خاص کر شعرالعجم میں درج کی ہوئی شعریات کو علاحدہ شائع کرنے کی ضرورت ہے، تا کہ اس کی اصل اہمیت کی طرف لوگ متوجہ ہوں۔(شبلی کالج میگزین ۱۹۷۵ء ص ۱۰-۱۱)

۲۳رنومبر کی شام کو انیس انصاری صاحب ایس، ڈی، ایم، اعظم گڑھ [موجودہ وائس چانسلر خواجہ معین الدین عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ] کی صدارت میں جلسہ کا آغاز ہوا۔اس میں مرحوم سلطان مبین صاحب لکچرر عربی وسنسکرت شبلی انٹر کالج، حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی [۱۹۱۸-۲۰۰۶ء] ناظم جامعۃ الرشاد اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین نے علامہ شبلی کی شخصیت اور علمی وادبی خدمات پر مقالات پیش کئے۔

۲۴رنومبر کو شبلی ہفتہ کا آخری اجلاس پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے خطاب کے لئے وقف تھا۔ان کا موضوع تھا ''شبلی کی انشا پردازی''۔ان سے پہلے ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی [۱۹۳۵-۲۰۰۵ء] اور ڈاکٹر محمد طاہر [م: یکم جنوری ۱۹۹۶ء] استاذ شبلی کالج نے شبلی کے فکروفن پر اپنے اپنے مقالات پیش کئے۔پھر نونہروی صاحب نے خطاب کیا اور شبلی کی انشا پردازی کی خصوصیات بیان کیں اور اس کی متعدد مثالیں پیش کیں، معاصرین

سے موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ

"شبلی کی انشاء کی دل کشی اور شعریت ان کے معاصرین میں کسی کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ شبلی کی نثر میں ہر طرح کے موضوعات کے برتنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ بات سرسید اور حالی کی نثر میں بھی نہیں۔ اس طرح شبلی اپنی جگہ مکمل ہیں اور سرسید اور حالی دونوں مل کر مکمل ہوتے ہیں۔" (شبلی نیشنل کالج میگزین ۷۶-۱۹۷۵ء ص ۱۲)

علامہ شبلی کی یاد میں منعقد ہونے والا یہ یوم شبلی ایک خاص اہمیت کا حامل تھا، اس لئے کہ ایسی تقریبات شبلی کالج کے علاوہ کہیں اور منعقد نہیں ہوئیں۔ حتیٰ کہ ۱۹۸۳ء میں شبلی نیشنل کالج کے صد سالہ جشن کے موقع پر بھی کچھ نہ ہو سکا۔ کاش اس میں پیش کئے گئے مقالات و خطبات بھی شائع کردئے گئے ہوتے۔

یادگاری خطبات

شبلی شناسی کے سلسلے میں مشہور مورخ اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کے تیسرے ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی یہ کوشش خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ انہوں نے شبلی یادگاری خطبات کا آغاز کیا۔ اس سلسلے کا پہلا خطبہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۷۸ء کو دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے صدر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی [م: ۱۹۹۹ء] کی صدارت میں مشہور محقق ڈاکٹر نذیر احمد نے دیا۔ عنوان "مولانا شبلی اور ان کی فارسی خدمات" تھا۔ یہ مقالہ ماہنامہ معارف جنوری فروری ۱۹۸۰ء میں دو قسطوں میں شائع ہوا۔ ۷ر سال بعد دوسرا یادگاری خطبہ ۱۱ر فروری ۱۹۸۶ء کو "مولانا شبلی بحیثیت مورخ" کے عنوان سے مشہور مورخ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے دیا۔ یہ خطبہ بھی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں پڑھا گیا۔ یہ خطبہ ماہنامہ معارف مارچ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا ہے۔ ان کے علاوہ درج ذیل اہل علم نے یادگاری خطبات دئے:

۳۔ پروفیسر عبدالمغنی — علامہ شبلی کی تنقید نگاری ۱۹۸۸ء

۴۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی، اسلامی مدارس کے نصاب تعلیم کا مسئلہ علامہ شبلی کے حوالہ سے

۵۔ پروفیسر عبدالحق — شبلی کی انتقادی فکر

۶۔ پروفیسر کبیر احمد جائسی — شبلی کا فکری اجتہاد

۷۔ شمس الرحمٰن فاروقی — شبلی کی فارسی غزل

۸۔ پروفیسر اختر الواسع — علامہ شبلی کے تعلیمی تصورات کی عصری معنویت

دارالمصنفین نے اب تک کل ۸؍ یادگاری خطبات کا اہتمام کیا ہے۔ اس کا آغاز ۱۹۷۸ء میں ہوا تھا۔ سنہ ۲۰۱۳ء تک ۳۵؍ سال کے عرصہ میں دارالمصنفین محض ۸؍ خطبات کا اہتمام کرسکا۔ ان یادگاری خطبات میں علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر ونظر کے چند اہم پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا اور بلاشبہ ان میں بڑے تحقیقی مطالعات پیش کیے گئے۔

دارالمصنفین کے علاوہ ایک بار خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے ''علامہ شبلی اور ان کی سیرۃ النبی'' کے موضوع پر ایک توسیعی خطبے کا اہتمام کیا۔ یہ خطبہ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے ۲۹؍ ستمبر ۲۰۰۲ء کو دیا تھا۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری اس کے ڈائرکٹر تھے۔

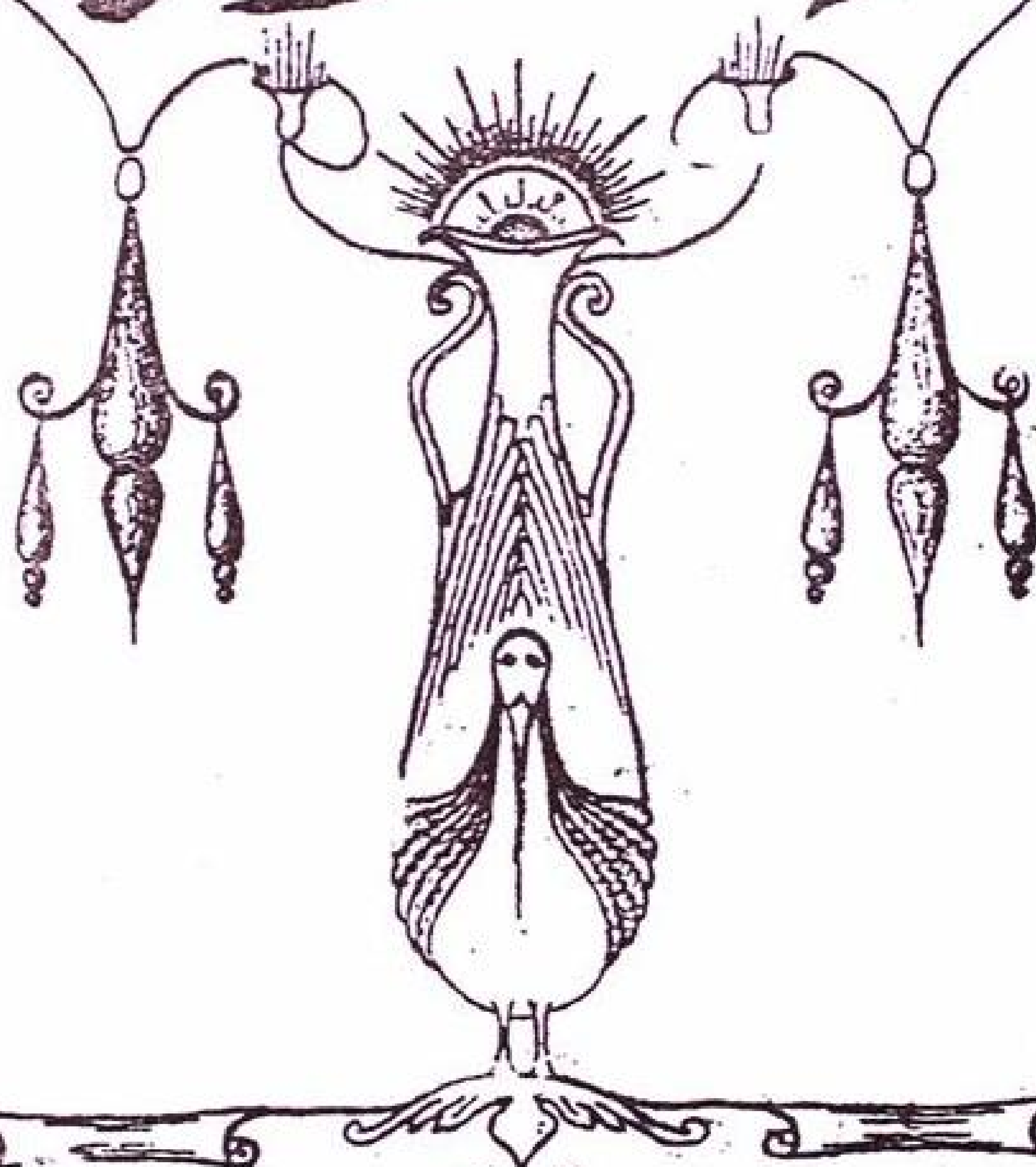
گذشتہ سو سال میں شبلی کے افکار ونظریات کی ہمہ گیری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ علامہ شبلی ہر حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ ہماری ادبی تاریخ مختلف مراحل سے گذری مختلف مکتبہ فکر وجود میں آئے۔ ترقی پسند تحریک اٹھی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نظریات قائم ہوئے۔ اسلامی ادب کا غلغلہ بلند ہوا۔ نظریات کی تبدیلی اور انقلابی تحریکوں کے باوجود علامہ شبلی سب کے نور نظر رہے۔ ان کے افکار وخیالات کی روشنی سے سب نے روشنی لی اور ان حلقہ ہائے فکر ونظر میں شبلی کی کاوشوں اور کارناموں کو تحسین وستائش کی نظر سے دیکھا گیا۔

شبلی شناسی کی سو سالہ تاریخ میں مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] سے بڑا شبلی شناس اب تک پیدا نہیں ہوا۔ ان کی اس سلسلہ کی کوششوں کو زمانہ فراموش نہ کرسکے گا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ [۱۹۰۶-۱۹۸۶ء] مہدی حسن افادی [۱۸۷۰-۱۹۲۱ء] شیخ محمد اکرام [۱۹۰۸-

۱۹۷۳ء] مولانا ضیاء الدین اصلاحی [۱۹۳۷ - ۲۰۰۸ء] عبداللطیف اعظمی اور ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی وغیرہ اپنے اپنے حدود میں شبلی شناسی کے بڑے نام ہیں۔

علامہ شبلی ہندوستان کے پہلے عالم تھے جنہوں نے سیاسی محاذ پر فرقہ پرستی کے خلاف سب سے پہلے آواز بلند کی۔ دوقومی نظریہ کی مخالفت اور کانگریس کی اس وقت حمایت کی جب سارا ہندوستان مسلم لیگ کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہا تھا۔ برسوں بعد یہی کام جمعیۃ علماء ہند نے کسی قدر انجام دیا مگر آزادی کے بعد حکومت کی سطح پر علامہ شبلی کو کبھی یاد نہیں کیا گیا۔ شعبہ مطالعات شبلی اور شبلی چیر تو دور ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری نہیں کیا گیا۔ قومی سیاست میں نظریاتی اعتبار سے ہم آہنگی کے باوجود جمعیۃ علماء نے شاید ہی کہیں ان کا نام لیا ہو۔ رہے برصغیر کے دوسرے ممالک پاکستان و بنگلہ دیش تو وہ علامہ شبلی کو کیوں کر یاد کرتے۔ وہاں بھی غالباً حکومت کی سطح پر کوئی کام نہیں ہوا۔ البتہ اہل علم وکمال اور دانشوروں نے شبلی اور فکر شبلی سے ہمیشہ سروکار رکھا، آج شبلی شناسی کا جو سرمایہ ہمارے پاس ہے وہ انہیں دانش مندوں کا رہین منت ہے۔

خضر راہ



مرتبہ

حامد ندوی

خضر راہ شبلی نمبر کا سرورق

(۱)

خضر راہ، لکھنؤ

[شبلی نمبر]

[مدیر: حامد ندوی، ستمبر ۱۹۳۰ء، نیا گاؤں لکھنو]

ماہنامہ خضر راہ نیا گاؤں لکھنؤ سے غالباً مارچ ۱۹۲۸ء میں جاری ہوا۔ اس لئے کہ اس کے شبلی نمبر پر جو مارچ ۱۹۳۰ء کا شمارہ ہے، جلد نمبر ۳، شمارہ نمبر ا لکھا ہوا ہے۔ اس کے محض دو شمارے میری نظر سے گذرے ہیں۔ ایک شبلی نمبر اور دوسرا نومبر ۱۹۲۹ء۔ اس کے درج ذیل شمارے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں:

۱۔ مارچ ۱۹۲۹ء	۲۔ مئی تا نومبر ۱۹۲۹ء
۳۔ اپریل تا جون ۱۹۳۰ء	۴۔ فروری ۱۹۳۱ء

ماہنامہ الندوہ کے بند ہو جانے کے بعد اسے ندوی فضلا نے جاری کیا تھا۔ اس کے مضمون نگاروں میں مولانا محمد حنیف ندوی، عبدالقدوس ہاشمی [۱۹۱۱-۱۹۸۹ء] رئیس احمد جعفری [۱۹۰۸-۱۹۶۸ء] وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ رئیس احمد جعفری نے مدیر کی عدم موجودگی میں ایک شمارے کا اداریہ بھی لکھا ہے۔ اس کے مدیر حامد ندوی تھے۔ اس کا رجسٹریشن نمبر اے ۱۹۲۰ تھا۔

حامد ندوی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ندوۃ العلماء کے فاضل تھے، لیکن کہاں کے رہنے والے تھے، تصنیف و تالیف کی تربیت کس سے حاصل کی اور کون سے علمی و تصنیفی کارنامے انجام دئے اور کب وفات پائی، کسی قسم کی تفصیلات دستیاب نہ ہوسکیں۔ البتہ یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے کہ ماہنامہ الندوہ بند ہو جانے کے بعد ندوی فضلا کے ترجمان کے طور پر ماہنامہ خضر راہ

جاری کیا اور الندوہ کے بانی مدیر علامہ شبلی نعمانی کی یادگار میں اس کا خصوصی شمارہ بھی شائع کیا۔ علامہ شبلی کی وفات (۱۸رنومبر ۱۹۱۴ء) کے ۱۶رسال بعد ۱۹۳۰ء میں خضر راہ نے شبلی نمبر شائع کیا تھا۔ یہ علامہ شبلی کی شخصیت اور کارناموں کے اعتراف میں کسی رسالے کا پہلا خصوصی شمارہ تھا۔

خضر راہ کا یہ شبلی نمبر کئی لحاظ سے منفرد اور وقیع ہے۔ اس میں جو مضامین و مقالات شامل ہیں وہ شبلی کے احباب، معاصرین اور تلامذہ کے قلم سے ہیں۔ صرف ایک مضمون نگار اس زمرہ سے علاحدہ ہیں اور وہ ''سودیشی ریل'' کے مصنف شوکت تھانوی[۱۹۰۴-۱۹۶۳ء] ہیں۔ ان کے مضمون کا عنوان ہے ''بڑے اچھے آدمی تھے۔''

خضر راہ کے شبلی نمبر میں جن اہل قلم کے مضامین شامل ہیں ان کے نام اور مضامین کے عناوین یہ ہیں:

۱۔شذرات	حامد ندوی
۲۔حجۃ الملۃ والدین حضرت شبلی نعمانی	علامہ سید سلیمان ندوی
۳۔علامہ شبلی مرحوم	سید جالب، ایڈیٹر روزنامہ ہمت
۴۔تحریک اصلاح وتغیر اور علامہ شبلی نعمانی	امام الاحرار مولانا ابوالکلام آزاد
۵۔ایڈیٹر خضر راہ کے نام	ملا رموزی
۶۔حیات شبلی	مولانا عبدالسلام ندوی
۷۔آٹھ گھنٹے شبلی کے ساتھ	ایم مہدی حسن افادی
۸۔مولانا شبلی اور ندوہ کا مخیلہ	مولانا محب اللہ لاری
۹۔بڑے اچھے آدمی تھے	شوکت تھانوی
۱۰۔مولانا شبلی کی قومی خدمات	مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی
۱۱۔مولانا شبلی کی اردو شاعری	سید رئیس احمد جعفری
۱۲۔ہمہ گیر شبلی	مولانا ابوالبقا
۱۳۔چند منٹ شبلی کے ساتھ	مشیر احمد صاحب علوی

۱۴۔ کتب خانہ ندوۃ العلماء	حکیم سید عبد العلی

۱۵۔ شبلی مکاتیب شبلی میں	حامد ندوی

مذکورہ عناوین سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خضر راہ کا یہ نمبر کس قدر وقیع ہے۔ خضر راہ کا اگر اس لحاظ سے مطالعہ کیا جائے کہ یہ حیات شبلی سے پہلے شائع ہوا تو اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

ا۔ شذرات میں حامد ندوی نے شبلی نمبر شائع کرنے کے اعلان اور پھر تاخیر کے اسباب اور اس کے مشمولات کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ کورذوقی اور ادب کے گرتے ہوئے معیار و مذاق پر اظہار افسوس کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ

''ہمارا مقصد دعوت نظر اور تفریح طبع نہیں، اگر خدانخواستہ آپ بھی اس مرض متعدی کا شکار ہیں اور حسن صورت کو حسن سیرت پر ترجیح دینے کے عادی تو خدا کے واسطے اس (شبلی نمبر) کو ہاتھ نہ لگایئے کہ یہ دلچسپی کا سامان نہیں اور نہ تفریح طبع اس کی غرض و غایت۔............ ہاں! اگر آپ کو مادری زبان سے کوئی ہمدردی ہے اور اردو کی کم مائیگی کے باوجود آپ اس کو اپنی چیز سمجھتے ہیں تو میں آپ کو اسی کا واسطہ دوں گا کہ شبلی نمبر کو پڑھئے اور بار بار پڑھئے کہ بلا مبالغہ یہ دنیائے علم و ادب کے بہترین شاہکار ہیں اور بلاشبہ عہد حاضر کے مشہور ترین اہل قلم اور فاضل ترین ائمہ علم و ادب کے گراں قدر و بلند پایہ مضامین اس کے زیب صفحات ہیں۔''

(خضر راہ شبلی نمبر مارچ ۱۹۳۰ء ص ۲)

مشمولات کی طرف قارئین کو متوجہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''کیا میں آپ کو یہ بتلاؤں کہ امام الاحرار مولانا ابوالکلام آزاد کس پایہ کے آدمی ہیں کہ جن کی جنبش قلم نے ایوان حکومت میں تہلکہ مچایا۔ کیا میں یہ عرض کروں کہ فخر ملت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کس حقیقت کے

عالم ہیں کہ جن کی تصانیف ملک وقوم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں اور کیا یہ بیان کروں کہ سید جالب ایڈیٹر ہمت [سابق ایڈیٹر ہمدم] دنیائے صحافت میں کن روایات کے مالک ہیں جبکہ اجراء ہمدم کے وقت سے اب تک اس کے معلومات، حسن تدبر، صحت رائے اور زور قلم کا بار بار اعتراف کیا جارہا ہے۔ کیا ضیاء الملک ملا رموزی کے تعارف کی ضرورت ہے جو مخزن میں اپنی تصویر پر بقلم خود بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ کیا سودیشی ریل کے مصنف شوکت تھانوی کو عوام سے انٹروڈیوس کرانے کی ذمہ داری مجھ پر عائد کی جائے گی؟'' (خضر راہ شبلی نمبر مارچ ۱۹۳۰ء ص ۳-۴)

حامد علی ندوی نے خضر راہ کی ترتیب اور اس کے مشمولات کا ذکر بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ

''سب سے پہلے وہ مضامین ہیں جن کا تعلق آپ کی سوانح حیات سے ہے۔ اس میں مولانا سید سلیمان ندوی کا مضمون حجۃ الملۃ والدین علامہ شبلی نعمانی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے بعد قومی، ملکی، مذہبی، علمی اور ادبی خدمات کا تذکرہ ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا عبدالسلام ندوی کا مضمون حیات شبلی اور انہیں کے ہم نام اور ہم نسبت اور شاید کچھ دنوں بعد ہم پیشہ قدوائی ثم ندوی کا مضمون مولانا شبلی کی قومی خدمات خاص طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ پھر خصوصیات یا صحیح معنوں میں علامہ شبلی کی حقیقی پوزیشن کی وضاحت کے ساتھ عالم اسلام کے ایک مدبر اور تحریک اصلاح وتغیر کے ایک پیام بر ہونے کی حیثیت سے آپ کا تعارف کرایا گیا ہے اور آپ کے ان حالات وافکار کو پیش کیا گیا ہے جس کی طرف سے دنیا آنکھ بند کیے ہوئے ہے اور جس سے لاعلمی وناواقفیت کا اکثر وبیشتر مختلف پیرایہ میں اعتراف کیا جاتا رہا ہے، حالانکہ یہی وہ چیز ہے جو آپ کا طرہ امتیاز

اور وجہ تفاخر ہے۔ یقین مانئے کہ شبلی اگر محض مورخ، ادیب، شاعر یا عالم ہوتے اور اس سے بدرجہا بہتر ذخیرہ تصنیفات و تالیفات کی صورت میں چھوڑ جاتے تو قطعاً وہ اس سے زیادہ کے مستحق ہرگز نہ ہوتے کہ تاریخ کے اوراق میں ان کو کہیں جگہ دے دی جائے۔ تذکرہ کے چند صفحات ان کے لئے وقف کر دئے جائیں یا پھر مخصوص صحبتوں اور جلسوں میں ''ذکر خیر'' کے ساتھ یاد کئے جائیں اور خدار کھے بڑے اچھے آدمی تھے کے حدود سے آگے نہ بڑھنے پائیں۔'' (خضر راہ شبلی نمبر مارچ ۱۹۳۰ء ص ۴-۵)

علامہ شبلی تحریک ندوہ کے بانیوں میں تھے۔ اس کے لئے انہوں نے بڑی جدوجہد کی، چنانچہ انہیں ندوۃ العلما کا معتمد تعلیم نامزد کیا گیا اور انہوں نے ندوہ میں قیام کر کے اسے ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ آخر میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ انہیں ندوہ سے مستعفی ہونا پڑا۔ مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] نے اپنے مضمون تحریک اصلاح و تغیر یعنی ندوہ میں علامہ شبلی کے نمایاں حصہ کی وضاحت کی ہے، جو خضر راہ کے اس خاص نمبر میں شامل ہے۔ اس کی طرف متوجہ اور مخالفین کے نقطہ نظر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا حامد ندوی نے لکھا ہے کہ

''میں آپ کو اس طرف خاص توجہ دلاؤں گا اور سفارش کروں گا کہ آپ اس کا بغور مطالعہ کریں اس لئے نہیں کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کا مضمون ہے، نہ اس لئے کہ اس کی زبان یا انداز بیان دلآویز اور پر جوش ہے بلکہ اس لئے اور محض اس لئے کہ اس میں تمام حالات حاضرہ کا خیال کرتے ہوئے اور پوری جزئیات کو مدنظر رکھتے ہوئے نتیجہ تک پہونچنے کی کوشش کی گئی ہے اور ''تخریب'' کے بجائے ''تعمیر'' کو اصل قرار دیا گیا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو کامیابی کا راز اور مستقبل کے روشن اور شاندار ہونے کی ضامن ہے۔ جب تک کسی عمارت کی بنیادیں مضبوط اور ٹھوس نہ

ہوں گی اس کی پائیداری یقینی اور اس کا استحکام ناممکن ہے۔"

(خضر راہ شبلی نمبر مارچ ۱۹۳۰ء ص ۵)

حامد ندوی نے اگست ۱۹۲۹ء میں شبلی نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا تھا، لیکن وہ اس وقت پایہ تکمیل کو نہ پہونچ سکا، اس بنا پر اسے جنوری ۱۹۳۰ء میں شائع کرنے کا اعلان ہوا۔ پھر نومبر دسمبر ۱۹۲۹ء کے مشترکہ شمارے میں تاریخ میں توسیع کی گئی۔ اس شمارے کے شذرات رئیس احمد جعفری کے قلم سے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ارادہ تھا کہ جنوری (۱۹۳۰ء) میں شبلی نمبر شائع کیا جائے جس میں مولانائے مرحوم کے ادوار حیات پر مستقل مواد فراہم کیا جائے۔ اس کے لئے تمام ضروری انتظامات مکمل ہو گئے تھے اور اس سلسلہ میں شبلی اکادمی یعنی دارالمصنفین سے جو فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا وہ حاصل کر لیا گیا، چنانچہ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر اوائل اکتوبر میں اعظم گڑھ کا سفر کیا گیا اور مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اور مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے پر مغز مقالات حاصل کئے گئے، لیکن جنوری میں چونکہ اکثر معاصرین کے خاص خاص نمبر شائع ہوں گے اور ہم بطور رسم کے نہیں بلکہ مستقل اصول کے تحت یہ نمبر نکال رہے ہیں، اس لئے اب خضر راہ کا شبلی نمبر جنوری میں نہیں بلکہ مارچ میں شائع ہوگا۔" (خضر راہ، لکھنو، نومبر ۱۹۲۹ء ص ۵)

لیکن تاخیر کا اصل سبب یہ تھا کہ خضر راہ کے مدیر خضر راہ پریس قائم کرنے کے لئے سفر پر تھے، جس میں انہیں کامیابی ملی اور لکھنؤ میں خضر راہ پریس قائم ہوا اور اسی میں یہ شبلی نمبر طبع ہوا۔ قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ خضر راہ پریس کے ساتھ ہی خضر راہ بک ایجنسی بھی قائم ہوئی، جس میں دیگر مصنفین کی کتابوں کے ساتھ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی تصنیفات بھی دستیاب رہتی تھیں۔ خضر راہ کے کئی شماروں میں اس طرح کے اشتہارات نظر آئے۔ خضر راہ میں مختلف طرح کے اشتہارات شائع ہوئے ہیں لیکن شبلی نمبر کا اشتہار خاص طور

پر اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔اس کی عبارت یہ ہے:

''۱۹۳۰ء میں ایک زبردست انقلاب، ادب، تاریخ، تنقید اور مطائبات کا گراں قدر مرقع یعنی خضر راہ کا شبلی نمبر منصۂ جمال پر مارچ کے دوسرے ہفتہ میں جلوہ فگن ہو جائے گا، جس میں علامہ شبلی کی مختلف النوع مگر حیات طیبہ پر بصیرت افروز مضامین ہوں گے۔ فلسفہ، ادب، تاریخ، علم کلام کا یہ نادر صحیفہ تاریخی صفحات میں خوشگوار اور جمیل اضافہ ہوگا۔''

(خضر راہ نومبر ۱۹۲۹ء ص ۷)

۲۔ خضر راہ شبلی نمبر کا دوسرا مقالہ ''حجۃ الملۃ والدین علامہ شبلی نعمانی'' مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ہے۔اس میں علامہ شبلی نعمانی کی جامع کمال شخصیت کا ایک عمدہ مگر اجمالی مرقع آ گیا ہے اور شاید ہی کوئی پہلو رہ گیا ہو۔ یہ مقالہ انہوں نے علامہ شبلی کی وفات پر زمیندار لاہور میں لکھا تھا۔ جولائی ۱۹۱۶ء میں ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جاری ہوا تو اس میں بھی [اگست ۱۹۱۶ء ص ۱۲-۲۵] یہ شائع ہوا۔اس کے بعد خضر راہ میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ان کے وفیاتی مضامین کے مجموعہ ''یاد رفتگاں'' میں بھی شامل ہے۔

۳۔ سید جالب دہلوی [۱۸۷۴-۱۹۳۰ء] ایڈیٹر ''ہمدم'' و ''ہمت'' بڑے پایہ کے ادیب وصحافی اور سرسید احمد خاں کے رشتہ دار تھے۔ان کا بچپن علی گڑھ میں گذرا تھا۔علامہ شبلی کو قریب سے دیکھا تھا۔انہوں نے حافظے میں محفوظ علی گڑھ کی بہت سی یادوں کو اپنے مضمون میں بیان کیا ہے۔ان کے عہد میں کچھ لوگ علامہ شبلی کو مولانا شبلی اور کچھ لوگ مولوی شبلی کہتے تھے۔ جولوگ مولوی شبلی کہتے تھے بقول جالب دہلوی ان کا خیال تھا کہ:

''تہذیب الاخلاق میں مذہبی امور پر سرسید جو کچھ لکھتے ہیں اس میں مذہبی کتب کے حوالے علامہ شبلی مغفور ان کو تلاش کر کے دیتے ہیں، حالانکہ اس واقعہ کی کوئی اصلیت نہیں مگر سرسید مرحوم کے دہلی کے اکثر اعزہ واحباب اسی غلط فہمی میں مبتلا تھے اور مولانا شبلی مرحوم سے ناحق بدگمانی رکھتے

تھے۔" (خضر راہ شبلی نمبر ص ۱۰)

ان کا ایک اور تاثر قابل ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"انہوں نے امام اعظم کے حالات زندگی سے تعلیم یافتہ طبقہ کو روشناس کرنے کے لئے سیرۃ النعمان لکھی ہے۔ مولانا حالی مغفور نے اپنی مسدس کے ذریعہ سے جو تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے مسلمانوں کے شاندار کارنامے ان کو یاد دلائے ہیں اور میں آج بھی جب مسدس کو پڑھتا ہوں تو آنکھیں بے اختیار نم ہو جاتی ہیں۔ مرحوم مولانا حالی نے گذشتہ دور عظمت کی طرف صرف معنی خیز اشارات کئے ہیں اور علامہ شبلی نعمانی نے اس دور کی علمی ترقیوں کا پورا نقشہ کھینچ کر دکھا دیا ہے اور تاریخ اسلام کی وہ عظیم الشان خدمت انجام دی ہے، جس کے شکریہ احسان سے ایک طرف مسلمان اور دوسری طرف زبان اردو بھی سبکدوش نہیں ہوسکتی۔" (ایضاً ص ۱۲)

۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مضمون تحریک اصلاح وتغیر کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ مقالہ انہوں نے کئی قسطوں میں الہلال کلکتہ میں لکھا تھا، اس میں انہوں نے تغیر و اصلاح کی اجمالی تاریخ قلم بند کردی ہے اور علامہ شبلی کی اس سے واقفیت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہ مقالہ اصلاً علامہ شبلی کے مخالفین کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ انہوں نے ندوہ کے لئے مولانا شبلی کی بیشتر کوششوں اور کاوشوں کا ذکر بھی کیا ہے اور ایسی عمدگی سے کیا ہے کہ ندوہ کے سلسلے کے تمام اہم کارنامے سامنے آجاتے ہیں۔ مثلاً ان کے معتمد تعلیم ہونے سے پہلے ندوہ کی تعلیمی اور تعمیری حالت کیا تھی اور جب وہ ندوہ کے معتمد تعلیم مقرر ہوئے تو انہوں نے ندوہ میں کیا انقلاب پیدا کیا اور کون کون سے امور ان کے ذہن و دماغ کی اختراع ہیں اور انہوں نے ندوہ کو کس قدر ترقی دی۔

مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ مولانا شبلی جس وقت ندوہ کے معتمد تعلیم مقرر ہوئے اس کی مالی حالت یہ تھی کہ تحویل میں ایک پیسہ نہیں تھا۔ منشی محمد علی محرر دفتر نے بتایا تھا کہ تحویل بالکل

خالی ہے۔(خضر راہ شبلی نمبر ص ۴۳)

چنانچہ علامہ شبلی نے حکومت سے پانچ سو روپے ماہوار کی امداد حاصل کی۔ندوہ کرایہ کے مکان میں قائم تھا، انہوں نے حکومت سے ایک بڑا قطعہ اراضی حاصل کیا اور اس میں ندوہ کی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ ریاستوں سے بڑے بڑے چندے اور رقمیں حاصل کیں، ریاست بہاول پور نے یک مشت پچاس ہزار روپے علامہ شبلی کی کوششوں سے ندوہ کو دیا، جس سے تعمیرات کا سلسلہ قائم ہوا۔ تعلیمی حالت بہتر کی اور معیار تعلیم بلند کیا۔ رکاوٹوں کے باوجود جدید نصاب تعلیم تیار کر کے اسے نافذ کیا۔ اچھے اساتذہ ملک سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ندوہ کے تعلیمی معیار کو بلند کیا۔ عصری علوم، انگریزی، ہندی اور سنسکرت کی تعلیم کا نظم کیا۔ تصنیف و تالیف کا مذاق پیدا کیا۔ خدام اسلام کی جماعت قائم کی۔ حفاظت و اشاعت اسلام کا شعبہ قائم کیا۔ اپنا قیمتی کتب خانہ ندوہ پر وقف کیا اور اپنے احباب سے کتابیں اور کتب خانے وقف کرائے، یہ تمام باتیں مولانا آزاد نے تفصیل سے قلم بند کی ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ:

> ''صداقت کا اعتراف اس کا قدرتی حق ہے اور دماغ و عقل مجبور ہے کہ سفید کی سفیدی کا اقرار کرلے۔ پس یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سب کچھ مولانا شبلی نے کیا اور ان کے وجود سے ندوہ کی گذشتہ ہستی کو الگ کر کے دیکھئے تو صرف گولہ گنج لکھنؤ کا ایک ویرانہ باقی رہ جاتا ہے، جس کے اندر تباہی و بربادی کی خاک اڑ رہی ہو۔'' (خضر راہ شبلی نمبر ص ۵۶)

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی [پ: ۱۰ر اگست ۱۹۵۵ء] نے لکھا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے مولانا شبلی سے متعلق مستقل طور پر کوئی تحریر یادگار نہیں چھوڑی ہے۔(شبلی معاصرین کی نظر میں ص ۸) شاید خضر راہ کا یہ نمبر اور الہلال کے شمارے ان کی نظر سے نہیں گذرے جن میں مولانا آزاد کی مستقل تحریریں شائع ہوئی ہیں۔

۵۔ ملا رموزی [۱۸۹۹-۱۹۵۲ء] سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ ماہنامہ خضر راہ کے شبلی نمبر میں ایڈیٹر کے نام ان کا ایک خط مضمون کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ انہوں نے

اپنے مخصوص انداز میں بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ ادبی تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''خصوصاً علامہ شبلی علم وادب کے ایسے گرامی منزلت مشہور ہیں کہ ان کا پیدا کیا ہوا ادب، اسلوب نگارش، طریق وتحقیق اور وہ لکھنؤ میں بندروں کے پل سے ذرا آگے چل کر ان کا بنایا ہوا ندوۃ العلماء اور وہاں سے ای آئی آر پر سوار ہو کر وہ علی گڑھ کا کالج تو ایسی چیزیں ہیں جو ابھی ایک صدی تک نہ مریں گی، نہ اپنے اثرات کو کمزور ہونے دیں گی۔ بخلاف ممدوح محترم کے حضرت آزاد کا ادب اب کمزور سا ہو چلا ہے اور دماغوں سے آزاد مغفور کا تحریری اثر زائل سا ہوتا جاتا ہے، جیسے حضرت علامہ شرر مغفور کے ناول اب کم فروخت ہونے لگے ہیں اور خواجہ حسن نظامی کا روزنامچہ کافی دلچسپی سے پڑھا جارہا ہے مگر ایک اپنے علامہ شبلی مغفور کہ آپ کی تحریری زندگی اس وقت کے کام کرنے والی جماعت پر یوں سوار ہے کہ ایک صدی تک بھی اترنے کا نام نہ لے گی۔ .... بس اور تو کچھ نہیں اس ندوے کی وجہ سے دیوبند، بریلی، سہارن پور اور مراد آباد کی قدیم درسگاہوں میں طلبہ جمائیاں لینا بھول گئے یعنی مذہبی درس گاہوں کا وہ پرانا کسل، جمود، بے عملی، تاریک خیالی اور بے حسی کو اگر فنا کیا ہے تو علامہ شبلی کے ندوہ نے اور اس مکان سے جس مرتبہ کے لوگ فارغ ہو کر نکلے ہیں انہوں نے اسلامی ہند کے فکری، عملی، علمی، معاشرتی، اخلاقی، اثری و ادبی اور مذہبی حالات کو کچھ اس درجہ خوبی سے متاثر اور منقلب کیا ہے کہ تعریف نہیں کی جاسکتی۔'' (خضر راہ شبلی نمبر ص ۹۲-۹۳)

۶۔ علامہ شبلی کے شاگرد عزیز اور مشہور ادیب و نقاد مولانا عبدالسلام ندوی نے ان کی سوانح عمری ''حیات شبلی''، لکھی ہے جس کا غیر مطبوعہ مسودہ دارالمصنفین کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کا ایک باب بعنوان ''حیات شبلی'' اس نمبر میں شامل ہے جس میں ۱۹۰۸ء اور اس کے

بعد کے شبلی کے حالات اور بعض کارناموں کی تفصیل ہے۔ واضح رہے کہ ۱۹۰۸ء میں شدھی تحریک کے زیر اثر ارتداد کا فتنہ اٹھا، جس میں متعدد نو مسلم گھرانے دوبارہ ہندو ہو گئے۔ چنانچہ اس کے انسداد و تدارک کے لئے علامہ شبلی نے بڑی کوششیں کیں، اس کی تفصیل اس مضمون میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بعض تصنیفات جیسے سیرۃ النعمان اور شعرالعجم وغیرہ کی خصوصیات کا بھی ذکر ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کی علمی زندگی پر بھی ایک نگاہ ڈالی گئی ہے۔

۷۔ مہدی حسن افادی علامہ شبلی کے خاص احباب میں تھے، بلکہ ان کے بڑے پرستار تھے اور ان کی ہر ادا پر جان دیتے تھے۔ ان کا مضمون ''آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ'' ماہنامہ البشیر اٹاوہ میں ۱۹۰۶ء میں شائع ہو چکا تھا۔ وہ خضر راہ کے اس نمبر میں بھی شامل ہے اور اس لائق ہے کہ بار بار پڑھا جائے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''پروفیسر شبلی نے جیسا کہ پہلے کسی موقع پر دکھایا گیا ہے ہم کو غیروں سے قریب قریب بے نیاز کر دیا ہے۔ یہ جس طرح قدیم تاریخ ولٹریچر کے جامع ہیں آج کل کے فلسفیانہ انتقادات اور نکتہ سنجیوں سے آشنا ہی نہیں بلکہ یہ مذاق ان میں اس قدر رچا ہوا ہے کہ ان کے طے کردہ مسائل جو دنیا کے سامنے پیش کئے گئے ہیں اس حد تک کامل ہیں کہ میرا خیال ہے کہ زمانہ آئندہ بلکہ بعد آئندہ میں بھی غالباً ان پر کوئی معتد بہ اضافہ نہ کر سکے گا، اسی طرح ان کے اجتہادات کا (جن کو تاریخی الہامات کہنا زیادہ موزوں ہوگا) کوئی حصہ صدیوں بعد بھی متروک ہونے کے لائق نہیں ہوگا، اس سے زیادہ شبلی کے غیر فانی ہونے کا کیا ثبوت ہوگا۔''
>
> (خضر راہ شبلی نمبر ص ۳٦)

۸۔ مولانا شبلی اور ندوہ کا متخیلہ مولانا محب اللہ لاری [۱۹۰۵-۱۹۹۳ء] کا مضمون ہے، جس میں انہوں نے پہلے مسلمانوں کے انحطاط و زوال اور اقوام عالم کی ان سازشوں کا بھی ذکر کیا ہے جس میں مسلمان گھرے ہوئے تھے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ

''مولانا شبلی نے جب مسلمانوں کی موجودہ جہالت وغفلت، مصالح ملکی سے لاعلمی و بے پروائی، تجارت، صنعت وحرفت اورزراعت سے بے توجہی، علوم جدیدہ سے تنفر، احکام مذہبی سے استکراہ کا مطالعہ کیا تو انہیں صاف نظر آیا کہ یہ تمام امور اصل مرض میں داخل نہیں ہیں، جومہلک مرض جونک کی طرح ان کا خون چوس رہا ہے وہ اور ہی کچھ ہے، یہ تو محض اس کے لوازم ونتائج ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ غفلت کیوں پیدا ہوئی۔ قوائے عملی کیوں معطل ہوئے اورذہن ودماغ کیوں بیکار ہوگئے کہ ان چیزوں کا احساس نہ ہوسکے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں معاصرین سے شبلی کی جدائی ہوتی ہے۔ یہی وہ بلند اور ارفع مقام ہے جہاں شبلی کے علاوہ ہندوستان کا کوئی اور مصلح نہیں پہونچ سکا۔'' (خضرراہ شبلی نمبر ص ۱۵۹)

پھر انہوں نے ندوہ کے متخیلہ کی تفصیل سے وضاحت وتشریح اوراس سلسلہ میں علامہ شبلی کی کوششوں اور کاوشوں کا مفصل جائزہ پیش کیا ہے۔ ندوہ کے حالات اوراس کی کسمپرسی کا ذکر کیا ہے اور جذباتی انداز میں لکھا ہے کہ:

''مولانا شبلی اس وقت حیدرآباد میں تھے، مسلمانوں کی واحد قومی، مذہبی درسگاہ برباد ہوجائے، زندگی بھر کی محنت ومشقت کا شجر ثمر بار ہونے سے پہلے خشک ہوجائے، گلستاں میں بہار آنے سے پہلے خزاں آجائے، کلی کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جائے، مولانا شبلی جیسا شخص اس حادثہ فاجعہ پر خون کے آنسو روئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ندوہ کی اس حالت پر مولانا کو حیدرآباد کی راحت مصیبت معلوم ہوئی، سارا عیش وآرام چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے، یہاں آکر ندوہ کی تباہی وبربادی پر ایسی خوں باری کی، ایسی سینہ کوبی کی، ایسا دردانگیز ماتم کیا کہ ایک دفعہ پھر ساری قوم ندوہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔'' (حوالہ سابق ص ۱۶۴)

اس مضمون میں مولانا محب اللہ لاری نے ندوہ کے سلسلے میں علامہ شبلی کے ان تمام اہم کاموں کا ذکر کیا ہے جس کا ذکر مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مضمون میں کیا تھا جس کا ذکر ہم گذشتہ صفحات میں کر چکے ہیں۔

۹۔ خضر راہ کے مدیر مولانا حامد علی ندوی نے شبلی نمبر کے لئے شوکت تھانوی سے مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی اور وہ بھی ان کے مخصوص مذاحیہ انداز میں، چنانچہ انہوں نے جو مضمون لکھا ہے اس کا عنوان ہے "بڑے اچھے آدمی تھے۔"

علامہ شبلی کے اس نقطہ نظر سے کہ مسلمانوں کی تعلیم میں جدید وقدیم دونوں دھاروں کا سنگم ہونا چاہئے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ شوکت تھانوی نے شبلی کے اسی نقطہ نظر پر مضمون لکھا ہے۔ اور قدیم تعلیم اور قدیم مدارس کو "بدوی" تعلیم سے تعبیر کیا ہے۔ علی گڑھ کالج کی تعلیم کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اگر وہاں کے بچے السلام علیکم نہ کہیں تو معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ مسلمان ہیں۔ انگریزی کو انہوں نے مادری زبان کا درجہ دے دیا ہے۔ پھر انہوں نے ندوہ کے اعتدال وتوازن کی داد دی ہے۔ علامہ شبلی کی خدمات کے بارے میں اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں لکھا ہے کہ:

> "علامہ شبلی نے بہت سی قابل قدر خدمات انجام دی ہوں گی ورنہ ظاہر ہے کہ نہ شمس العلماء ہوتے نہ علامہ کہلاتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خضر راہ کا شبلی نمبر نہ نکلتا لیکن ہم تو ان کو اس حیثیت سے "بڑا اچھا آدمی" کہتے ہیں کہ انہوں نے بہت سے مسلمانوں کو مولانا بننے سے بچا کر انسان بنا دیا، ورنہ یہ جو آج کل ندوی علماء دکھائی دیتے ہیں سب ایک سرے سے نہایت سخت گیر قسم کے سر گھٹے ہوئے مولانا ہوتے۔" (خضر راہ، شبلی نمبر ص ۱۱۶)

۱۰۔ علامہ شبلی کی قومی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ندوہ کے ایک فاضل مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی [۱۹۰۷-۱۹۷۹ء] نے تفصیل سے ان کی قومی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ علی گڑھ کالج کی ترقی میں علامہ شبلی کی خدمات، اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول کا قیام، ندوہ کو

ترقی سے ہم کنار کرنا، اشاعت اسلام کے سلسلے کی کاوشیں، اوقاف اسلامی اور وقف علی الاولاد کی جدوجہد، انگریزی ترجمہ قرآن کی کوشش، صیغہ اغلاط تاریخی کا قیام، تعطیل جمعہ کی تحریک، ورنا کیولر اسکیم کمیٹی میں شمولیت اور اردو کے لئے جدوجہد اور آخر میں دارالمصنفین کا قیام وغیرہ کی تمام تفصیلات مولانا ندوی نے قلم بند کر کے ثابت کیا ہے کہ علامہ شبلی کی قومی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور انہوں نے قوم کو بے حد فائدہ پہونچایا۔

۱۱۔ علامہ شبلی اردو کے بلند پایہ شاعر تھے، انہوں نے نظمیں، غزلیں، قصیدے، مسدس، قطعات وغیرہ متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی۔ اس میدان میں ان کا بڑا کارنامہ ان کی قومی شاعری ہے، جس میں انہوں نے بڑی طرفگی پیدا کی۔ رئیس احمد جعفری نے ان کی اردو شاعری کا ایک عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ اور اس سلسلہ کی ان کی کاوشوں کا بھرپور تجزیہ کر کے ان کے شعری اطراف کی نشاندہی کی ہے۔

۱۲۔ ہمہ گیر شبلی مولوی ابوالبقا صاحب کے مضمون کا عنوان ہے۔ اس طویل مقالہ میں انہوں نے علامہ شبلی کی عظمت و جامعیت کے ایک ایک پہلو کی وضاحت کی ہے اور ایسا عمدہ مقالہ لکھا ہے کہ علامہ شبلی کی جامعیت اور کمالات کا عمدہ مرقع سامنے آجاتا ہے اور ان کی ہمہ گیری اور ہمہ دانی کے تمام جلوے نگاہوں میں آجاتے ہیں۔

۱۳۔ جناب مشیر حسین علوی [۱۸۷۸-۱۹۳۷ء] رئیس گدیہ علامہ شبلی کے احباب اور قدردانوں میں تھے۔ ان کے مضمون کا عنوان ''چند منٹ شبلی کے ساتھ'' ہے۔ اس میں انہوں نے علامہ شبلی کے کمالات کو بیان کیا ہے، ساتھ ہی اپنی یادوں کو بھی سمیٹا ہے۔ مضمون کا آغاز انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''خاتم المورخین شبلی دنیائے ادب میں کسی رسمی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ہندوستان ہی میں نہیں بلاد اسلامیہ، بلاد نصاریٰ اور دیگر متمدن اور جنوب ممالک میں بھی شبلی کا نام زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ خدا کا شکر یہ ہے کہ لکھنؤ کی نوجوان جماعت نے آئندہ آنے والی نسلوں کی ہدایت کے

لئے اپنے رسالہ کے شبلی نمبر نکالنے کا ارادہ کیا ہے۔خدا کرے ان نوجوان ادبا کی یہ سعی مشکور ہو اور آئندہ نسلوں کے لئے ان کی یہ ادبی کوششیں خضر راہ ثابت ہوں۔شبلی ایک ایسی ہمہ گیر اور جامع ہستی کا نام تھا کہ اس کے متعلق کچھ بھی لکھنا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ ایک حد تک ناممکن ہے۔ شبلی علی گڑھ کا پروفیسر تھا، دارالعلوم ندوہ کا بانی تھا، شمس العلماء تھا، شاعر تھا، مولوی تھا، رند تھا، مصنف تھا، مؤلف تھا اور سب سے بڑی بات انسان تھا۔'' (خضر راہ شبلی نمبر ص ۱۷۳)

اس کے بعد انہوں نے عظمت شبلی کے کئی اور پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، مگر عطیہ فیضی نے اپنے مضمون میں علامہ شبلی سے ان کے گھر پر ملاقات کی جو تفصیل لکھی ہے اس کا اس مضمون میں سرے سے کوئی ذکر نہیں۔

۱۴۔علامہ شبلی نعمانی نے دنیا جہاں کے کتب خانے دیکھے تھے۔روم و مصر و شام کے کتب خانوں سے استفادہ کے لئے ان ممالک کا سفر کیا۔ ہندوستان کے تقریباً تمام کتب خانے چھان ڈالے تھے۔خدا بخش لائبریری پٹنہ اور رام پور کی رضا لائبریری کے نظم و ترتیب میں بھی حصہ لیا تھا۔عہد شباب میں حج بیت اللہ کے موقع پر مدینہ منورہ کے کتب خانے بھی دیکھے تھے۔ندوہ کے بام و در سنوارنے کے بعد علمی فضا قائم کرنے کی غرض سے انہوں نے وہاں ایک کتب خانہ قائم کیا اور اپنی تمام کتابیں اس پر وقف کر دیں اور اپنے احباب سے ان کے کتب خانے وقف کرائے۔حکیم سید عبدالعلی صاحب نائب ناظم ندوہ نے اسی کتب خانہ پر مضمون لکھا ہے۔

۱۵۔خضر راہ کے شبلی نمبر کا آخری مضمون اس کے مدیر مولانا حامد ندوی کا ہے۔اس کا عنوان ''شبلی مکاتیب شبلی میں'' ہے۔اس میں انہوں نے شبلی کی خدمات اور ندوہ کا ذکر ان کے مکاتیب کی روشنی میں کیا ہے اور اچھا تجزیہ کیا ہے مگر یہ مضمون نامکمل ہے اور نامکمل ہی شامل کیا گیا ہے اور اس کا سبب قلت گنجائش بتایا گیا ہے۔بحیثیت مجموعی ماہنامہ خضر راہ کا یہ ''شبلی نمبر''

شبلی کی سوانح، شخصیت، عظمت، اور علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی اور قومی خدمات کے ذکر پر مشتمل ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ کسی رسالہ کا پہلا شبلی نمبر تھا، بہت وقیع اور بھرپور ہے۔ اس رسالہ سے پہلے علامہ شبلی کی شخصیت پر صرف ایک کتاب ''تذکرہ شبلی'' از محمد مہدی اسلامیہ کالج اٹاوہ سے پاشا سیریز کے تحت ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ شبلی کی وفات کے بعد سب سے اہم کام جو منظر عام پر آیا وہ یہی خضر راہ کا شبلی نمبر تھا۔ حیات شبلی اس کی اشاعت کے تیرہ سال بعد شائع ہوئی۔ بہرحال شبلی شناسی کے میدان میں اولیت کا فخر اسی خضر راہ کو حاصل ہے۔

---

(۲)

خاور، ڈھاکا

[شبلی نمبر]

[مدیر: عندلیب شادانی، اپریل ۱۹۵۳ء]

ماہنامہ خضر راہ لکھنؤ کے شبلی نمبر کے بیس سال بعد مارچ ۱۹۵۳ء میں ماہنامہ خاور ڈھاکا نے ''شبلی نمبر'' نکالا۔ ماہنامہ خاور، ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا ترجمان تھا۔ اسے اردو کے مشہور ادیب، نقاد اور شاعر ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی [پ: ۱۹۰۴ء-۱۹۶۹ء] نے ۱۹۵۲ء میں جاری کیا تھا۔ اس کے شمارے مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ البتہ اس کا ''شبلی نمبر'' کہیں دستیاب نہیں۔ خاور ڈھاکا کے ''شبلی نمبر'' کا ذکر مشہور اشاریہ ساز ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری [۱۹۴۲ - ۲۰۰۶ء] سابق ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے جہان شبلی مشمولہ مجلّہ فکر و نظر علی گڑھ [جون ۱۹۹۶ء ص ۳۸۸] میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا کہیں اور ذکر نہیں ملتا۔ اس کی تلاش و جستجو کی ساری کوششیں بھی رائگاں ہو گئیں۔

منظور شدہ محکمہ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

خازن : عابد علی خاں

کاتب : محمد مظہر

زر سالانہ

ہند و پاک سے آٹھ روپے

ششماہی پانچ روپے

قیمت : ایک روپیہ

جلد (۴) شمارہ (۲،۱)

۱۹۵۸ء

شبلی نمبر

فون : ۵۴۰۲

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر سلیمان اریب ● ۱۷ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ ● مطبوعہ نیشنل فائن آرٹ پرنٹنگ پریس

صبا شبلی نمبر کا سرورق

(۳)

صبا، حیدر آباد

[شبلی نمبر]

[مدیر: سلیمان اریب، حیدر آباد ۱۹۵۷ء]

یہ ماہانہ رسالہ حیدر آباد سے نکلتا تھا۔ اس کے مدیر ادیب و شاعر سلیمان اریب [۱۹۲۲-۱۹۷۲ء] نے ۱۹۵۵ء میں اسے جاری کیا تھا۔ علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر ۱۹۵۷ء میں انہوں نے یہ خصوصی شمارہ شائع کیا۔ اس میں کل آٹھ مضامین شامل ہیں۔ پہلے دو مضامین شبلی کی سوانح سے متعلق ہیں جو محترمہ زینت ساجدہ [پ: ۲۸ رمئی ۱۹۲۴ء] اور تمکین کاظمی [۱۹۰۲-۱۹۶۱ء] کے قلم سے ہیں۔ زینت ساجدہ کا مضمون جس میں شبلی کی ولادت تعلیم و تربیت، خاندانی احوال، ملازمت، تصنیفات، غرض وفات تک کے حالات اختصار سے لکھے گئے ہیں، وہ مولانا سید سلیمان ندوی کی ''حیات شبلی'' اور شیخ محمد اکرام [۱۹۰۸-۱۹۷۳ء] کی کتاب ''شبلی نامہ'' سے ماخوذ ہیں۔ تمکین کاظمی نے اگرچہ حالات ہی بیان کئے ہیں لیکن اس میں کسی قدر انفرادیت ہے۔ انہوں نے شبلی کو دیکھا تھا۔ ایک بار نہیں کم از کم دو بار۔ شبلی نے ان سے اپنی ایک نظم بھی پڑھوا کر سنی تھی۔ دراصل ان کے والد سے شبلی کے گہرے مراسم تھے۔ اس لئے انہوں نے حیدر آباد کے تعلق سے بعض نئی باتیں بھی سپرد قلم کی ہیں۔ انہون نے فارسی کی ایک نظم ایسی نقل کی ہے جو کلیات شبلی میں بھی شامل نہیں ہے۔ اسی طرح چند اور باتیں بھی اس میں اہم ہیں۔

ادارہ ادبیات اردو کے بانی ڈاکٹر محی الدین قادری زور [۱۹۰۴-۱۹۶۲ء] نے

ادارہ ادبیات میں محفوظ شبلی کی چند تحریروں کا تعارف کرایا ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان ہے ''شبلی کے بارے میں چند غیر مطبوعہ اطلاعات''۔ مقالہ کے آغاز میں شبلی کی عظمت اور حیدر آباد سے ان کے تعلق کی وضاحت ہے، پھر پہلی اطلاع کے طور پر علامہ شبلی سے متعلق وحید الدین سلیم [۱۸۶۸-۱۹۲۸ء] کی زبانی بعض واقعات لکھے ہیں۔ یہ وہی وحید الدین سلیم پانی پتی ہیں جنہوں نے علی گڑھ سے ماہنامہ معارف جاری کیا۔ اس کے بند ہو جانے کے بعد علامہ شبلی نے انہیں علی گڑھ سے بلا کر مسلم گزٹ لکھنؤ کا مدیر مقرر کرایا، لیکن جب ندوہ میں شبلی کے مخالفین نے ایک جتھہ بنالیا تو اس گروہ کی تائید میں ان کا قلم بھی نیام سے باہر آیا۔ زور صاحب نے ان کے بتائے ہوئے ایک دو واقعات لکھے ہیں جن کی صحت ہی مشکوک ہے اس لئے کہ وحید الدین سلیم پانی پتی کا رویہ دور طالب علمی سے لے کر اخیر تک شبلی کے سلسلے میں معاندانہ رہا۔ اس کا اعتراف ڈاکٹر زور نے بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''مولانا شبلی کی ان کے دل میں بڑی قدر تھی اور وہ ان کو اردو کا اعلیٰ درجے کا انشا پرداز سمجھتے تھے مگر چوں کہ خود مولانا حالی کے ہم وطن تھے اور مولوی عبدالحق کی طرح حالی پارٹی کے روح رواں سمجھے جاتے تھے، اس لئے کبھی زبان سے یا تحریر میں شبلی کی عظمت کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس پارٹی نے مولانا شبلی کی تنقیص و تخفیف میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ وہ ہر معاملہ میں حالی کو شبلی سے بڑا ثابت کرنا چاہتے تھے اور ان لوگوں کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ شبلی کی کوئی کتاب نصاب میں داخل ہو یا حالی کے مقابلہ میں ان کی شہرت میں اضافہ ہو۔ ان لوگوں نے یوم حالی منائے، رسالوں کے حالی نمبر نکالے مگر شبلی کا ذکر تک نہ چھپنے دیا اور ہمیشہ شبلی اسکول کی کتابوں اور مضامین میں عیب نکالتے تھے۔'' (صبا شبلی نمبر ص ۳۴-۳۵)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے دوسری اطلاع یہ دی ہے کہ حافظ ابوالبرکات سید شاہ غلام محمد زعم قندھاری کی ضخیم سوانح عمری میں علامہ شبلی کا جابجا ذکر ہے۔ اس میں سب سے اہم

بات یہ ہے کہ انہوں نے علامہ شبلی کو نیچری مولوی قرار دیا ہے اور ایک واقعہ یہ لکھا ہے کہ جمعہ کے دن مولانا بیٹھے گفتگو کرتے رہے اور جمعہ کی نماز ادا نہیں کی۔ ظاہر ہے اس واقعہ کو صحیح تسلیم کرنا مشکل ہے۔

تیسری اطلاع کے طور پر انہوں نے علامہ شبلی کے ۲۵ رغیر مطبوعہ خطوط کا ذکر کیا ہے، یہ خطوط مولوی مفتی شیر علی کے نام ہیں۔اور ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہیں۔ یہ خطوط اولاً نقوش لاہور کے مکاتیب نمبر میں شائع ہوئے۔ راقم کی مرتبہ ''مکتوبات شبلی'' میں بھی یہ خطوط بھی شامل ہیں۔ان کے علاوہ ڈاکٹر زور نے شبلی کی دو تقریظات کا بھی ذکر کیا ہے۔

پہلی تقریظ تاریخ کوگی مؤلفہ مولوی سید عبداللہ حسینی پر ۱۹۰۶ء کی لکھی ہوئی ہے۔ جب کہ دوسری تقریظ مشیر نسواں مؤلفہ صغرا بیگم ہمایوں مرزا پر لکھی گئی ہے۔ یہ تقریظ مارچ ۱۹۱۳ء کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ دونوں تقریظات اب تک کہیں طبع نہیں ہوئی ہیں اور ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں محفوظ ہیں۔

اس کے بعد نصیر الدین ہاشمی [۱۸۹۵-۱۹۶۴ء] کا مضمون ''علامہ شبلی اور حیدرآباد'' شامل ہے۔اس میں انہوں نے علامہ شبلی نعمانی کی حیدرآباد آمدورفت، مجالس کا انعقاد، خطبات، حیدرآباد سے متعلق ان کے منظوم تاثرات، قیام حیدرآباد کی مصروفیات کی تفصیلات قلم بند کی ہیں۔انہوں نے مولانا شبلی سے اپنی عقیدت کا بھی ایک واقعہ لکھا ہے۔

علامہ شبلی نے حیدرآباد میں سلسلہ کلامیہ کی کئی کتابیں الکلام، علم الکلام، الغزالی، سوانح مولانا روم وغیرہ لکھیں۔ ایک دو کتابوں کا ذکر ہاشمی صاحب نے بھی کیا ہے۔ شبلی کے حیدرآباد سے تعلق کی بیشتر تفصیلات اس میں آگئی ہیں، تاہم مضمون تشنہ معلوم ہوتا ہے۔ ناظم سررشتہ علوم وفنون کی حیثیت سے انہوں نے جو خدمات انجام دیں اس کا سرے سے ذکر نہیں۔ البتہ اس میں حیدرآبادی اہل علم سے شبلی کی خط وکتابت کا ذکر آیا ہے۔ مکاتیب شبلی سے چند اقتباسات بھی نقل کیے گئے ہیں۔

علامہ شبلی نے انگریزی ترجمہ قرآن کی جو کوشش کی تھی اور جو معتبر ترجمہ قرآن کی پہلی

کوشش تھی، اس کا تعلق بھی حیدر آباد کے ایک ذی علم نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی [۱۸۴۲
-۱۹۲۶ء] سے تھا۔ اس مضمون میں اس کا بھی ذکر نہیں ہے۔

اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں علامہ شبلی کا بڑا نمایاں حصہ ہے۔ عالم خوندمیری [م:
۲۷/ اکتوبر ۱۹۸۳ء] نے اپنے مقالے میں اس کی نشاندہی کی ہے۔ مقالے کا آغاز اسلام کی
فکری تاریخ کے اجمالی ذکر سے ہوا ہے، پھر سرسید اور مولوی چراغ علی [۱۸۴۴-۱۸۹۵ء] کی
کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلی کے افکار کا مطالعہ کیا گیا ہے اور ان کی انفرادیت اور عظمت
دکھلائی گئی ہے۔

سرسید اور شبلی دونوں نے علم کلام کو موضوع بنایا ہے۔ سرسید کا کام نقش اول کی حیثیت
رکھتا ہے۔ البتہ علامہ شبلی نے یہ کام منصوبہ بند طریقے سے کیا مگر انہیں بھی خاطر خواہ کامیابیاں
نہیں ملی۔ عالم خوندمیری کا خیال ہے کہ دونوں کے نقطہ نظر میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ انہوں
نے اپنے موقف کی تائید میں ڈاکٹر سید عبداللہ [۱۹۰۶-۱۹۸۶ء] کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

> ''شبلی کی بات سرسید کی بات سے بہت زیادہ مختلف بھی نہیں، مضمون کا
> فرق کم ہے لب و لہجے کا فرق زیادہ ہے۔ شبلی کی نظر اور طرز بیان عالمانہ اور
> ادیبانہ ہے۔ وہی بات جو سرسید کی زبان سے ادا ہو کر مخاطبوں کو متوحش کر
> دیتی ہے جب شبلی کے منہ سے نکلتی ہے تو نہایت مانوس معلوم ہوتی ہے''۔

لیکن عالم خوندمیری نے یہ بھی لکھا ہے کہ سرسید کے ہاں روایات قدیم سے کھلی
بغاوت کے وافر ثبوت ملتے ہیں اور شبلی نے اس طرح کی بغاوت نہیں کی۔ (صبا شبلی نمبر ص ۵۰)
اس کے باوجود وہ تلامذہ شبلی پر چراغ پا ہیں کہ:

> ''سرسید اور شبلی کے باہمی اختلافات کو بعد کی نسل میں بدقسمتی سے شبلی کے
> بعض بظاہر بڑے وفادار لیکن دراصل ناخلف شاگردوں نے بڑے مبالغہ
> آمیز انداز میں پیش کیا۔'' (صبا شبلی نمبر ص ۵۰)

حالانکہ مذکورہ دونوں دو باتیں ہیں۔ ان کا یکجا ذکر مناسب نہیں تھا۔ سرسید اور شبلی

کے باہمی اختلافات اور ہیں اور کلامی مباحث میں فرق و اختلافات دوسری نوعیت رکھتا ہے۔ اس کمی کے باوجود عالم خوندمیری نے بڑی محنت و تحقیق سے سیرۃ النعمان، علم الکلام، الکلام اور سوانح مولانا روم سے شبلی کے فکری زاویوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان کی انفرادیت اور کاوشوں کی داد دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

''شبلی اپنی آنکھوں سے مذہب کی بنیادوں کو ہلتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ سرسید اسلام کی خوب صورت عمارت کو گرد وغبار سے صاف کرنا چاہتے تھے اور شبلی کی دوررس عقل اس خوب صورت عمارت کی بنیادوں کے بارے میں پریشان تھی۔ شبلی ان بنیادوں کو محفوظ کرنے میں سرگرداں تھے، اس فکر میں شاید بار باران کی زبان پر یہ مصرعہ آتا ہو کہ:

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

لیکن انہوں نے اپنی تمام عقل خداداد کو اگر ناممکن نہیں تو کم از کم انتہائی مشکل کام کے لئے وقف کر دیا۔ آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ ہماری ذہنی ہمدردیوں کا کون زیادہ مستحق ہے۔؟'' (صبا شبلی نمبر ص ۵۶)

اس کے بعد انہوں نے کلامی نقطہ نظر سے شبلی کے وارثین کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے علامہ شبلی کا اصل وارث مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] کو قرار دیا ہے۔ ان کی نظر میں دوسرے وارث علامہ اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شبلی نے مرض کی صحیح تشخیص کی تھی مگر نسخہ تجویز نہ کر سکے۔ یہ نسخے ابوالکلام و اقبال نے تجویز کئے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں یہ گذارش کی ہے کہ شبلی کو سید سلیمان ندوی مرحوم یا ندوہ کے بلند ہمت علماء کی نظر سے نہ دیکھئے۔

عالم خوندمیری کے بعض خیالات سے اختلاف کی گنجائش ہے مگر فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں انہوں نے شبلی کے جس حصے کی اپنے خاص انداز میں توضیح کی ہے وہ قابل تحسین ہے۔

۱۷ر نومبر ۱۹۵۷ء کو اردو ہال حیدر آباد میں یوم شبلی منعقد ہوا تھا۔ اس موقع پر پروفیسر

ابوظفر عبدالواحد [م: ۲۲رمئی ۱۹۸۴ء] نے ایک مقالہ ''مقامات شبلی'' کے عنوان سے پیش کیا تھا۔ یہ ایک طویل اور مفصل مقالہ تھا۔ اس کی تمہید اور خاتمہ کو صبا کے اس شبلی نمبر میں شامل کیا گیا ہے۔ تمہید میں شبلی کی سوانح، علمی وادبی خدمات اور اس کے وسیع دائرہ کا اختصار سے ذکر کیا گیا ہے۔ خاتمہ میں ان کے شاعرانہ کمالات کا ذکر ہے۔ خاص طور پر فارسی شاعری، وہ بھی غزلیہ شاعری دستہ گل اور بوئے گل کے حوالہ سے۔ پروفیسر ابوظفر عبدالواحد نے شبلی کی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور مختلف اسلوب و انداز سے اس کی تشریح وتوضیح کرکے ان کے شاعرانہ شعور کی بلندی دکھلائی ہے۔

پروفیسر ابوظفر عبدالواحد کی نثر میں بڑی اشاریت ہے۔ ان کا مطالعہ شبلی بھی بہت وسیع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض الفاظ قوسین میں لکھ کر اس طرح رمزیت وایمائیت پیدا کردیتے ہیں کہ لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

بات شبلی کی فارسی شاعری کی ہو اور ان کے ان خطوط کا ذکر نہ آئے جو انہوں نے عطیہ فیضی وزہرا بیگم کو لکھے تھے، ممکن ہی نہیں۔ اور ان کے خطوط کا ذکر ہو تو شبلی کے عطیہ سے تعلقات زیر بحث نہ آئیں یہ بھی ناممکنات میں سے ہو گیا ہے۔ دراصل بابائے اردو مولوی عبدالحق [۱۸۷۰-۱۹۶۱ء] ڈاکٹر وحید قریشی [۱۹۲۵-۲۰۰۹ء] اور شیخ محمد اکرام نے شبلی کی فارسی شاعری اور ان کے خطوط کے مطالعہ کو ایسے غلط رخ پر ڈال دیا کہ پچاس برس کے بعد بھی ہمارے نقاد اس حصار سے نہیں نکل سکے۔ پروفیسر ابوظفر عبدالواحد صاحب بھی اس حصار میں گھرے مگر انہوں نے آخر میں جو ''پوسٹ مارٹم'' کیا ہے۔ وہ اس سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور جو ان کے نقادانہ ذہن ومزاج کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''عجیب روداد ہے کہ شبلی کی محبت کا پوسٹ مارٹم خود اس نے کر دیا جس سے ایسی حرکت کا سان گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حسن کو جوانی میں خلش اظہار ہوا کرتی ہے اور یہ ایک فطری تقاضہ ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ جو راز عالم جوانی میں مستور رکھا گیا اسے زمانہ پیری میں الم نشرح کرنے

کی ضرورت کیوں دامن گیر ہوئی؟ پھر یہ کہ جو سربستہ راز برسوں آہنی
الماری میں نظر بند رکھا گیا اسے ایک مشتبہ ''نفیری'' کے حوالے کرنے کی
ضرورت کیوں داعی ہوئی؟ اور کسی ''پیران پیر'' کی خدمت میں عمل جراحی
کے لئے اسے کیوں بھیجا گیا؟ یہ چیز بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ کسی علامہ کی
سادہ لوحی نے ان ادب پاروں کو مکاتیب میں جگہ دینے سے انکار کیا ہوگا،
لیکن سلیقہ مندانہ اشاعت ہی اگر مقصود تھی تو کیا یہ ماجرائی خطوط خود عطیہ
فیضی اپنے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع نہیں کر سکتی تھیں؟ جیسا کہ خطوط
اقبال انہوں نے چھپوائے تھے، کسی ''نفیری'' اور ''پیران پیر'' کی
استعانت کیوں لاحق ہوئی؟ اس غیر دانش مندانہ اور یک قلم اضطراری
حرکت کا خمیازہ آخر انہیں بھگتنا ہی پڑا کہ چاروں طرف سے ادب فروش
شیوخ کی غرض مندانہ یورش شروع ہوگئی اور اپنا دامن بچانے کی سعی میں
سارا الزام اس مرحوم و مغفور کے سر تھوپنا پڑا جس سے عقیدت اور نیاز
مندی کی وہ دعویدار بھی بنتی رہیں، لیکن افسوس کہ اظہار صفائی کے بعد بھی
انہیں مقام پارسائی نصیب نہ ہوا اور شہادت صفائی پیش کرنے پر بھی
صفائے باطن کا کوئی معترف نہ ہوا، الٹے جرم محبت کی فہرست میں ناکردہ
گناہوں کا اضافہ ہوگیا۔'' (صبا شبلی نمبر ص ۶۵-۶۶)

صبا کے ''شبلی نمبر'' کے آخری دو مضامین رضیہ بیگم اور محی الدین احمد کے قلم سے
ہیں۔ ان دونوں مضامین میں علامہ شبلی کی شعر فہمی اور شعر گوئی کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے اور
مقالہ نگاروں نے دکھلایا ہے کہ شبلی کو فارسی شعر و ادب سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ شعر فہمی اور اس کی
تفہیم و تشریح کا انہیں زبردست ملکہ حاصل تھا۔ وہ فارسی کے بڑے بلند رتبہ شاعر تھے اور ان
کی شاعری کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ محی الدین احمد نے قدرے تفصیل سے مختلف
اصناف شعر میں علامہ شبلی کی کاوشوں پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی توجہ اردو شاعری پر مرکوز

ہے، جس میں انہیں وہ بلند اور ارفع شاعر قرار دیتے ہیں۔ آخر میں مدیر صبا سلیمان اریب نے علامہ شبلی نعمانی کے اردو فارسی کلام کا ایک انتخاب شائع کیا ہے جس میں ان کا عمدہ کلام یکجا ہو گیا ہے۔

صبا کے مدیر سلیمان اریب نے اس خصوصی شمارہ کو علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر وفن پر پہلا خاص نمبر قرار دیا ہے۔ (صبا شبلی نمبر ص ۷) مگر ان کے اس خیال میں سچائی نہیں۔ شاید اس سے پہلے شائع ہونے والے خصوصی شماروں کا انہیں علم نہیں تھا۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک عمدہ خصوصی شمارہ ہے۔

البصیر

شبلی نمبر

علم و دولت نظمِ کارِ ملت است
علم و دولت اعتبارِ ملت است



اسلامیہ کالج چنیوٹ

البصیر شبلی نمبر کا سرورق

(۴)

البصیر، چنیوٹ

[شبلی نمبر]

[مدیر: حافظ عبید اللہ خاں، اسلامیہ کالج چنیوٹ، ۱۹۵۸ء]

البصیر، اسلامیہ کالج چنیوٹ کا رسالہ تھا۔ یہ سہ ماہی رسالہ ۱۹۵۶ء میں کالج کے بانی پرنسپل شیخ عطاء اللہ ایم اے [م: ۲۷ر دسمبر ۱۹۶۸ء] نے جاری کیا تھا۔ وہ علامہ شبلی کے بڑے عقیدت مند تھے۔ ایک رات انہوں نے خواب دیکھا، جس کی تفصیل ان کے الفاظ میں یہ ہے:

''مارچ ۱۹۵۷ء کی ایک رات میں نے لاہور میں مولانا شبلی مرحوم کو خواب میں دیکھا کہ باقاعدہ جبہ وعمامہ پہنے عینک لگائے، چھڑی ہاتھ میں لئے ایک کرسی پر جلوہ افروز ہیں۔ اور ان کے فاضل شاگرد و جانشین سید سلیمان ندوی مرحوم کرسی کے پیچھے کھڑے ہیں۔ میں کچھ دیر اس روح پرور نظارے سے خواب میں ہی فیض اندوز ہوتا رہا۔ سید سلیمان ندوی صاحب سے تو علی گڑھ میں کئی مرتبہ شرف ملاقات حاصل کر چکا تھا لیکن مولانا شبلی مرحوم کی زیارت کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی اور اس سلسلہ میں اپنی کم نصیبی پہ میں اکثر پروفیسر براؤن کے الفاظ

وائے کہ از زیارت آں علامہ عصر محروم ماندیم

دہرایا کرتا ہوں۔ استاد و شاگرد کی ایسی یکجائی تصویر بھی میری نظر سے کبھی نہیں گذری۔ یہ کیفیت کچھ دیر قائم رہی تو خواب ہی میں میری زبان پر

ایک فارسی مصرعہ جاری ہوگیا۔ حالانکہ شعر سے ذوق کے باوجود شاعری کی نعمت سے یکسر محروم ہوں۔ چونکہ اس مصرعہ کا تعلق خود میری ذات ہے، اس کا اظہار ضروری نہیں سمجھتا۔ دونوں بزرگ بالکل خاموش رہے اور کچھ دیر کے بعد یہ سماں خواب وخیال ہوگیا۔'' (البصیر شبلی نمبر ص ۱)

پروفیسر شیخ عطاء اللہ اس خواب کی تعبیر پر غور کرتے رہے۔ اپنے بعض بزرگ احباب سے بھی اس کی تعبیریں چاہیں، پھر حیات شبلی کا مطالعہ کیا اور بالآخر اس نتیجے پر پہونچے کہ

''مولانا کے سے مرتبہ وشان اور عشق ملت سے مخمور وسرور بزرگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ایسی تقریب پر ان کی خدمت میں ہدیہ عقیدت نہ پیش کرنا قوم کی بے حسی اور محرومی کی دلیل ہوگی۔ میں نے طے کرلیا کہ اور کچھ نہیں تو اسلامیہ کالج چنیوٹ کے مجلّہ البصیر کا شبلی نمبر اس تقریب کی یادگار میں شائع کیا جائے اور اگر ممکن ہو تو اس سلسلہ میں ایک جلسہ اہل علم کا چنیوٹ اسلامیہ کالج کے زیر اہتمام منعقد ہونا چاہئے۔'' (ایضاً ص ۵)

مجلّہ البصیر چنیوٹ کا یہ ''شبلی نمبر'' شیخ عطاء اللہ کے مذکورہ بالا خواب کی تعبیر ہے۔ اس کے ایڈیٹر اسلامیہ کالج چنیوٹ کے ایک ذی علم استاد پروفیسر حافظ عبیداللہ خاں ایم، اے [۱۹۱۵-۱۹۸۷ء] تھے۔ انہوں نے حصول مضامین کے لئے بڑی جدوجہد کی۔ لکھنو، اعظم گڑھ علی گڑھ، حیدرآباد اور پاکستان کے متعدد اہل قلم سے خط وکتابت کی۔ اہل علم نے ان کا جو تعاون کیا، اس کی تفصیل انہوں نے ادارئے میں لکھی ہے۔ خاص طور پر اعظم گڑھ کے اہل قلم کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اور مولانا سعید انصاری [۱۸۹۴-۱۹۶۲ء] سابق رفیق دارالمصنفین کی سب سے زیادہ تعریف وتحسین کی ہے۔ انہوں نے شبلی نمبر سے بڑی دلچسپی لی اور ایک مفصل مقالہ ''عربی انشا'' کے عنوان سے لکھا اور اعانت کے طور پر اس زمانہ میں سو روپئے بھی مدیر البصیر کو بھیجے، جسے کالج کے نوادرات میں محفوظ کرادیا گیا تھا۔

مولانا سعید انصاری نے اپنے مقالہ میں عربی زبان وادب سے متعلق علامہ شبلی کی

خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے اور دکھایا ہے کہ عربی زبان وادب پر انہیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ شبلی کی عربی کتب کا تعارف وتجزیہ بھی اس مقالہ میں شامل ہے۔ عربی انشاء میں جاحظ ان کے ہیرو تھے۔ ان کی عبارتوں کا موازنہ کر کے وہ لکھتے ہیں:

''حافظ کی تصنیفات میں عربی علم وادب کا جو دریا موجزن ہے شبلی کے رسائل کا سرچشمہ گو کتنا ہی صاف وشفاف ہو اس کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ اصلاً وطناً ہندی شبلی کے لئے یہ بات کس قدر قابل فخر ہے کہ وہ اس عربی الاصل فطری انشا پرداز سے ٹکر لے رہے ہیں جو اسلام کا مایہ ناز اور اپنے زمانہ کا سب سے بڑا انشا پرداز تھا۔'' (البصیر شبلی نمبر ص ۱۲۵)

البصیر کا شبلی نمبر بڑی سائز کے ۲۰۲ صفحات پر مشتمل ہے اور کانٹے کے حروف میں شائع ہوا ہے۔ یہ شبلیات کے حوالے سے بڑے اہم مقالات کا مجموعہ ہے۔ واضح رہے کہ ماہنامہ خضرراہ کا شبلی نمبر اس لئے اہم تھا کہ وہ حیات شبلی سے پہلے شائع ہوا تھا اور البصیر کا یہ شبلی نمبر اس لئے اہم ہے کہ یہ حیات شبلی جیسی مفصل سوانح عمری کے بعد شائع ہوا ہے۔ اس کا پہلا مقالہ مشہور مورخ سید صباح الدین عبدالرحمٰن [۱۹۱۱-۱۹۸۷ء] کے قلم سے ہے، جس کا عنوان ''دارالمصنفین اور اس کی خدمات'' ہے۔ اس میں انہوں نے ۱۹۵۷ء تک کی دارالمصنفین کی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔ اس کے رفقاء و مصنفین، اس کی علمی، ادبی، تاریخی اور سوانحی تصنیفات اور ان کے تراجم کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ رفقاء کی تنخواہوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کے ایثار اور کسرنفسی بھی بیان کی ہے۔ ریاستوں سے ملنے والی امداد کا بھی ذکر ہے اور بڑے عمدہ پیرایہ میں دارالمصنفین کی تمام کارگذاریوں کی روداد قلم بند کر دی گئی ہے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مقالہ میں اس کے بانی علامہ شبلی کا کہیں ذکر نہیں۔ بلکہ صراحتاً دارالمصنفین کا بانی مولانا سید سلیمان ندوی کو قرار دیا گیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

''اس ادارہ کے بانی اور پہلے ناظم مولانا سید سلیمان ندوی تھے۔ ان کی کتاب ارض القرآن جلد اول سے دارالمصنفین کے تصنیفی کام کی ابتداء

ہوئی۔'' (البصیر شبلی نمبر ص ۶)

سارا زمانہ جانتا ہے کہ دارالمصنفین علامہ شبلی نے قائم کیا۔ سیرۃ النبی سے اس کا آغاز ہوا۔ انہوں نے اس کے اصول وضوابط بنائے۔ اپنی اور اپنے اعزہ کی کی قیمتی زمینیں اس پر وقف کیں۔ دارالضیوف تیار کرایا، طلبہ کے قیام کے لئے مکانات اور وظائف کا نظم کیا، تعلیم وتربیت کے لئے طلبہ کا انتخاب کیا۔ اس کے باوجود سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب جیسے ذمہ دار شخص کا ان کے بجائے مولانا سید سلیمان ندوی کو دارالمصنفین کا بانی قرار دینا سمجھ سے بالاتر ہے۔ شاید ان کے پیش نظر صاحب نزہۃ الخواطر مولانا سید عبدالحی حسنی کی یہ تحریر تھی کہ

''ان کی تصانیف میں سیرۃ النبی کی پہلی جلد بھی ہے۔ ان کا ارادہ اسے پانچ جلدوں میں مکمل کرنے کا تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بعض فارغین اس کی ترتیب کے لئے کمربستہ ہوئے، چنانچہ ان لوگوں نے اس کے لئے اعظم گڑھ میں ایک عظیم ادارے کی بناڈالی اور اسے دارالمصنفین کے نام سے موسوم کیا۔'' (نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۷۷)

ایک عرصہ بعد یہی بات مولانا نذرالحفیظ ندوی نے اپنے مضمون ماہنامہ نیادور لکھنو کے اودھ نمبر میں دہرائی۔ اس کو پڑھ کر ڈاکٹر ابرار اعظمی نے دارالمصنفین کے اس وقت کے ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحی سے استفسار کیا کہ دارالمصنفین کی بنیاد کس نے رکھی تھی؟۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے مولانا سید سلیمان ندوی کی حیات شبلی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ دارالمصنفین کے بانی علامہ شبلی ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کی حیثیت معمار دارالمصنفین کی ہے۔ (ماہنامہ معارف جون ۱۹۹۷ء ص ۴۶۰)

شیخ عطاء اللہ ایم اے کے مقالہ کا عنوان ''شبلی ایک پین اسلامسٹ'' ہے۔ مقالہ نگار علامہ شبلی کے عقیدت کیش تھے۔ اس مقالہ میں انہوں نے معروضی انداز اختیار کیا ہے۔ پین اسلامی جذبہ کی توضیح کے ساتھ شبلی کی ترکوں سے محبت، جنگ طرابلس اور جنگ بلقان پر مولانا شبلی کی نظموں سے ان کے پین اسلامی جذبات کی وضاحت کی ہے۔ اس مقالہ کے دو ذیلی

عناوین خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

۱۔ عشق واضطرار یا غلبہ حال ۲۔ مذہبی اجتہاد اور مجاہدین کی خدمت

علامہ شبلی قومی وملی مسائل میں جس طرح بے قرار ہوئے اور جن جذبات کا اظہار کیا ان کو بھی سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔

پروفیسر شیخ عطاء اللہ نے علامہ شبلی نعمانی کی معرکہ آراء کتاب الفاروق پر بھی ایک مضمون لکھا ہے۔ الفاروق نہ صرف علامہ شبلی کی بلکہ اردو زبان کی مایہ ناز کتاب ہے۔ دنیا کی کئی زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کی عظمت یہ ہے کہ معتبر ماخذ سے لکھی گئی ہے۔ اور اس کے مآخذ ومصادر کی تلاش وجستجو میں مصنف نے کئی اسلامی ممالک کا سفر کیا، اس میں علامہ شبلی کا مورخانہ شعور بہت بلند نظر آتا ہے۔ شیخ عطاء اللہ نے بھی اس کی عظمت اور بلند پایگی کا ذکر بڑی بلند آہنگی سے کیا ہے۔

پروفیسر محمد ظفر خاں نے سوانح مولانا روم کی روشنی میں علامہ شبلی کی تحقیقات کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ سوانح مولانا روم علامہ شبلی کی ایک اہم تصنیف ہے۔ اس کا مفصل مطالعہ آثار شبلی میں آچکا ہے۔ یہاں بس اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ یہ مطالعہ رومی کے سلسلے کی پہلی کاوش ہے۔ اسی کتاب سے مولانا روم کے مطالعہ کا آغاز ہوا۔ اس میں علامہ شبلی نے مثنوی معنوی کا مطالعہ علم الکلام کی کتاب کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ پروفیسر محمد ظفر خاں نے اس کتاب میں شبلی کی تحقیقات، وسعت نظر اور طریقہ استدلال کی خوبی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ البصیر کے اس نمبر میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک مقالہ ''شبلی کے تصنیفی کام کی مجموعی قدر وقیمت'' بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا مطالعہ شبلیات گہرا تھا۔ انہوں نے شبلی کے کئی علمی پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ البصیر میں شامل مقالہ خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔ اس سے شبلی کی عظمت اور فکری بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے آغاز میں انہوں نے نفس موضوع طے کرنے کے لئے میاں بشیر احمد [۱۸۹۳-۱۹۷۱ء] مدیر ہمایوں لاہور کا یہ خیال نقل کیا ہے کہ

''شبلی کی تصانیف میں ہم اصل اسلام کی تصویر دیکھتے ہیں، اس کے تمدن

میں، اس کے فلسفہ میں، اس کے شعروادب میں۔''

(ہمایوں مئی ۱۹۳۰ء ص ۴۲۰)

اس کے بعد فکر شبلی اور شبلی کے علمی وادبی کارناموں کا تفصیل سے تجزیہ کیا ہے اور اس کا نتیجہ ان کے الفاظ میں یہ ہے کہ

''شبلی علماء میں مقبول نہ ہوسکے۔ باقی رہے جدید تعلیم یافتہ حضرات سو انہیں شبلی کی ماضی پرستی سے قدرتاً کچھ دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ تحریک خلافت کے عارضی وقفہ کے سوا ان لوگوں میں شبلی نامقبول ہی رہے۔ البتہ اردو ادب میں انہوں نے وہ مقام حاصل کیا جس میں ان کی یکتائی کو ان سے کوئی چھین نہیں سکتا۔'' (ابصیر شبلی نمبر ص ۵۲)

ڈاکٹر سید عبداللہ کے مذکورہ خیالات سے انتہاپسندی ظاہر ہوتی ہے کیونکہ علامہ شبلی علماء میں یکسر نامقبول نہیں تھے۔ علماء کا ایک بڑا طبقہ ان کا گرویدہ، فضل وکمال کا معترف اور ان کی تصنیفات کا بڑا قدرداں تھا، جس میں بعض علمائے دیوبند بھی شامل تھے۔ اسی طرح اردو ادب میں بلاشبہ وہ یکتا اور یگانہ تھے، مگر ان کے کارنامے حرف آخر نہیں۔

سوانح مولانا روم کے علاوہ الفاروق، سفرنامہ روم ومصروشام اور مقالات شبلی کے جائزے بھی اس نمبر میں شامل ہیں۔ شبلی کے ایک خط کا عکس، کئی اہل علم کے خطوط، پیغامات تہنیت، شبلی کے شہ پارے، سرسید کے قلم سے المامون کا دیباچہ، شعرالعجم کا دیباچہ اور خواجہ دل محمد [۱۸۸۷-۱۹۶۱ء] کے قطعات تبرکات شبلی کے عنوان سے شامل کرکے اس خصوصی شمارے میں فاضل مدیر نے تنوع پیدا کردیا ہے۔ حیرت جلال پوری [۱۹۰۹-۱۹۹۰ء] اور مولانا مائل نقوی [۱۸۹۸-۱۹۸۲ء] کی منظومات بھی شامل ہیں، جن میں علامہ شبلی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ محمد حبیب اللہ خاں علی گڑھ کے تاثرات بھی شامل اشاعت ہیں۔

اس میں ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی [۱۹۱۵-۱۹۹۸ء] کا ایک مقالہ ''شبلی متکلم'' بھی شامل ہے۔ علامہ شبلی ایک بڑے متکلم اور ماہر علم الکلام تھے، الکلام، علم الکلام، الغزالی اور سوانح

مولانا روم اس سلسلہ کی ان کی اہم تحقیقی کاوشیں ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی نے انہیں تصنیفات کی روشنی میں ان کی متکلمانہ حیثیت واضح کی ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی نے علامہ شبلی پر مقالہ لکھ کر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند لی تھی۔ بعد میں یہی مقالہ ''شبلی ایک دبستاں'' کے نام سے مکتبہ عارفین ڈھاکہ سے شائع ہوا۔ انہوں نے علامہ شبلی کے کارناموں کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ زیر نظر مقالہ سے بھی ان کے گہرے مطالعے کا پتہ چلتا ہے۔

۱۹۴۳ء میں حیات شبلی شائع ہوئی۔ نو سو صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب علامہ شبلی کے حالات اور کارناموں کے ساتھ ان کے عہد کی تاریخ کا بھی مرقع ہے۔ یوں تو بلاشبہ یہ شبلی کی ایک اہم سوانح عمری ہے لیکن اس کے مشمولات سے حلقہ علی گڑھ میں کبیدگی پیدا ہوئی۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ اس میں شبلی کو سرسید کا مدمقابل بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ امین زبیری نے اس کے خلاف ایک کتاب ''ذکر شبلی'' لکھی جس میں مولانا سید سلیمان ندوی کی بہت سی باتوں سے اختلاف کیا۔ البصیر کے اس شبلی نمبر میں بھی یہ بحث اٹھائی گئی ہے۔ خان بہادر شیخ عبداللہ [۱۸۷۴-۱۹۶۵ء] جو علامہ شبلی ہی کے ایک شاگرد تھے، انہوں نے شبلی و سرسید کے تعلقات اور علی گڑھ میں شبلی کی خدمات اور مصروفیات کا ذکر کیا ہے۔ مضمون کے خاتمہ میں حیات شبلی کے بعض مندرجات کے خارج کرنے کی سفارش کی ہے۔ ان کے دو خطوط بھی اس مسئلہ پر اس شمارے میں شامل ہیں۔ ان میں بھی شبلی و سرسید کے تعلقات اور مولانا سید سلیمان ندوی کے بعض خیالات پر ردو قدح ہے۔

علامہ شبلی کانگریس کے حامی تھے۔ سرسید کا نقطہ نظر اس کے برعکس تھا۔ حیات شبلی میں اس کا ذکر قدرے تفصیل سے ہے۔ خان بہادر شیخ عبداللہ نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ:

> ''مولانا شبلی مرحوم مولوی تو تھے لیکن کٹھ ملا نہیں تھے۔ مولوی سلیمان صاحب نے ان کو سرسید کے مدمقابل اور ان کے خیالات سے انحراف کرنے والا ثابت کیا ہے، لیکن میں واقفیت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ندوی

صاحب کی غلطی تھی ۔اس میں شبہ نہیں کہ مولانا کے دل میں کانگریس کی وقعت تھی ۔ایک مرتبہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور کانگریس کے متعلق کچھ بات ہو رہی تھی تو مولانا کی زبان سے یہ نکلا کہ ہاں کانگریس ہندوستان میں ملک کے لئے کسی وقت مفید کام انجام دینے کے قابل ہو جائے گی، سرسید کو جو کانگریس سے اختلاف تھا اس میں مولانا مرحوم سرسید کے ہم خیال نہیں تھے،لیکن ندوی صاحب نے ان کے ان خیالات کو بات کا بتنگڑ بنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرسید اور مولانا شبلی میں بہت بڑا اختلاف کانگریس کے بارے میں تھااور مولانا ان کی مخالفت کرتے رہے اور دونوں میں کبھی اتفاق نہیں ہوااور ندوی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ سرسید میں اور مولانا شبلی میں بات بات پر نوک جھونک ہوا کرتی تھی ۔ میرے نزدیک سید سلیمان ندوی مرحوم کی یہ جسارت قابل اصلاح ہےاور اگر کوئی شخص محنت کر کے حیات شبلی یعنی مولانا کی سوانح حیات پر نظر ثانی کرے اور ندوی صاحب کے خیالات کو خارج کر دے جو سرسید کے متعلق ان کی زبان سے نکلے ہیں تو پھر حیات شبلی قابل عزت ہو جائے گی اور ممدوح قابل محبت کے ہو جائیں گے ۔''(البصیر شبلی نمبر ص ۷۵)

حیات شبلی کے اس طرح کے کئی اور مندرجات سے اختلاف کی گنجائش ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ حیات شبلی مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھی اور مطعون ان کے ممدوح اور استاذ علامہ شبلی کو کیا گیا، گویا گناہ کسی کا اور سزا کسی کو دی گئی ۔ دونوں نقطہ نظر کی ترجمانی رہ رہ کی جاتی رہی مگر حملے ہمیشہ علامہ شبلی کی ذات گرامی پر ہوئے ۔

علی گڑھ کے تعلق سے ایک اور مضمون مقتدی خاں شروانی [م:۶ ردسمبر ۱۹۶۸ء] نے لکھا ہے ۔اس میں انہوں نے علامہ شبلی کے علی گڑھ زمانہ قیام کی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا ہےاور مثبت انداز میں اچھا مضمون لکھا ہے ۔

علامہ شبلی کی ادبی حیثیت ہماری ادبی تاریخ کے صفحات میں ثبت ہے۔ایک مضمون میں پروفیسر عبدالحی [م:۱۳؍جنوری ۲۰۰۶ء] نے ان کی ادبی حیثیت پر گفتگو کی ہے۔شاعرانہ خوبیوں کا بھی اس میں ذکر ہے۔ایک اور مضمون مولانا اسماعیل ندوی کے قلم سے ہے۔یہ اس وقت ندوۃ العلما کے طالب علم اور طلبہ کی تنظیم الاصلاح کے ناظم تھے۔انہوں نے علامہ شبلی کی مختلف جہتوں پر اظہار خیال کیا ہے۔

مولانا اسماعیل ندوی کو شبلی سے گہری عقیدت تھی۔اس عقیدت کا اظہار اس مضمون میں واضح طور پر بھلے ہی نہ ہو مگر بعد میں انہوں نے سیرۃ النبیؐ کا عربی ترجمہ کر کے شبلی کو اخلاص و عقیدت کا نذرانہ پیش کیا۔افسوس کہ یہ عربی ترجمہ اب تک شائع ہو نہ سکا۔

اس نمبر کا آخری مقالہ ''مولانا شبلی کیا تھے''۔دراصل سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا ایک خط ہے۔جو انہوں نے البصیر کے ایڈیٹر کو لکھا ہے۔اس خط کا آغاز بڑا دلچسپ ہے اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ دارالمصنفین میں حیات شبلی کے سواء شبلی پر اور کوئی کام کیوں نہیں ہوا۔وہ لکھتے ہیں:

> ''آپ کے خطوط ملے۔آپ مولانا شبلی کی یادگار منانے کے سلسلہ میں ہم لوگوں سے مولانا مرحوم پر مضامین طلب فرماتے ہیں گویا آپ آفتاب کی شعاؤں سے آفتاب کی مدح سرائی چاہتے ہیں۔عطر کی عطر بیزی سے عطر کی تعریف کہلانا چاہتے ہیں۔بلبل کے نالہ سے بلبل کی داستان سننا چاہتے ہیں۔یہ کتنا صبر آزما کام ہے۔اگر ہم لوگ یہ کام دوسروں سے لیں تو بجا ہوگا تاکہ ہم کو اندازہ ہو کہ ہم جس چاند کی چاندنی ہیں وہ دوسروں کی نگاہ میں کیا حیثیت رکھتی ہے۔(البصیر شبلی نمبر ص ۱۹۱)

اس کے بعد صباح الدین صاحب نے اصل موضوع ''مولانا شبلی کیا تھے'' پر اظہار خیال کیا ہے اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔مولانا شبلی کی عظمت، بلندی، طرفگی اور ان کے کمالات کے ایک ایک پہلو کو اس خوبی سے لکھا ہے کہ ان کی شخصیت کا ایک عمدہ مرقع سامنے

آ گیا ہے۔انہوں نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ:

''ان کی عظمت کا صحیح اندازہ وہ نہیں کرسکتا جوصرف ادیب ہے یا صرف نقاد ہے یا صرف شاعر ہے یا صرف مورخ ہے یا صرف متکلم ہے یا صرف سیرت نگار ہے یا صرف عالم ہے۔ان کے علمی وادبی محاسن کا معترف صحیح معنوں میں وہی ہوسکتا ہے جوان ہی کی طرح جامعیت رکھتا ہو،لیکن اس جامعیت کا کوئی اہل قلم ابھی تک پیدا نہیں ہوا،اسی لئے یا تو کسی ادیب نے صرف ان کے ادب وانشاء کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے یا کسی نقاد نے ان کے فن تنقید نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ یا کسی محقق نے ان کے طرز تحقیق پر نگاہ ڈالی ہے۔لیکن کوئی بھی ان کی جامعیت کا صحیح معنوں میں احاطہ نہیں کرسکا ہے۔ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی میں بڑی حد تک یہی جامعیت تھی۔ حیات شبلی لکھ کر وہ ان کی تصانیف پر دوسری جلد لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن افسوس کہ اس کی تکمیل نہ ہوسکی۔''

(البصیر شبلی نمبر ص ۱۹۲-۱۹۳)

تحدیث نعمت کے طور پر یہاں یہ عرض کرنا شاید نامناسب نہ ہو کہ حیات شبلی کی دوسری جلد کی تکمیل اللہ نے میرے نصیب میں لکھی تھی، چنانچہ اسی سال جنوری [۲۰۱۳ء] میں میری کتاب ''آثار شبلی'' دارالمصنفین نے شائع کی ہے۔وہ چار سال کی جاں کاہ محنت کا نتیجہ ہے۔آثار شبلی ۷۵۲ رصفحات پر مشتمل ہے۔اس میں علامہ شبلی کے تمام آثار وباقیات کا مفصل جائزہ اور شبلی شناسی کی تفصیلات آ گئی ہیں۔

البصیر کا یہ شبلی نمبر شبلیات میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کے مدیر پروفیسر عبیداللہ خاں نے ہندوستان کا سفر کیا تو اس نمبر کی وجہ سے ان کی بڑی پذیرائی ہوئی، چنانچہ انہوں نے ۱۹۶۱ء میں چند اضافوں کے ساتھ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع کیا۔

---

(۵)

درس، علی گڑھ

[شبلی نمبر]

[جامعہ اردو علی گڑھ]

ماہنامہ درس جامعہ اردو علی گڑھ کا ترجمان تھا۔ اسے جامعہ اردو نے اپنے امتحانات ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کے طلبہ کی سہولت کے لئے جاری کیا تھا۔ یہ رسالہ غالباً ۵۵-۱۹۵۴ء میں نکلا تھا۔ ماہنامہ ادیب کے شبلی نمبر میں اس کی ۱۹۵۵ء کی ایک مکمل جلد دستیاب ہونے کا اشتہار شائع ہوا ہے۔ یہ جلد جامعہ اردو نے دوبارہ یکجا شائع کی تھی۔ اس کا ایک نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ ۱۹۵۷ء کے تین شمارے مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں دستیاب ہیں۔ اس کے تین شمارے کے تین مدیر تھے۔ پروفیسر قمر رئیس نے بھی اس کی ادارت کی تھی۔ آخری شمارہ اپریل ۱۹۵۷ء کا دستیاب ہے۔ درس کا ''شبلی نمبر'' اب تک کہیں دستیاب نہیں ہوا ہے۔ مشتاق حسین صاحب سابق لائبریرین مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ نے ''باقیات شبلی'' میں پانچ جگہوں [ص ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۹۶، ۲۲۰، ۲۲۱] پر اس کا حوالہ دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے متعلق کسی قسم کی معلومات دستیاب نہیں ہیں۔

جامعۂ اردو کا ترجمان

ماہنامہ



علی گڑھ

شبلی نمبر

نگراں

...ظہیر الدین علوی

...ایم اے، ایل ایل بی (علیگ)

مدیر

ابن فرید

ایم اے (علیگ)

ستمبر ۱۹۶۰ء

قیمت چھ روپے

شمارہ ۹

زر سالانہ

ہندوستان	———	ساڑھے پانچ روپے
ممالک بیرونی	———	سات روپے

...ی پتہ :- ماہنامہ اچھا ساتھی، بارنس سٹریٹ کراچی ۳

ناشر

سرسید مارکٹ [illegible] علی گڑھ ۲

ادیب شبلی نمبر کا سرورق

(۶)

ادیب، علی گڑھ

[شبلی نمبر]

[مدیر: ڈاکٹر ابن فرید، جامعہ اردو علی گڑھ، ستمبر ۱۹۶۰ء]

ماہنامہ درس کے بعد جامعہ اردو علی گڑھ نے ماہنامہ ادیب جاری کیا۔ ڈاکٹر ابن فرید [۱۹۲۵-۲۰۰۳ء] ستمبر ۱۹۵۹ء میں اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ انہوں نے اس کے کئی خصوصی شمارے شائع کئے، ان میں ''نصاب تعلیم نمبر'' [دو حصے] اور مولانا عبدالسلام ندوی نمبر قابل ذکر ہیں۔ زیر نظر ''شبلی نمبر'' بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کاوش ہے۔ یہ دو کالم میں A4 سائز کے ۴۰۴ صفحات پر مشتمل ہے جو کتابی سائز میں تقریباً حیات شبلی کے مساوی ہوگا۔ یہ شبلی نمبر ستمبر ۱۹۶۰ء میں نکلا۔ اس سے پہلے رسائل وجرائد کے جو ''شبلی نمبر'' شائع ہوئے تھے اور جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، وہ سب ضخامت کے لحاظ سے اس سے کم تر ہیں۔ علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مقالات اور تنوع مضامین کے لحاظ سے بھی کوئی خصوصی شمارہ اس کے مساوی نہیں۔ اس کا حرف آغاز ڈاکٹر ابن فرید اور پیش لفظ دبستان شبلی کے صاحب اسلوب ادیب وانشاپرداز مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے ہے۔ ڈاکٹر ابن فرید نے اسے درج ذیل ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ عالم، مفکر، مورخ

۲۔ مصنف، ناقد، شاعر

۳۔ ادیب، انشاءپرداز، صاحب قلم

۴۔ جلوہ صد رنگ

۵۔ مخطوطات

گو یہ ایک عمدہ ترتیب ہے، تاہم اس کا مطالعہ و تجزیہ علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی روشنی میں کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی [۱۸۹۲-۱۹۷۷] نے پیش لفظ اپنے مخصوص اسلوب میں لکھا ہے، جس میں شبلی کی شخصیت اور ان کی عظمتوں کو بڑے ہی خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے شبلی کی صحبت سے فیض اٹھایا تھا، اس کا اعتراف انہوں نے ان لفظوں میں کیا ہے:

''ان سطور کے بے علمے راقم کو اردو لکھنا پڑھنا تھوڑا بہت جو کچھ بھی آیا وہ بڑی اور بہت بڑی حد تک فیض انہیں حضرت شبلی کا ہے۔ فیض الندوہ کے ایڈیٹر کا، موازنہ اور شعر العجم کے فن کار کا، اور الفاروق، الکلام، سیرۃ النبیؐ کے مصنف کا، اس ذات کا جس میں بیک وقت ایک شاعر و سخن سنج، ایک مورخ و محقق، ایک مبصر و ناقد، ایک عالم و معلم، ایک ادیب و انشا پرداز، ایک مصنف و اہل قلم کے کمالات جمع تھے۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۷)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس پیش لفظ میں علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کے علمی و ادبی امتیازات کے ایک ایک پہلو کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے اور ایک ایسا مرقع تیار کیا ہے جس میں شبلی کی ہشت پہل شخصیت کے تمام خال و خد نگاہوں میں آجاتے ہیں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق، علامہ شبلی کے شاگرد تھے۔ علی گڑھ کالج میں انہوں نے علامہ شبلی سے فارسی پڑھی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''کالج میں تمام پروفیسر سوائے عربی، فارسی، سنسکرت اور ریاضی کے انگریز تھے۔ فارسی عربی کے پروفیسر مولانا شبلی اور مولانا عباس حسین تھے، ریاضی کے بابو مکرجی۔ مولانا شبلی شاعر، ادیب اور مورخ تھے۔ ان کی

جماعت میں بیٹھ کر جی خوش ہو جاتا تھا۔ وہ موقع موقع سے ادبی نکات اور اساتذہ کے اشعار اور لطائف یا تاریخی واقعات اس طرح بیان کرتے تھے کہ درس کا حق ادا ہو جاتا تھا۔........... جب میں مڈل میں پڑھتا تھا تو میں نے نجی طور پر عربی پڑھی تھی۔ علی گڑھ آکر میں نے دوسری زبان فارسی لی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے فارسی لی، اس کی بدولت مجھے شبلی جیسے استاذ ملے۔"

(ماہنامہ انشا کراچی، اکتوبر ۱۹۵۹ء بحوالہ ادیب شبلی نمبر ص ۱۴-۱۵)

بابائے اردو نے ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ سے بی اے کیا۔ یہیں انہیں شبلی سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ ۱۹۱۲ء میں مولوی عزیز مرزا کی وفات کے بعد وہ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری نامزد ہوئے، جس کے پہلے سکریٹری علامہ شبلی تھے۔ اس طرح وہ انجمن میں علامہ شبلی کے جانشین بھی ہوئے مگر انہوں نے استاذ کی عظمت کا اعتراف اور جانشینی کا حق ادا نہیں کیا۔ واضح رہے کہ مذکورہ بالا مضمون ان کی اخیر عمر کا ہے۔ انہیں جب جب موقع ملا علامہ شبلی پر تنقید بلکہ تنقیص کی۔ پہلے گلشن ہند کے ایک حاشیے میں سخت تنقید کی، پھر خطوط شبلی کے مقدمہ میں عطیہ فیضی [۱۸۷۷-۱۹۶۷ء] سے ان کے خلوص و محبت کی ایسی داستان گھڑی کہ مطالعہ شبلیات کا رخ ہی بدل دیا۔ اسی پس منظر میں عبداللطیف اعظمی نے شبلی نمبر میں اشاعت کے لیے ان کے صحیح خیالات معلوم کرنے کی غرض سے انہیں خط لکھا۔ اس کا انہوں نے جو جواب دیا ہے اسے ڈاکٹر ابن فرید نے اہمیت کے پیش نظر دیباچہ کے ساتھ ہی شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر ابن فرید نے اپنے ادارتی نوٹ میں لکھا ہے کہ:

"بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے سلسلے میں ایک عام غلط فہمی ہے کہ وہ علامہ شبلی کے مخالف ہیں۔ عبداللطیف اعظمی جب شبلی نمبر کے لئے اپنا مقالہ تیار کرنے لگے تو انہیں بابائے اردو کی رائے براہ راست معلوم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بابائے اردو اس درمیان آنکھ کے

آپریشن کی وجہ سے بالکل معذور تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے جواب لکھا۔ ذیل میں ہم عبداللطیف اعظمی کے خط کے ساتھ بابائے اردو کا خط شائع کر رہے ہیں تاکہ اصل پوزیشن سامنے آجائے۔ اس خط سے علامہ شبلی کے سلسلے میں چونکہ بابائے اردو کی پوزیشن بالکل بدل جاتی ہے، اس لئے ہم اسے بھی اداریہ کا ایک جز تصور کرتے ہوئے ترتیب مضامین سے الگ دے رہے ہیں۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۱۲)

ڈاکٹر ابن فرید نے اسی شبلی نمبر میں ایک مفصل مقالہ ''شبلی چوں بہ خلوت می رود'' لکھا ہے جس میں انہوں نے خطوط شبلی، دستہ گل اور بوئے گل کے حوالے سے بابائے اردو، ڈاکٹر وحید قریشی اور شیخ محمد اکرام وغیرہ کے اعتراضات والزامات کے جالے کو انہیں کے اسلوب میں صاف کیا ہے۔ اس لئے ان کے مذکورہ بالا خیالات کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ اس موضوع پر ابن فرید سے بہتر کسی نے آج تک نہیں لکھا اور بابائے اردو نے بھی اپنے خط میں واضح طور پر لکھا ہے کہ ''میں شبلی کا مخالف نہیں، اگر لوگ سمجھتے ہیں تو صریحاً غلط ہے۔'' [ادیب شبلی نمبر ص ۱۵] البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مکتوب نگار عبداللطیف اعظمی کو پہلے ہی سے اس بات سے اتفاق نہ تھا کہ وہ شبلی کے مخالف ہیں، اس لئے کہ وہ بابائے اردو کے اعتراضات کو حالی وشبلی کی معاصرانہ چشمک کے نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنی کتاب ''شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں'' میں انہوں نے یہی نقطہ نظر پیش کیا ہے اور اسی پس منظر میں انہوں نے بابائے اردو کو خط بھی لکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بابائے اردو نے اپنے خط میں اپنی گفتگو حالی وشبلی تک محدود رکھی ہے اور اس خط میں بھی انہوں نے شبلی کو ضبط نہ کرنے والا جذباتی شخص قرار دیا ہے۔ [ادیب شبلی نمبر ص ۱۳] اور ''خطوط شبلی'' کے مقدمہ کا نام تک نہیں لیا۔ حالانکہ شبلی سے متعلق ان کی تمام تنقیدوں میں یہ سب سے زیادہ دل آزار ہے۔ اور یہی تحریر وہ بنیاد ہے جس پر امین زبیری کے مضمون ''شبلی کی رنگین زندگی''، ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب ''شبلی کی حیات معاشقہ'' اور شیخ محمد اکرام کے بعض خیالات (وادی گل) کی عمارتیں کھڑی ہیں۔ البتہ مذکورہ خط سے یہ

احساس ضرور ہوتا ہے کہ آخر میں وہ اپنے کیے پر شاید نادم تھے۔

اس کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی [۱۸۶۷-۱۹۵۰ء] کا وہ مضمون جو انہوں نے علامہ شبلی کی وفات پر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھا تھا شامل ہے، یہ ان کے مجموعہ مضامین ''مقالات شروانی'' میں بھی شامل ہے۔ بلاشبہ یہ ایک اہم سوانحی مضمون ہے، جس سے شبلی کی شخصیت کے بنیادی اور نمایاں خدوخال ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور شبلی سے فاضل مقالہ نگار کے تعلقات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔

علامہ شبلی کو شروانی صاحب سے بے انتہا تعلق تھا اور یقینی طور پر وہ حبیب شبلی تھے، مگر مذکورہ مضمون میں شبلی کی علی گڑھ سے علاحدگی، ندوہ کے مسائل و معاملات حتیٰ کہ شبلی کے مستعفی ہونے اور ان کے کفر و کافر قرار دینے وغیرہ کا ذکر نہیں بلکہ پورے مضمون میں ایک جگہ بھی مخالفین شبلی کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ ندوہ کے سارے واقعات ان کے سامنے وقوع پذیر ہوئے۔

مولانا شروانی سے شبلی کا تعلق المامون کی اشاعت اور مامون عباسی کے انتخاب پر اختلاف سے قائم ہوا تھا۔ انہوں نے سفرنامہ روم ومصروشام، الغزالی، الفاروق اور بعض دوسری تصنیفات شبلی پر تبصرے کیے۔ ان کے علم وفضل کا علی العموم اعتراف کیا، ادب، شاعری، تنقید حتی کہ سوانح نگاری وغیرہ میں ان کی مہارت کے معترف بھی رہے لیکن شاید تعلیمی نقطہ نظر اور ندوہ کی ترقی کے سلسلے میں شبلی کے خیالات سے ان کے خیالات ہم آہنگ نہ تھے۔ اس کے متعلق پورے مضمون میں ایک حرف بھی نہیں ہے۔

علامہ شبلی کی علم کلام پر گہری نظر تھی۔ اس کی تدوین کا منصوبہ انہوں نے حیدرآباد کے زمانہ قیام میں بنایا تھا۔ الکلام، علم الکلام، سوانح مولانا روم اور الغزالی چاروں کتابیں اسی علمی منصوبہ کا حصہ ہیں۔ مولانا سعید انصاری نے ان کی مہارت علم الکلام کا جائزہ لیا ہے۔ یہ اصلاً الکلام اور علم الکلام کا مطالعہ و تجزیہ ہے۔ الغزالی اور سوانح مولانا روم کو انہوں نے یہ کہہ کر کہ اس میں کلامی مباحث ضمناً آئے ہیں نظر انداز کر دیا ہے، البتہ اول الذکر دونوں کتابوں کی روشنی میں شبلی کے نقطہ نظر کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شبلی کے خیالات میں

بڑی وسعت ہے۔ ان کا دائرہ علم الکلام قدما کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہے اور یہ بات انہوں نے قدیم علم الکلام کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد لکھی ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے عہد کے تناظر میں کلامی مباحث کو اٹھایا ہے۔ لیکن مولانا سعید انصاری نے ان مباحث کو سرے سے نظر انداز کر دیا ہے، جس پر بعض علماء نے کفر کا فتویٰ جاری کیا تھا اور جس کی مولانا سید سلیمان ندوی نے الکلام کے دیباچے میں صراحت کی ہے۔

مولانا سعید انصاری کے اس مضمون سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کے پیش نظر کشف الظنون (حاجی چلپی) کا طبع اول تھا جو ناقص تھا اور یہ بھی کہ وہ نسخہ ندوہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور اس پر علامہ شبلی کے قلم سے حواشی ہیں۔ ضرورت ہے کہ کوئی اہل علم ان حواشی کا مطالعہ کرے اور ممکن ہو تو اس کو شائع کر دیا جائے، جس طرح مولانا ابوالکلام آزاد کے حواشی سید مسیح الحسن نے ''حواشی ابوالکلام'' کے نام سے شائع کئے ہیں۔

ادیب کے اس شبلی نمبر میں مولانا سعید انصاری کا ایک اور مقالہ ''شبلی عالمی ادیب و شاعر'' بھی شامل ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد مطالعہ شبلی ہے۔ اس میں انہوں نے چند ممتاز عالمی ادباء و شعراء کی نثر و نظم سے علامہ شبلی کی تحریروں کا موازنہ کیا ہے۔ تقابل کے طور پر ان کی نثر و نظم کے نمونے بھی نقل کئے ہیں، ان میں ڈیماستھنز، حافظ، نظامی، فیضی اور نظیری کے نام شامل ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''اس وقت ان کی عربی و فارسی اور اردو کی چند عبارتیں اور اشعار یہاں نقل کرتا ہوں، ناظرین دیکھیں گے کہ ان میں ڈیماستھنز، حافظ، فیضی اور نظیری بول رہے ہیں۔ اس لائق و فائق نثر و نظم میں بعض نمونے ایسے ہیں جن کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی، بعض ایسے بھی ہیں جو دنیا کی تمام زبانوں میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۱۹۳)

عالمی ادب کے ان مشاہیر سے شبلی کا موازنہ کرنے کے بعد مولانا سعید انصاری نے علامہ شبلی کے بعض فارسی تراکیب بند اور بعض اردو تحریروں کا مطالعہ اسی نقطہ نظر سے کیا ہے اور

سچ یہ ہے کہ شبلی کی ایسی عمدہ اور معیاری تحریروں کا انتخاب کیا ہے کہ اس سے پہلے ایسا انتخاب نہیں ہوا ہوگا۔ اس سلسلہ کا ایک عنوان ''بے نظیر تحریریں'' ہے۔ اس میں انہوں نے سیرۃ النبیؐ سے ''ظہور قدسی'' کا اقتباس نقل کیا ہے اور بلا شائبہ مبالغہ یہ ایک الہامی تحریر معلوم ہوتی ہے۔
آخر میں انہوں نے شبلی کی اردو شاعری کی طرف توجہ کی ہے اور کس قدر صحیح تجزیہ کیا ہے کہ:

''مولانا اردو غزلوں میں کامیاب نہیں ہوئے۔ حیدرآباد دکن کے زمانہ قیام میں چند غزلیں لکھی تھیں، جن میں غالب کا انداز اختیار کیا تھا، لیکن غالب کا طرز جب خود ان کے شاگردوں نے جنہوں نے ان سے اصلاح بھی لی تھی نبھ نہ سکا تو مولانا کیا کامیاب ہو سکتے تھے۔ البتہ ان کی نظمیں نہایت کامیاب ہیں۔ قومی نظموں کا طریقہ سرسید کے اشارے سے مولانا حالی نے نکالا تھا۔ ان کی مسدس مدوجزر اسلام نے ہندوستان کا گوشہ گوشہ ہلا ڈالا، لیکن مولانا شبلی نے بھی قومی شاعری میں بعض اقسام ایجاد کئے ہیں۔ انہوں نے مذہبی، اخلاقی، سیاسی نظمیں اس شان کی لکھی ہیں کہ پہلے کبھی نہیں لکھی گئیں اور آئندہ بھی امید نہیں کہ کوئی لکھ سکے گا۔''

(ادیب شبلی نمبر ص ۲۰۵)

ان تجزیوں کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ:

''پاک نژاد ہندیوں! ان تحریروں میں جو جہاں گیر کے ''پورب شیراز ماست'' کے خطہ کے سبب سے مشہور، ہمہ داں ادیب و شاعر علامہ شبلی کے قلم سے نکلی ہیں تم کو نظر آئے گا کہ تمہارا فاضل اجل دنیا کے علمی و ادبی مشاہیر کے دوش بدوش کھڑا ہے۔ تم کو بھی اب حق پہنچتا ہے کہ متمدن اقوام عالم کی صف میں جا کر کھڑے ہو اور فخر و مباہات کے ساتھ اپنی گردن بلند کرو۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۲۰۷)

علامہ شبلی کی اردو و فارسی شاعری پر اس نمبر میں کئی مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر سلام

سندیلوی نے اردو شاعری کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور ابتداء ہی میں یہ شکوہ کیا ہے کہ:

''تمام نثر نگاروں میں آزاد اور حالی کا ذکر بہ حیثیت شاعر کے بھی کیا جاتا ہے لیکن شبلی کو اس محفل میں جگہ نہیں دی جاتی ہے۔ یہ شبلی کے ساتھ بے انصافی ہے۔ جہاں تک شاعرانہ صلاحیت کا تعلق ہے، شبلی آزاد اور حالی سے کم نہیں ہیں، اس لئے شبلی کو محقق و مورخ اور نقاد کے ساتھ شاعر بھی تسلیم کرنا ہمارا فرض ہے۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۱۵۴)

پھر انہوں نے ابتدائی دور سے لے کر وفات تک کے شبلی کے اردو کلام کا جائزہ لیا ہے اور ان کی شاعرانہ عظمت بیان کی ہے۔ خاص طور پر ان کی چار نظموں عدل جہاں گیری، شہر آشوب اسلام، خیر مقدم ڈاکٹر انصاری، ہم کشتگان معرکہ کان پور ہیں کا بہت عمدہ تجزیہ کیا ہے اور آخر میں اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ:

''اگر شبلی زیادہ نظمیں نہ کہتے اور صرف انہیں چار نظموں کے خالق ہوتے، اس وقت بھی شبلی کو ایک اچھا شاعر کہنے میں کسی کو تامل نہیں ہوسکتا تھا۔ شبلی کی شاعرانہ عظمت کا ایک ثبوت اور بھی ہے، انہوں نے اسلامی نظمیں کہہ کر اردو میں ایک طرح نو ڈال دی۔ اس طرح نو پر بعد میں اقبال نے تخیل کا ایوان تعمیر کیا۔ اس لحاظ سے شبلی کو اقبال کا پیش رو کہا جاسکتا ہے اور یہ فخر شبلی کے لئے کچھ کم نہیں۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۱۶۷)

اقبال کا پیش رو شبلی اور اقبال اور پیروی شبلی وغیرہ عنوانات کے تحت اب مفصل جائزے شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں جب یہ بات ڈاکٹر سلام سندیلوی نے لکھی تھی تو اسے تعجب کی نظر سے دیکھا گیا تھا۔ اب یہ واقعہ بھی سامنے آچکا ہے کہ اقبال نے شبلی سے استفادہ بھی کیا تھا اور ان کی پہلی کتاب علم الاقتصاد کی اصلاح شبلی ہی نے کی تھی۔ (دیباچہ علم الاقتصاد)

شبلی کی مثنوی صبح امید ان کی اردو شاعری ہی کا حصہ ہے اور بلاشبہ اردو میں یہ خاصے کی چیز ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین [۱۹۲۳-۲۰۰۸ء] نے اس کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ گیان چند

جین کا بنیادی کام مثنویوں پر ہی ہے۔ اس لئے یہ مطالعہ اہمیت رکھتا ہے۔ اسی طرح اردو قصیدہ کا مطالعہ ڈاکٹر محمود الٰہی کا بنیادی موضوع تھا، چنانچہ انہوں نے شبلی کی قصیدہ نگاری اور اس کی خصوصیات کا عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے اور شبلی کے قصیدہ سید محمود پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''شبلی نے نئی شراب پرانے پیانے میں پیش کی تھی۔ انہیں شک ہوا کہ قصیدے کے اسلوب سے ان پر روایتی مدح گستری کا الزام نہ آجائے۔ خاتمہ قصیدہ پر انہوں نے یہ بات صاف کر دی اور اس بے باکی سے صاف کی کہ شاعری کی خداوندی ممدوح کی مدح پر مسلط ہوگئی۔ وہ کہتے ہیں اور تعلّی کی دل کشی میں عرفی اور مومن سے آگے نکل جاتے ہیں:

مدح مقصود نہیں جوش محبت ہے یہ
میں نہیں وہ کہ لکھوں مدحت ارباب دول

(ادیب شبلی نمبر ص ۱۴۰)

شبلی کی اردو شاعری کا ایک اور اہم بلکہ سب سے اہم پہلو ان کی سیاسی شاعری ہے۔ اس کا تجزیہ پروفیسر صدیق احمد صدیقی نے پیش کیا ہے۔ یہ مضمون دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں عہد شبلی کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں شبلی نے اس سے جو اثرات لئے اور انہیں شاعرانہ اسلوب میں جس طرح ڈھالا اس کا ذکر ہے۔ مفصل جائزہ کے باوجود اسے مقالہ نگار نے طائرانہ نظر قرار دیا ہے۔

سیاسیات پر شبلی کی گہری نظر تھی۔ اس کا تجزیہ احمد اسحاق نعمانی نے اپنے طویل مقالہ میں کیا ہے۔ انہوں نے بھی اولاً شبلی کے گردو پیش کے سیاسی حالات اور خیالات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ خاص طور پر شبلی کے ۱۶ رسالہ قیام علی گڑھ کا تجزیہ بڑی عمدگی سے کیا ہے اور اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ

''دراصل شبلی کا سیاسی شعور سرسید کے سیاسی نظریات پر ایک اضافہ ہے۔ سرسید کے یہاں قوم کا تصور تو ضرور ہے لیکن انگریزوں سے الگ کسی آزاد

وطن کا نہیں۔شبلی نے انگریز دشمنی کے ساتھ قوم کو وطن کا تصور بھی دیا اور انہوں نے انگریزی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کا خواب بھی دیکھا۔سرسید جب کالج کھولتے ہیں تو اس کا نام اینگلو محمڈن رکھتے ہیں اور شبلی اس پر آشوب زمانے میں بھی اسکول کا نام اینگلو محمڈن، اینگلو ورنا کیولر رکھنے کے بجائے نیشنل اسکول رکھتے ہیں.......... مقالات شبلی میں مسئلہ آرمینیا اور اسی قسم کے دیگر مضامین اور کلیات شبلی کی بیشتر سیاسی نظموں کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی انگریز اور انگریزی حکومت کے سخت مخالف تھے۔" (ادیب شبلی نمبر ص ۳۶۸-۳۶۹)

احمد اسحاق نعمانی نے سرسید و شبلی کے سیاسی نظریات کی وضاحت کے ساتھ اس کی افادیت پر بھی بحث کی ہے۔شبلی کے سیاسی مضامین اور نظموں کا بھی تجزیہ کیا ہے اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔"مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ" میں شبلی ہندو مسلم اتحاد کے زبردست داعی نظر آتے ہیں۔علامہ شبلی کے سیاسی شعور پر بھی احمد اسحاق نعمانی نے روشنی ڈالی ہے۔بحثیت مجموعی یہ ایک عمدہ تجزیہ ہے۔

مفتون احمد [۱۹۲۹-۱۹۷۴ء] نے بھی "مولانا شبلی اور ان کے عہد کے سیاسی محرکات" کو موضوع بنایا ہے۔احمد اسحاق نعمانی اور مفتون احمد دونوں کا تعلق خانوادہ شبلی سے تھا اور دونوں کے خیالات میں بڑی یکسانیت ہے۔البتہ ان کے تجزیے اور دلائل میں کسی قدر فرق ہے۔احمد اسحاق نعمانی نے علامہ شبلی کی نثری تحریروں کی روشنی میں تجزیہ کیا ہے اور مفتون احمد نے علامہ شبلی کے سیاسی نظریات کی وضاحت کا دارومدار ان کی سیاسی نظموں خاص طور پر مسلم لیگ کے خلاف لکھی جانے والی نظموں سے اپنے موقف کی تائید میں استدلال کیا ہے۔البتہ دونوں کے نقطہ نظر میں کوئی فرق نہیں۔احمد اسحاق نعمانی نے سرسید کی انگریز پرستی اور شبلی کی ان سے دشمنی کے نظریہ کی وضاحت کی ہے اور مفتون احمد نے بھی، لیکن یہ بات اہم ہے کہ احمد اسحاق نعمانی اسے سیاسیات سرسید پر ایک اضافہ قرار دیتے ہیں اور مفتون احمد اسے سرسید کے

سیاسی خیالات کی ضد کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ مفتون احمد مولانا عبدالسلام ندوی کے نواسے تھے۔ انہوں نے علامہ شبلی پر متعدد مضامین لکھے جن کا ایک مجموعہ ''مولانا شبلی ایک مطالعہ'' کے نام سے مکتبہ اسلوب کراچی سے شائع ہوا ہے۔ جس میں مذکورہ مباحث کو انہوں نے اور تفصیل سے پیش کیا ہے۔

مفتون احمد نے مقالے کے شروع ہی میں شبلی کے بھائی مہدی حسن بیرسٹر کا ایک خط نقل کر کے واضح کر دیا ہے کہ ابتدا ہی سے شبلی کا موقف سرسید کے برعکس تھا اور یہ کہ ان کے خانوادہ کا ایک ذی علم اور جدید تعلیم یافتہ شخص اس سے اتفاق نہیں رکھتا تھا، لیکن مہدی حسن کے اسی خط میں یہ بھی ہے کہ ایک طبقہ سرسید کو کوتاہ اندیش تصور کرتا ہے۔

شبلی ابتدا ہی سے کانگریس کے حامی اور ہندو مسلم اتحاد کے داعی تھے۔ بعد کے ادوار میں ایسے نظریات کے حامل اشخاص کو قوم پرور قرار دیا گیا گویا ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں علامہ شبلی پہلے قوم پرور مسلمان تھے۔

علامہ شبلی کو علی العموم ادیب و انشا پرداز، شاعر، مورخ و مصنف اور نقاد تسلیم کیا گیا، لیکن محقق تسلیم کرنے میں دیر لگی۔ حافظ محمود شیرانی [۱۸۸۰-۱۹۴۶ء] کی تنقید شعرالعجم جس میں انہوں نے شبلی کی تحقیقات پر بحث کر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ محقق نہیں تھے۔ ان کے اس رویے کی وجہ سے ایک حلقے نے آج تک انہیں محقق نہیں تسلیم کیا۔ حالانکہ یہ ایک غلط روش اور طرز تھا جو اہل قلم محقق نہ ہو وہ نقاد اور مصنف کیسے ہوسکتا ہے۔ بلاشبہ علامہ شبلی ایک بڑے محقق تھے۔ ان کی تصنیفات اس کی شاہد ہیں۔ مرزا احسان احمد [۱۸۹۵ء-۱۹۷۲ء] نے اپنے مقالہ میں ان کی تحقیقی بصیرت و بصارت دکھلائی ہے۔ خاص طور پر ان کی محققانہ تصنیفات سے متعدد مضبوط دلائل پیش کیے ہیں۔ یہ اپنے موضوع پر پہلا فاضلانہ مقالہ تھا جس میں علامہ شبلی کی محققانہ کاوشوں کا تجزیہ ہے۔ مرزا احسان احمد نے لکھا ہے کہ:

> ''ایک کامل الفن مصنف کے لئے سب سے زیادہ ضروری شرط تحقیق و تنقید کی صلاحیت ہے۔ اس لحاظ سے موجودہ دور کے مصنفین میں علامہ

مرحوم کو جو امتیازی درجہ حاصل تھا۔ اس کا حق و انصاف کی زبان منکر نہیں ہو سکتی۔ اس کی بہترین شہادت ان کی متعدد علمی و ادبی تصانیف ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت نے ان کو کتنا جدت آفریں دماغ، کتنی نکتہ رس نگاہ اور کتنا سلاست رو اور پر زور قلم عطا کیا تھا۔''

(ادیب شبلی نمبر ص ۳۶)

پھر انہوں نے علامہ شبلی نعمانی کی تحقیقات کی مثالیں پیش کی ہیں۔ مثلاً کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کے مسلمانوں پر الزام کی تردید، الجزیہ، حقوق الذمیین، ملا مسیح کی رامائن کے متعلق علامہ شبلی کی تحقیقات کا مطالعہ و تجزیہ، نیز ان کی تصنیفات کے محققانہ پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ ان میں ''سوانح مولانا روم'' کی تحقیقات کا ذکر بھی ہے۔ یہ ایک طویل مقالہ ہے باوجود اس کے ان کا خیال ہے کہ عدیم الفرصتی کی وجہ سے اس مقالہ کو پھیلا کر نہ لکھ سکا، اور بہت سی باتیں رہ گئیں۔ اس نمبر کے بعض اور مقالات میں بھی تحقیقات شبلی کی داد دی گئی ہے۔

اردو ادب کے مقابلہ میں شبلی نے فارسی ادب کی زیادہ خدمت انجام دی۔ فارسی شعر و ادب کی سب سے اہم تاریخ شعر العجم انہیں کے قلم سے نکلی۔ اس نمبر میں اس موضوع پر خاصی تحریریں ہیں۔ خود شعر العجم کے مطالعے پر دو مقالے شامل ہیں۔ پہلا مقالہ ماہر القادری [۱۹۰۶-۱۹۷۸ء] ایڈیٹر فاران کراچی کے قلم سے ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

''شبلی کے نقد و نظر کا کمال اور شاعرانہ ذوق کی بہار دیکھنی ہو تو شعر العجم کا مطالعہ کیجئے اور گلگشت مصلیٰ اور آب رکنا باد بن کر رہ جایئے۔ اس کتاب نے اردو کی آبرو بڑھائی ہے اور اسے ترقی و بلندی عطا کی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ لاکھوں اردو جاننے والوں کو شعر العجم نے فارسی زبان سے وابستہ رکھا ہے اور ان کے ذوق شاعری کو سنوارا ہے۔ ادبیات پر ہم نے پروفیسر براؤن اور ڈاکٹر رضا زادہ شفق کی معرکہ آراء کتابیں بھی پڑھی ہیں، مگر شعر العجم کی بات ہی اور ہے۔

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

شبلی نعمانی نے شعر العجم میں ایک ہزار سال کی ایرانی شاعری کا عطر کھینچ کر بھر دیا ہے۔ شبلی کی نگاہ جوہر شناس کو آفریں و مرحبا جس نے کیسے کیسے لعل و گہر کا انتخاب کیا ہے جن کی جوت سے آنکھوں کی روشنی بڑھتی ہے۔ شعر العجم کے مطالعہ سے شعر فہمی کا صحیح ذوق پیدا ہوتا ہے اور یہی اس کے مصنف کا اصل مقصود ہے۔

شعر العجم میں صرف شاعرانہ چٹخارے ہی نہیں ہیں بلکہ علم و ادب اور نفسیات کے نازک مسائل بھی ہیں۔ یہ کتاب شاعرانہ خطوط پر دل و دماغ کی تربیت کرتی ہے۔ اس کا مطالعہ تنہا ذوق و وجدان ہی کو آسودہ نہیں بناتا بلکہ پڑھنے والا اپنے دامن میں علم خیر کی ثروت بھی پاتا ہے۔ ڈیڑھ ہزار صفحات کی کتاب میں ایک صفحہ بھی ایسا نہیں ہے جو اکتا دینے والا ہو یا قاری اس سے جلد گذر جائے۔

ایں شرابیست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است

(ادیب شبلی نمبر ص ۱۰۷-۱۰۸)

اس تمہید کے بعد انہوں نے شعر العجم کے مشمولات اور خصوصیات و امتیازات کو واضح کیا ہے اور علامہ شبلی نے اشعار کی تشریح و تعبیر میں ایران کے خط و خال اور اس کے سبزہ زاروں اور قدرت کی صناعیوں کی جو منظر کشی کی ہے یا شعر و ادب اور نقد و انتقاد کے جو نکتے بیان کئے ہیں، ان کا ذکر کیا ہے۔ مقالے کے ذیلی عنوانات یہ ہیں:

شاعری کیا ہے، الفاظ اور خیال، تشبیہ و تخیل، آب و ہوا کا اثر، ایشیائی شاعروں کی کمزوری، یہ تذکرے، عربی شاعری کا اثر، غزل گوئی، تنقید، تصوف، شعروں کا ترجمہ، شعر العجم کی جامعیت، تاریخ و واقعات، دوسرا رخ وغیرہ۔

"تنقید شعر العجم" لکھ کر حافظ محمود شیرانی ایک بڑے محقق ہو گئے۔ ماہر القادری نے

ان کا اس مقالہ میں ذکر تک نہیں کیا ہے۔ البتہ خود انہوں نے شعر العجم کی بعض کمیوں کی نشاندہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''شبلی نے بیدل کو نہ صرف نظر انداز کیا ہے بلکہ اس کو گرایا ہے اور اسے لے جا کر ناصر علی کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ مرزا غالب نے شاعری کا انداز بالکل بدل دیا۔ ابتداء میں ''وہ بیدل کی پیروی کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ گئے تھے۔'' (حصہ پنجم ص ۲۱) حیرت ہے کہ وہ صائب سے متاثر ہیں مگر بیدل کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔

شبلی سے ہم توقع رکھتے تھے کہ وہ شعرائے متغزلین کے موازنے اور اظہار کمال میں تخیل کے لحاظ سے نظیری کو حافظ پر ترجیح دیں گے۔ شبلی شعروں کے انتخاب میں معجزہ دکھاتے ہیں مگر یہ شعر

طرز بے رحمان دیگر گشتہ بود الحق کہن
اختراع چند در نامہربانی کردہ است

انہوں نے کئی جگہ درج کیا ہے، حالانکہ اس کا مصرعہ ثانی بہت کمزور اور غیر شاعرانہ ہے۔

تصوف پر ایک جگہ علامہ شبلی نے تنقید کی ہے کہ ''اس مسئلہ کی تلقین کے وقت علم تصوف فلسفہ کے قریب آ جاتا ہے یعنی ہر چیز کی نسبت پیدا کر دیتا ہے۔ (شعر العجم ج ۵ ص ۱۵۸) مگر بہت سے مقامات پر وہ شعروں کی شرح اور تصوف کی تحسین کرتے ہوئے گذر گئے ہیں۔ حالانکہ دینی نقطہ نگاہ سے بعض صوفیانہ اشعار رمز و کنایہ کے پیرایہ میں اسی احتساب کے مستحق تھے اور یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ شبلی محمد حسین آزاد کی طرح صرف تذکرہ نگار اور ادیب نہیں ہیں، وہ سیرۃ النبیؐ اور الفاروق کے مصنف بھی ہیں۔

شعرالعجم میں مرزا غالب کا ذکر ضمناً آ گیا ہے حالانکہ غالب کا فارسی کلام
اس قابل تھا کہ اس پر ایک مستقل باب لکھا جاتا

مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

وجدان مکدر سا ہو جاتا ہے کہ شبلی نظم یا غزل کہنے کے بجائے جگہ جگہ غزل
لکھا اور نظم لکھنا استعمال کرتے ہیں۔ (ادیب شبلی نمبر ص ۱۲۶)

صاحب شعرالعجم کی ان کمزوریوں کے ذکر کے باوجود ان کا خیال ہے کہ:
''شعرالعجم بے راہ روی کے اس دور میں خضر راہ بن کر سامنے آتی ہے کہ
شعر کو اس طرح پرکھا جاتا ہے۔تنقید کا یہ اسلوب ہوتا ہے۔بات اس انداز
میں کہی جاتی ہے۔علمی مواد اور تاریخی واقعات تنقید میں اس عنوان سے
استعمال کرتے ہیں۔طنز کا یہ ڈھنگ اور تحسین کا یہ پیرایہ ہے۔لفظوں کو صحیح
طور پر یوں برتا جاتا ہے۔زبان کی سلاست و روانی تحریروں کو یوں دل
نشیں بناتی ہے۔شبلی پر سلام و رحمت ہو کہ وہ اردو کو صحیفہ ادب عطا کر
گئے۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۱۲۷)

یہ طویل مقالہ کتابی صورت میں شائع ہونے کے لائق ہے۔

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال [۱۸۹۴-۱۹۴۸ء] نے شعرالعجم کے امتیازات گنائے ہیں۔
انہوں نے اپنے مقالے پر ایک نوٹ لکھا ہے کہ ''اس مضمون میں شعرالعجم کے موضوعات و
مطالب پر کسی قسم کا تبصرہ یا تنقید کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ صرف اس امر کی وضاحت کی
گئی ہے کہ اس کتاب کے لکھے جانے سے اردو ادبیات میں کون سا قابل قدر اضافہ ہوا اور شبلی
نے اسے لکھ کر وقت کی کتنی بڑی ضرورت کو پورا کیا۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۲۸) اور ان کے
مقالے میں اسی کی تفصیل ہے۔ڈاکٹر شیخ محمد اقبال براؤن کے شاگرد تھے۔انہوں نے شعرالعجم
براؤن کو پڑھ کر سنائی تھی۔انہوں نے اپنے مقالے میں علامہ شبلی کی ان تین خصوصیات کا خاص
طور پر ذکر کیا ہے، جس کی وجہ سے علامہ شبلی شعرالعجم لکھنے میں کامیاب ہوئے۔ان کے نزدیک

تاریخ دانی، عربی دانی اور شعروسخن کا پختہ مذاق ایسے اوصاف ہیں جن سے شبلی پورے طور پر متصف تھے اور جو شعرالعجم کے مصنف کے لئے ضروری تھے۔ شبلی کی ان خصوصیات کا انہوں نے تفصیل سے ذکر کیا ہے اور ثبوت میں شعرالعجم سے اقتباسات پیش کئے ہیں۔ تاریخ دانی کے متعلق لکھا ہے کہ

> ''شبلی نے جس غائر نظر سے تاریخ اور بالخصوص تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے اس کو بیان کرنے کے لئے ایک الگ مقالہ درکار ہوگا۔ شعرالعجم سے میں بہت سی مثالیں پیش کرسکتا ہوں کہ شبلی نے اپنی تاریخ دانی کی وجہ فارسی شاعری کی خصوصیات اور ان کے اسباب کو کس قدر صحیح طور پر سمجھا۔''
>
> (ادیب شبلی نمبر ص ۱۲۹)

ادیب کے اس نمبر میں شبلی کی شعرفہمی کے ساتھ شعرگوئی پر بھی عمدہ مقالے شامل ہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے فارسی غزلوں پر تبصرہ کر کے علامہ شبلی کی غزل گوئی کی خصوصیات رندی وسرمستی، واردات حسن وعشق اور تصوف وغیرہ بیان کی ہیں۔ البتہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی [۱۹۲۴-۲۰۰۳ء] نے شبلی کی فارسی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

علامہ شبلی فارسی کے قادرالکلام اور صاحب دیوان شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کا حافظ کی غزلوں سے موازنہ کیا جاتا ہے۔ نظم گوئی کا معاملہ یہ ہے کہ اخلاقی، تاریخی اور واقعاتی نظموں کی ایجاد کا سہرا علامہ شبلی کے سر ہے۔ یہ تمام تفصیلات ان مقالات میں موجود ہیں۔ البتہ فارسی شاعری کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے سے تعارض نہیں کیا گیا ہے، حالانکہ شبلی کی فارسی شاعری کی انہوں نے جو بے ساختہ داد دی ہے اس کا جواب نہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''شاعری کے ذوق وفہم کا جو اعلا مرتبہ ان کے حصہ میں آیا تھا اس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔ ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں ان پر ختم ہوئی۔ کئی مرتبہ مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ شاعری پر پوری طرح متوجہ ہوتے تو ان کا وزن شعر فارسی میں غالب سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ پھر غالب جو کچھ

ہے تغزل و مدح کے محدود میدانوں میں ہے، لیکن مولانا نے فارسیت کے ذوق اعلیٰ کے تحفظ کے ساتھ فکر و تخیل کے نئے نئے میدان پیدا کئے، جن پر ان کی قومی نظمیں گواہ ہیں۔ خصوصاً حیدر آباد والی نظم۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا تنہا شاعر ہیں جنھوں نے فارسی شاعری کو اس کے اسلوب شعریت کے تحفظ کے ساتھ نئے میدانوں سے آشنا کیا۔ اس معاملے کی حقیقت اس وقت منکشف ہوتی ہے جب ایران کے نئے قومی شاعروں کے مہملات پڑھے جائیں جن کی ترتیب و اشاعت میں غریب براؤن نے اس قدر زحمتیں برداشت کی تھیں۔ آج کل ایران کے ملک الشعراء بہار ہیں۔ خدا ان کے کلام کے مطالعے کی بدمزگی سے محفوظ رکھے۔ غزل میں تو یقیناً مولانا کے یہاں غالب سے کہیں زیادہ سرجوشی کیفیت ہے اور حقائق و واردات کے لحاظ سے تو مقام ہی دوسرا ہے۔ مولانا کا ایک شعر سیکڑوں مرتبہ دہرا چکا ہوں لیکن پھر بھی بے اختیار دل کی گہرائیوں میں سے ابھر آتا ہے:

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبی ست سالک را
خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

میں جانتا ہوں کہ یہ شعر مولانا ہی کہہ سکتے تھے، کیونکہ اس کا تعلق ایک خاص کیفیت سے ہے۔ جب تک وہ طاری نہ ہو اس طرح کی صدا اٹھ نہیں سکتی۔ خواجہ حالی مرحوم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اس شعر پر گھنٹوں خود فراموشی رہی۔" (کاروان خیال ص ۹۴-۹۵)

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے اپنے مقالے کا آغاز پروفیسر خورشید الاسلام [۱۹۱۹-۲۰۰۶ء] کے اس مشہور جملے سے کیا ہے کہ "شبلی پہلے یونانی تھے جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو مصور ہوتے۔" ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے مشورہ دیا ہے کہ اس قول میں

اس قدر اضافہ کر لیجئے کہ وہ شاعر بھی تھے اور مصور بھی۔ ان کے قلم کی پرکاریاں ایک ماہر مصور کے برش کی باریکیوں سے کم نہیں۔ یہ چیز دیکھنا ہو تو ان کے کلام میں دیکھئے۔

(ادیب شبلی نمبر ص ۱۲۸)

بات شبلی کے فارسی کلام کی ہو اور ذکر عطیہ فیضی تک نہ پہونچے۔ یہ شاید ہمارے نقادوں کے اختیار میں نہیں ہے۔ مگر مولانا عبد السلام ندوی نے شبلی کی غزل گوئی کے ذکر میں ان کا نام تک نہیں لیا، لیکن ظہیر احمد صدیقی اس سے نہ بچ سکے، البتہ انہوں نے ایک نئی راہ نکالی اور بڑے پتے کی بات لکھی کہ ''شبلی حق وصداقت کا آئینہ تھے۔ انہوں نے کچھ چھپایا نہیں۔'' اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اس لایعنی بحث میں پڑ گئے یا اصل موضوع سے ہٹ گئے ہیں بلکہ انہوں نے شبلی کی شاعرانہ عظمت کی مثالیں ان کے کلام سے پیش کی ہیں اور بہت عمدہ تجزیہ کیا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی ایک بڑے مقالہ نگار تھے۔ انہوں نے سیکڑوں مقالے لکھے۔ ان کے مقالات کے آٹھ مجموعے ''مقالات شبلی'' کے نام سے شائع ہوئے۔ موضوعات کے لحاظ سے ان کی تدوین وترتیب مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک بڑا تدوینی کارنامہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مجموعہ مقالات اپنے موضوعات پر مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اپنے مقالہ ''شبلی کے مضامین'' میں قدرے تفصیل سے شبلی کی مقالہ نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ شبلی کے مقالات کی اہمیت، افادیت اور ان کے سماجی اور سیاسی افکار پر ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اچھی بحث کی ہے۔ ان کے اسلوب بیان کے تاریخی عوامل اور وسیع پس منظر کا بھی ذکر کیا ہے۔

علامہ شبلی کی انشا پردازی ہماری ادبی تاریخ کے مسلمات میں سے ہے۔ وہ بے نظیر انشا پرداز تھے۔ خشک موضوعات کو بھی اپنے شاداں وفرحاں اور رعنا قلم سے دل کش بنا دیتے تھے۔ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر سید ناصر حسین نے ان کی انشا پردازی کا جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے مضمون کا آغاز اس طرح کیا ہے:

''انیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک ایسا ادیب گذرا ہے جو بیک

وقت شاعر، مفسر، محدث، فقیہ، متکلم، مورخ، نقاد اور انشا پرداز تھا اور کم عمری
کی موت کے باوجود تصانیف کی اتنی کثرت ہے کہ ان کا کوئی ہم عصر
برابری نہیں کرسکتا۔ ان کا نام شبلی نعمانی تھا۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۲۲۴)

اس کے بعد انہوں نے شبلی کی زندگی کے چند واقعات اور علمی و فکری خیالات سے استدلال کر کے ان کی انشا پردازی کے مقام و مرتبہ کی تعیین کی کوشش کی ہے۔ لیکن اصل موضوع پر انہوں نے کم ہی لکھا ہے۔ غیر ضروری باتیں اس مقالہ میں زیادہ راہ پا گئی ہیں۔ اگر انہوں نے نثر شبلی کے چند عمدہ اقتباسات بھی نقل کر دئے ہوتے تو شاید موضوع کا کسی قدر حق ادا ہو جاتا۔ اس سے بہتر بعض دوسرے مقالہ نگاروں نے شبلی کی انشا پردازی پر روشنی ڈالی ہے۔

شبلی کی علمی عظمت کا جس کتاب سے سب سے پہلے آوازہ بلند ہوا وہ ان کی سوانحی تصنیف المامون ہے۔ پھر انہوں نے سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم وغیرہ بلند پایہ سوانحی کتابیں لکھ کر سوانح نگاری کے میدان میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندوی [۱۹۱۸-۲۰۰۶ء] نے ان کی سوانح نگاری کا جائزہ لیا ہے اور ان کی سوانح نگاری کی چند اہم اور بنیادی خصوصیات کا ذکر ان کی تحریروں کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک علامہ شبلی کی سوانح نگاری کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مقصدیت پر مبنی ہوتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے علامہ شبلی کی سوانحی کتب کے مقاصد جو خود علامہ شبلی نے بیان کئے ہیں، ان سے استدلال کیا ہے۔ علامہ شبلی کی سوانح نگاری کی دوسری خصوصیت درایت کو قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ علامہ شبلی اپنی تمام سوانحی کتب میں درایت کا بہت اہتمام کرتے ہیں۔ ان کی تیسری خصوصیت پس منظر اور پیش منظر کا بیان کرنا بتایا ہے۔ اس کی چند مثالیں بھی نقل کی ہیں۔ محنت و جستجو، عالمانہ شان، متانت و وقار، ایجاز و اختصار اعتدال و توازن اور انشاء پردازی وغیرہ کو بھی انہوں نے شبلی کی سوانحی کتب کا طرہ امتیاز قرار دیا ہے۔ درایت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''علامہ شبلی کی سوانح نگاری اس حیثیت سے بھی اپنے معاصرین میں ممتاز
ہے کہ وہ کسی واقعہ کو نہ تو صاحب سوانح کی عظمت و عقیدت کی وجہ سے مان

لیتے ہیں اور نہ محض اس بنا پر اسے تسلیم کرتے ہیں کہ کسی تاریخ یا تذکرے میں خواہ وہ کتنا ہی معتبر کیوں نہ ہو اس کا ذکر ملتا ہے، بلکہ وہ روایت کے ساتھ درایت سے بھی واقعہ کی جانچ پڑتال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بعض غلط فہمیاں بھی دور ہو جاتی ہیں اور عقیدت کے غلو کا بھی سد باب ہو جاتا ہے۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۵۵)

اسی انداز میں انہوں نے علامہ شبلی بعض کی دوسری خصوصیات کا بھی ذکر کیا ہے۔ پس منظر اور پیش منظر کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''انہوں نے ذاتی حالات وواقعات بیان کرتے ہوئے ان کے پس منظر اور پیش منظر دونوں کو سامنے رکھا ہے۔ وہ ماضی پر سیاسی، تمدنی اور معاشرتی حیثیت سے بھی بحث کرتے ہیں اور واقعات کے علل واسباب کا کھوج بھی لگاتے ہیں، ان کی غلطیوں کی پردہ دری بھی کرتے ہیں اور بعض چھپی ہوئی حقیقتوں کی پردہ کشائی بھی۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۵۵)

اپنے نقطہ نظر کی تائید میں مولانا مجیب اللہ ندویؒ نے شبلی کی سوانحی کتب سے متعدد اقتباسات نقل کیے ہیں، لیکن انہوں نے صرف خوبیاں ہی نہیں گنائی ہیں بلکہ بعض کمیوں اور کمزوریوں بھی ذکر کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بعض واقعات کے اخذ نتائج میں ان سے غلطی ہوئی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے غزوہ بدر کے اسباب کا ذکر کیا ہے چونکہ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ راقم کی تصنیف آثار شبلی میں بھی اس کا ذکر ہے، اس لئے اس سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

ان کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ علامہ شبلی نے قومی جذبے کو اسلامی حمیت پر فوقیت و ترجیح دی ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ سیرۃ النبیؐ کے علاوہ ان کی تمام سوانحی کتب، جذبہ قومی کا نتیجہ تھیں، لیکن حضرۃ الاستاذ کے اس خیال سے اس لئے اتفاق ممکن نہیں کہ جو شخص شعر العجم کا آغاز بھی اسلام ایک ابر کرم تھا اور ہر خطے پر برسا، سے کرتا ہو اس کے اسلامی جذبات میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے اور پھر اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو المامون، سیرۃ النعمان اور الفاروق کی تصنیف

میں قومی جذبہ کیا ہو سکتا ہے۔؟

علامہ شبلی ایک بڑے نقاد تھے۔ ان کی تنقیدی بصیرت کا ذکر کئی مقالات میں ہوا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی [۱۹۲۰-۱۹۹۸ء] جن کی تنقید اور تاریخ التنقید پر گہری نظر تھی۔ انہوں نے شبلی کی تنقید نگاری کا مفصل جائزہ لیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> شبلی اردو کے ممتاز نقاد ہیں۔ انہوں نے اردو میں تنقید کی داغ بیل ڈالی۔ ان کے ساتھ آزاد اور حالی بھی اس سلسلے میں پیش پیش رہے۔ اردو ادب میں تنقید کے علم برداروں کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ شبلی کی تنقید کا انداز ان دونوں نقادوں سے مختلف ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی ایک مخصوص انفرادیت رکھتی ہے اور اس نے اردو تنقید کو ایک نئے انداز سے آشنا کیا۔ (ادیب شبلی نمبر ص ۲۰۸)

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے شبلی کی تنقیدی کتب شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر اور بعض تنقیدی مقالات میں جہاں جہاں تنقیدی پہلو ہیں ان کی نہ صرف نشاندہی کی ہے بلکہ نظری اور عملی تنقید کے ہر پہلو کو پیش نظر رکھ کر ان کی تنقیدی بصیرت واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ علامہ شبلی کا خاص میدان شاعری کی تنقید ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے خاص طور پر اس کا تجزیہ کیا ہے اور نہ صرف تنقید نگاری کا تجزیہ کیا ہے بلکہ شبلی کے نظریہ تنقید کی وضاحت کر کے اس کی اہمیت پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور آخر میں وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ

> ''اردو تنقید کی روایت میں ان کی تنقید نگاری اپنا ممتاز مقام رکھتی ہے۔ انہوں نے اس زمانے میں تنقید کی طرف توجہ کی جب اس میں تنقید کی روایت عام نہیں تھی۔ ان کا زمانہ تنقیدی اعتبار سے اہم زمانہ ہے۔ حالی اور آزاد نے اس زمانے میں تنقید کا ماحول پیدا کیا۔ شبلی کی تنقیدی تحریریں بھی اس میں برابر کی شریک ہیں۔ انہوں نے نظریاتی اور عملی دونوں اعتبار سے اردو تنقید میں اضافہ کیا ہے۔ ان کی تنقید تجزیاتی نہیں ہے۔ اسی لئے

اس میں گہرائی کم ہے، لیکن تشریحی اور تاثراتی انداز میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں تنقید کا ایک اسلوب پایا جاتا ہے جس سے اردو تنقید اب تک نا آشنا تھی۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۲۱۷)

بلاشبہ شبلی کی تنقید تجزیاتی نہیں ہے لیکن شبلی کے یہاں گہرائی کی کمی نہیں، دراصل تجزئے کی کمی کی وجہ سے یہ رائے قائم کرلی گئی ہے۔ بنظر غائر دیکھا جائے تو تجزئے کی کمی اور اسلوب بیان کی بلاغت نے تنقیدات شبلی میں اور تعمق پیدا کردیا ہے۔ شبلی کا عہد تنقید میں تجزئے کا عہد نہیں تھا اس لئے تجزئے کی تلاش وجستجو درست نہیں۔

اردو کے ایک اور اہم نقاد ڈاکٹر سید احتشام حسین [۱۹۱۲-۱۹۷۲ء] نے موازنہ انیس و دبیر پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ انہوں نے نہ صرف موازنہ کی اہمیت پر گفتگو کی ہے بلکہ اس کی تنقیدی حیثیت بھی اجاگر کی ہے، البتہ وہ ایک اشتراکی نقاد اور ترقی پسندیت کے علمبردار تھے، گویا ان کی تنقید کا پیمانہ ہی دوسرا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں موازنہ انیس و دبیر میں متعدد کمیاں نظر آئیں۔ ان کے بعض تجزیوں اور نتائج سے اختلاف کی گنجائش پورے طور پر موجود ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

> ''اگر یہ کتاب ذرا اور غور وفکر سے لکھی گئی ہوتی، ابواب کی ترتیب و تنظیم بہتر ہوتی محض مثالوں کے سہارے خصوصیات کو واضح کرنے کی کوشش کے بجائے تنقیدی تجزیہ سے بھی کام لیا گیا ہوتا، مرثیہ نگاری کا جائزہ بحیثیت فن کے لیا جاتا اور انیس و دبیر کے تقابلی مطالعہ کو ذرا اور بھرپور شکل میں پیش کیا گیا ہوتا، اصول شاعری کے متعلق جو مباحث چھیڑے گئے ہیں ان پر ذرا منطقی اور استدلالی رنگ میں بحث کی گئی ہوتی تو موازنہ کی اہمیت اور زیادہ ہو جاتی۔ لیکن اپنی موجودہ حالت میں بھی یہ تصنیف اردو تنقید کے ارتقا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔''
>
> (ادیب شبلی نمبر ص ۱۰۶)

مہدی حسن افادی علامہ شبلی کے خاص احباب میں تھے اور وہ ان کی ہر ادا پر فدا و فریفتہ تھے۔ انہوں نے شبلی کو ہندوستان میں تاریخ کا معلم اول اور شعر العجم کو تنقید عالیہ کا بہترین نمونہ لکھا ہے۔ وہ شبلی کے ادب و انشاء کو بے حد پسند کرتے تھے۔ ان کے نام شبلی کے متعدد خطوط ''مکاتیب شبلی'' میں شامل ہیں۔ خود ان کے شبلی کے نام کئی خطوط ''مکاتیب مہدی'' میں شامل ہیں۔ غرض ان دونوں میں بڑے گہرے اور رنج کے مراسم رہے۔ پروفیسر آفاق احمد اور پروفیسر عبدالاحد خاں خلیل نے مہدی افادی سے ربط و تعلقات اور شیفتگی کی داستان لکھی ہے۔ پروفیسر آفاق احمد نے شبلی کے متعلق مہدی افادی کے مجموعہ مضامین ''افادات مہدی'' سے چند اقتباسات پر تبصرہ کیا ہے۔ البتہ پروفیسر عبدالاحد نے شبلی و مہدی کے مزاج و مذاق کے اشتراک و اتحاد، ایک دوسرے سے قرب و تعلق، اخلاص و عقیدت نیز ادبی افکار و نظریات کی یکسانیت وغیرہ کی ایک ایک تفصیل قلم بند کی ہے اور بڑی گہرائی و گیرائی سے دونوں کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے۔

ایک مضمون میں علامہ شبلی سے ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی کی عقیدتوں کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ''سلوک سلیمانی'' کے مصنف اور سید صاحب کے ایک مسترشد مولانا غلام محمد کے قلم سے ہے۔

سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] مایہ ناز عالم و مصنف، محقق و مورخ، ادیب و نقاد، ماہر تعلیم، سیرت نگار اور علامہ شبلی کے جانشین تھے۔ انہوں نے دین و ملت کی بڑی خدمات انجام دیں۔ علامہ اقبال نے انہیں بجا طور پر ''علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد'' قرار دیا تھا۔ (مشاہیر کے خطوط ص ۱۳۴)

علامہ شبلی سے ان کو بے پناہ محبت و عقیدت تھی بلکہ ایسی مثالی محبت تھی کہ اس کی نظیر شاید ہی مل سکے۔ اس تعلق کا آغاز دور طالب علمی میں اس وقت ہوا جب علامہ شبلی حیدر آباد کے صیغہ علوم و فنون کی نظامت کو خیر باد کہہ کر ندوہ تشریف لائے۔ اس موقع پر طلبائے ندوہ نے استقبالیہ جلسہ منعقد کیا۔ سید صاحب نے ایک فارسی قصیدہ سے ان کا استقبال کیا۔ جس کے

ایک مصرعے سے عقیدت وشیفتگی نمایاں ہے۔

ندوہ میں علامہ شبلی نے ان کی تعلیم وتربیت کی طرف خاص توجہ دی۔ تصنیف وتالیف کے لئے تیار کیا اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے اندر تصنیف وتالیف کا ایک بیکراں جذبہ پیدا کردیا۔ ندوہ میں ان سے متعدد طلبہ نے علمی تشنگی بجھائی مگر سچ تو یہ ہے کہ کوئی بھی مولانا سید سلیمان ندوی کے مرتبے کو نہ پہنچ سکا۔

علامہ شبلی کی وفات کے بعد ان کے ادھورے کاموں کی تکمیل میں سید صاحب نے اپنا سب کچھ نچھاور کردیا۔ اور سب صلاحیتیں فکر شبلی کی توسیع وترجمانی میں لگادیں۔ سیرۃ النبی اور دارالمصنفین شبلی کی اخیر زندگی کے دو بڑے خواب تھے۔ ان کو انہی نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ یہی نہیں انہوں نے شبلی کی تمام تصنیفات کو اہتمام سے شائع کیا۔ ان کی ایک ایک تحریر جمع کی اور مرتب کر کے شائع کیا۔ ماہنامہ معارف جاری کر کے شبلی کی یہ خواہش بھی پوری کی۔ غرض شاگردی کا حق ادا کردیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی زندگی میں بڑے نشیب وفراز آئے، دارالمصنفین کو خیرباد کہنا پڑا، حضرت تھانوی سے بیعت ہوئے۔ خلافت واجازت پائی، ہندوستان سے ہجرت اور پاکستان میں قیام کرنا پڑا، مگر کسی حال میں استاذ سے عقیدت میں کمی نہیں آئی۔

مولانا غلام محمد نے اپنے مقالہ میں سید صاحب کی شبلی سے عقیدت کے چند واقعات جمع کئے ہیں۔ یہاں دو واقعات نقل کئے جاتے ہیں:

۱۔ ایک مرتبہ سید صاحب نے فرمایا کہ

''مولانا شبلی علیہ الرحمہ کے وصال کا صدمہ اتنا سخت تھا کہ مجھ کو اپنی زیست کی توقع نہ تھی۔ خود دیکھنے والوں کا کہنا بھی یہ ہے کہ مولانا کے عزیزوں پر بھی اس قدر اثر نہ تھا۔ میری حالت یہ تھی کہ وفور غم سے خود احساس غم بھی فراموش ہوگیا تھا اور مولانا کا تصور اس درجہ قائم رہتا تھا کہ کتاب کا مطالعہ کرتے وقت جب کوئی مقام حل طلب آتا تو کتاب لے کر مولانا کے

کمرے کی طرف چل پڑتا کہ اپنے استاذ سے اس کو حل کرالوں گا۔ مگر کمرے کے قریب پہنچ کر جب خیال آتا کہ وہ تو رخصت ہو چکے ہیں تو دل پر سخت چوٹ لگتی اور مایوس ہو کر لوٹ آتا۔ پھر دیر تک کسی کام کے لائق نہیں رہتا تھا۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۳۳۳)

۲۔ بعضے لوگ علامہ شبلی کو ادیب و مورخ کی حیثیت سے سراہ کران کی عالمانہ عظمت کو گراتے ہیں۔ جب کبھی کوئی ایسی بات سید صاحب کے سامنے آتی تو بڑے اثر و قوت کے ساتھ فرمایا کہ

''ہمارے مولانا شبلی فرمایا کرتے تھے کہ تاریخ تو ہمارے دسترخوان کی چٹنی ہے۔ ہم جو چیز کھلانا چاہتے ہیں اس کو اس کے ذریعہ سے مرغوب بناتے ہیں۔ چنانچہ مولانا شبلی نے پورے شعور اور قصد وارادہ سے اس دور میں تاریخ کو اسلامی تعلیمات کے پھیلانے کا ذریعہ بنایا اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۱۳۴)

پروفیسر غلام محمد صاحب نے سید صاحب کی ذاتی ڈائری کے حوالہ سے ایک اور اہم واقعہ لکھا ہے، جس سے علامہ شبلی کی عظمت واضح ہوتی ہے۔ چونکہ یہ واقعہ ادیب شبلی نمبر کے علاوہ شاید کہیں اور نہیں لکھا گیا ہے اس لئے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

''میں نے اپنی آنکھوں سے حضرت سید صاحب کی ایک چھوٹی سی ڈائری دیکھی جس میں انہوں نے اپنے مرشد اقدس (حضرت تھانویؒ) رحمۃ اللہ علیہ سے سنے ہوئے چند ملفوظات قلم بند فرمائے ہیں۔ پہلا ملفوظ یہ ہے:

(حضرت تھانویؒ نے) فرمایا کہ کان پور میں مولانا شبلی کا لکچر ہوا، اہل علم کاغذ لے کر بیٹھ گئے تاکہ اہم باتیں نوٹ کرلیں، اس محفل میں مولانا (شبلی) کے استاذ فاروق چریا کوٹی بھی تھے۔ شبلی صاحب کا لکچر اپنے انداز کا ہوا اور تحسین وآفریں ہر طرف سے ہوئی مگر وہ جب اپنے استاذ کے

پاس آکر بیٹھے تو انہوں نے کہا کہ ذرا میرا پاؤں دبادو، مولانا شبلی بلا تکلف اپنے معتقدین کے مجمع میں استاذ کے پاؤں دبانے لگے۔اس سے معلوم ہوا کہ ان میں تکبر بالکل نہ تھا۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۳۳۴)

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی نے شبلی پر سرسید احمد خاں کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ انہوں نے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ تعقل، آزادی رائے، شاعری، نثر نگاری وغیرہ میں شبلی پر صاف اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ بلاشبہ شبلی پر سرسید کے اثرات مرتب ہوئے اور واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ کی فضا ہی نے انہیں پر پرواز عطا کی۔ مگر مقالہ نگار نے اثرات سرسید کی نشاندہی میں مبالغے سے بھی کام لیا ہے اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ شبلی کو اگر سرسید کی صحبت نہ ملتی تو شبلی شبلی نہ ہوتے کچھ اور ہوتے۔ (ادیب شبلی نمبر ص ۳۵۳) مگر یہ حقیقت نہیں کیونکہ سرسید کی صحبت بہت سے لوگوں کو میسر آئی پھر ان میں شبلی کون بن سکا۔؟

شبلی و اکبرالہ آبادی میں گہرے مراسم تھے۔ اکبر نے اپنے اشعار میں شبلی کا متعدد بار ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی نے شبلی کے بارے میں اکبر کے خیالات کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

''اس خطرہ کو جو مغربی سیلاب کی ہر لہر کے ساتھ روز بہ روز بڑھتا جارہا تھا شبلی نے سب سے پہلے محسوس کیا اور اس کے تدارک کی تدبیروں میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ شبلی کی یہی ادا تھی جو اکبر کو بھائی اور کچھ ایسی بھائی کہ وہ بارہا اس کا اعتراف کئے بنا نہ رہ سکے۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۳۲۹)

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اکبرالہ آباد علی گڑھ تحریک کو پسند نہ کرتے تھے۔ البتہ اس تحریک کے ایک اہم رکن علامہ شبلی نعمانی کو دل سے پسند کرتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

''سرسید کے رفقاء میں اکبر کو صرف شبلی ہی کی ذات ایسی نظر آئی جو اعتماد کے قابل ہے۔ جس سے راز کی باتیں اور دل کا حال کہا جاسکتا ہے، اس

اعتماد کے وجوہ کیا ہیں انہیں اکبر کے اس خراج عقیدت میں تلاش کر لیجیے:

ایڈیٹر بول اٹھے دیکھ کر شبلی کے فوٹو کو
اسی کے دم سے اب زندہ ہے مشرق کا کتب خانہ

کہنا جو کچھ ہے مجھ کو وہ کہنے دیں
دینی علموں کی موج کو بہنے دیں
شبلی کی دعا بتان مغرب سے ہے یہ
ندوہ کو حضور قبلہ رخ رہنے دیں

شبلی کا قلم علم کی منزل پہ جما ہے
رفتار پر آزر کی قدم ان کا تھما ہے
چمکی ہوئی ہے بزم سلف اس کے بیاں سے
روشن ہیں یہ معنی کہ وہ شمس العلما ہے

لفظوں میں اجتماع نہ معنی میں نور ہے
ویران آج کوچہ بین السطور ہے
شبلی کا خامہ صفحہ ہستی سے اٹھ گیا
اب آہ! سادہ لوح دل نا صبور ہے

(ادیب شبلی نمبر ص ۳۳۱-۳۳۲)

محمد مقتدی خاں شروانی نے شبلی کی نازک مزاجی اور نازک خیالی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے سرسید و شبلی کے دور کے علی گڑھ کو دیکھا تھا۔ شبلی کی حساسیت کے انہوں نے کئی واقعات لکھے ہیں جن کا ذکر کئی اور تذکروں میں بھی ملتا ہے۔

خان بہادر شیخ عبداللہ اور ڈپٹی حبیب اللہ نے علامہ شبلی کی یادوں کو اپنے مضامین میں سمیٹا ہے۔ ان میں چند بڑی اہم باتیں آگئی ہیں۔ ان کا ذکر البصیر کے شبلی نمبر آچکا ہے۔ اس سلسلے کا ایک اور مضمون ضیاء الدین برنی کے قلم سے ہے۔ اس کا عنوان ''شبلی چند یادیں'' ہے۔ برنی صاحب کے علامہ شبلی سے روابط تھے۔ شبلی انہیں سیرت کے اسٹاف میں شامل ہونے کی پیش کش کی تھی۔ انہوں نے اپنی یادوں کو اس میں بیان کیا ہے۔ یہ مضمون ان کی کتاب عظمت رفتہ میں بھی شامل ہے۔ اس مقالے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ شبلی نے خواجہ حسن نظامی کی فرمائش پر دہلی میں تصوف پر ایک تقریر کی تھی۔ جس کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن نے علامہ شبلی کے حالات اور کارناموں کو تفصیل سے لکھا ہے، اس میں شبلی کی پوری زندگی کا ایک خاکہ آگیا ہے۔ آخر میں لکھا ہے کہ

''اوپر جو کچھ لکھا گیا وہ ایک جامع الفنون اہل قلم، بے مثال انشاپرداز، اور شیریں کلام شاعر کا محض ایک سرسری خاکہ ہے۔ ان کی اصلی تصویر حیات شبلی میں ملے گی، جس کو استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھ کر اردو کو اپنے احسان سے گراں بار کیا ہے۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۲۷۶)

پروفیسر عبدالمغنی [۱۹۳۶-۲۰۰۶ء] سابق وائس چانسلر ایل، این، متھلا یونیورسٹی نے شبلی وحالی کی تحریکیت کی وضاحت کی ہے۔ اس مقالہ کے ذیلی عناوین یہ ہیں

تقابل کی نوعیت اور مقصد، شبلی وحالی کے کاموں کا پس منظر اور محرک، اسلامی جدو جہد کا تقاضا، شبلی وحالی، ملکی وقومی میدان میں، ہیروز آف اسلام، جدوجہد کا ایک عملی مظہر۔ اس کا ماحصل یہ ہے:

''شبلی وحالی نے اپنے اپنے کردار اور ماحول کے حدود میں اسلامی جدو جہد کو آگے بڑھایا۔ ہمیں ودنوں کی شخصیتوں اور کارناموں سے استفادہ کرنا ہے لیکن یہ حقیقت اب عیاں ہوگئی ہے کہ بیسویں صدی کے ہندوستان میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کا معمار اول نہ حالی ہوسکتے ہیں اور نہ

سرسید، وہ صرف شبلی کی ذات ہے۔ اس سلسلے میں انہیں کا موقف صحیح اور مرکزی ثابت ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ قدرت نے شبلی ہی کی روایت کو آگے بڑھانے کے لئے ابوالکلام آزاد اور سید سلیمان ندوی کو مہیا کیا، جن کے بعد اس مشعل کو ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔''

(ادیب شبلی نمبر ص ۳۵۹)

علامہ شبلی کا ایک منفرد اسلوب نگارش تھا۔ اس کا ذکر اور اس کی خصوصیات کا ذکر کئی مقالوں میں آیا ہے مگر اس پر دو مستقل مضامین اس نمبر میں شامل ہیں۔ پہلا مضمون ''شبلی کا طرز تحریر'' ان کے ایک ممتاز شاگرد مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے ہے۔ انہوں نے علامہ شبلی کے طرز تحریر کی چار بنیادی خصوصیات روانی، فارسی ترکیبیں، ایجاز و اختصار، متانت و وقار کا تجزیہ کیا ہے اور روانی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''اردو زبان میں سلاست وروانی کی ابتدا اگر چہ سرسید نے کی اور ان کے عہد کے ممتاز مصنفین مثلاً مولانا حالی، مولوی محمد حسین آزاد، مولانا نذیر احمد اور نواب محسن الملک نے اس آب رواں میں کشتیاں چلائیں لیکن جب ان بزرگوں کے طرز تحریر کا مقابلہ مولانا (شبلی) کے طرز تحریر سے کیا جاتا ہے تو مولانا کے صریر قلم سے یہ صدا آتی ہے:

موج ہر موج شکستم چو بہ عماں رفتم

مولانا نے ہر قسم کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے بزرگان اسلام کے حالات لکھے ہیں، انہوں نے خلفاء وسلاطین کی سوانح عمریاں لکھیں ہیں، انہوں نے علم کلام کے دقیق مسائل کی تشریح کی ہے، انہوں نے شعراء کے حالات قلم بند کئے ہیں، انہوں نے شعراء کے کلام پر ریویو اور ان کا باہمی موازنہ کیا ہے، انہوں نے یونانی منطق کی غلطیاں نکالی ہیں، انہوں نے ترجمے کئے ہیں، انہوں نے قومی، ملکی، سیاسی غرض ہر قسم کے

مضامین لکھے ہیں، اور سب سے آخر میں اس مقدس زندگی کو اپنا موضوع قرار دیا جہاں ایک مطلق العنان شاعر بھی مرعوب ہو کر پکار اٹھتا ہے:

آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قلم را

لیکن بایں ہمہ اختلاف وتنوع عبارت کی روانی میں کہیں فرق نہیں آنے پایا ہے۔روانی اور بزرگوں کی تحریر میں بھی موجود ہے لیکن برجستگی ایک ایسا وصف ہے جو روانی عبارت کی آخری حد ہے اور وہ مولانا کے سوا کسی بزرگ کی تحریر میں نہیں پایا جاتا۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۱۸۶)

دوسرا مقالہ ''شبلی کا اسلوب بیان'' ایک اور شبلی شناس ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے قوت، جوش، احساس، ایجاز، اختصار، شعریت، بے ساختگی، طنز وتعریض کو ان کے اسلوب بیان کا وصف قرار دیا ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے پہلے حیات شبلی لکھی تھی جو اب تک غیر مطبوعہ ہے۔اس کا اصل دار و مدار مکاتیب شبلی پر تھا، پھر مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھی۔انہوں نے بنیادی طور پر مکاتیب شبلی ہی پر انحصار کیا ہے۔شبلی کے خطوط واقعی ہماری قومی تاریخ کے بہت سے اہم واقعات کا خزانہ اور بقول پروفیسر خورشید الاسلام قومی اعمال نامہ ہیں۔ان خطوط کی روشنی میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی [۱۹۰۳-۱۹۷۴ء] نے شبلی کی شخصیت، عظمت اور ان کے بعض کارناموں کی اہمیت و افادیت اجاگر کی ہے۔اس کے درج ذیل عناوین سے مقالہ نگار کے گہرے مطالعہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ادب وانشاء، ظرافت کی چاشنی، شاعری کے نکتے، مولانا شبلی بحیثیت محقق، کتابوں کا مطالعہ، سیاسی مسلک۔مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس مقالہ کو سراہا ہے۔

احرار نقوی نے بھی انہیں خطوط کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ان کے مقالے کا عنوان ہے ''شبلی: شخصیت اور خطوط''۔انہوں نے شبلی کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں کا ذکر خطوط کے حوالہ سے کیا ہے۔اور خطوط پر فنی حیثیت سے بھی بحث کی ہے۔ان کا خیال ہے کہ پروفیسر

خورشید الاسلام کی یہ راے درست ہے کہ شبلی کے خطوط ہمارا قومی اعمال نامہ ہیں۔ان کے بعض خیالات سے اگرچہ اختلاف کی گنجائش ہے تاہم اس خیال سے بالکل اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ وہ فنی اور تنقیدی اعتبار سے صحیفہ ادب ہیں۔(ادیب شبلی نمبر ص ۲۶۷)

علامہ شبلی کے خطوط کے حوالہ سے مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا سید سلیمان ندوی اور چند دیگر اہل قلم نے شبلی کی بوقلموں شخصیت کا ذکر کیا ہے، تاہم انہیں خطوط سے شبلی کی شخصیت کو مجروح بھی کیا گیا اور ایسا ویسا مجروح نہیں کیا گیا بلکہ یہ کوشش کی گئی کہ علامہ شبلی کی ہستی ہی مٹا دی جائے۔ پروفیسر سید نواب علی [م:۳۰رجون ۱۹۶۱ء] نے انہیں خطوط سے شبلی کی رومانی زندگی کا سراغ لگایا ہے۔انہیں میں شبلی کے ایک شاگرد مولوی عبدالحق نے خلوص ومحبت کی بو سونگھی تھی جس کی بنیاد پر امین زبیری نے اپنی تحریر کو شبلی کی رنگین زندگی کا عنوان دیا اور انہیں کی بنیادوں پر شبلی کی حیات معاشقہ سپرد قلم کی گئی۔لیکن انہیں خطوط کی روشنی میں ڈاکٹر ابن فرید نے اس الف لیلوی داستان کی بے سروپائی اور ناروا الزام تراشیوں کے سارے فضول قصوں کا سدباب بھی کیا۔جس کا خلاصہ یہ ہے کہ امین زبیری، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر وحید قریشی اور شیخ محمد اکرام نے شبلی کی تحریروں کا صحیح نقطہ نظر سے مطالعہ نہیں کیا، سیاق وسباق کا بھی خیال نہیں رکھا بالقصد غلط معنی ومفہوم اور نتائج نکالے، تحریروں کے نقل کرنے میں دیانت سے کام نہیں لیا وغیرہ۔یہ تمام باتیں ڈاکٹر ابن فرید نے مضبوط دلائل سے لکھی ہیں۔

(ادیب شبلی نمبر ص ۲۶۸-۳۰۳)

ڈاکٹر ابن فرید سنجیدہ ادیب ونقاد اور باشعور ادیب تھے۔انہوں نے نفسیات کے نام پر ادبی بے راہ روی میں راستی سے قدم ڈگمگانے نہیں دیا۔ان کا مقالہ ''شبلی چوں بہ خلوت می رود'' اس شبلی نمبر کا حاصل ہے۔اس میں انہوں نے مخالفین شبلی کا جواب انہیں کے اسلوب اور انہیں کے انداز میں دیا ہے۔نفسیاتی تنقید کے نام پر ڈاکٹر وحید قریشی نے جو افسانہ گھڑا تھا جسے ان کے ہم خیالوں نے افسانہ بزم وانجمن بنادیا۔ڈاکٹر ابن فرید نے ثابت کیا کہ یہ واقعی افسانہ ہے۔

ڈاکٹر ابن فرید نے خطوط شبلی، دستہ گل اور بوئے گل کے حوالے سے اٹھنے والی

ہر مخالف آواز پر توجہ دی ہے مگر ڈاکٹر عبداللطیف اعظمی نے ''شبلی کے معتقد و منتقد'' میں چار منتقدین اور چار معتقدین کی کتابوں کا جائزہ لیا ہے اور تنقید و تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ منتقدین میں ڈاکٹر وحید قریشی کی حیات معاشقہ، شیخ محمد اکرام کی ''موج کوثر'' اور ''شبلی نامہ'' اور محمد امین زبیری کی ذکر شبلی شامل ہیں اور معتقدین میں مولانا سعید انصاری کی مولانا شبلی اردو کے بہترین انشا پرداز، خود ان کی کتاب مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی کی کتاب شبلی ایک دبستان اور مولانا سید سلیمان ندوی کی حیات شبلی شامل ہیں۔

عبداللطیف اعظمی نے مذکورہ کتابوں کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ امین زبیری، ڈاکٹر وحید قریشی اور شیخ محمد اکرام کے ایک ایک اعتراضات نقل کر کے ان کے جوابات دئے ہیں۔ ان کی بے اعتدالیوں، بے جا الزام تراشیوں، اور غلط بیانیوں کا جائزہ لے کر مضبوط دلائل سے ثابت کیا ہے کہ وہ سب بے بنیاد اور لغو ہیں۔ انہوں نے منتقدین کی کتابوں کے محض نقائص ہی واضح نہیں کئے ہیں بلکہ ان کی علمی کمزوریوں اور تصنیفی کمیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ شیخ محمد اکرام کے بارے میں لکھا ہے کہ

> ''شیخ محمد اکرام کا ذہن اس قدر الجھا ہوا ہے کہ ان پر تفصیل سے تبصرہ بہت مشکل ہے۔ الم غلم جو بات بھی ان کے ذہن میں آتی ہے لوح و قلم کے حوالے کر دیتے ہیں۔ چاہے اس سے خود ان کے بیان کردہ واقعات و حالات ہی کی تردید کیوں نہ ہوتی ہو، اور جو خیال بھی بیان کرتے ہیں پوری انتہا پسندی کے ساتھ کرتے ہیں، اس کی وجہ سے شبلی نامہ تضاد، تکرار اور افکار پریشاں کا مجموعہ ہو کر رہ گیا ہے۔ موج کوثر میں بھی اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً صفحہ ۲ پر لکھتے ہیں:
>
> ''دار المصنفین آج قدیم اسلامی علوم کی اشاعت کا ایک اہم مرکز ہے اور اگرچہ ندوہ کا چراغ مدھم پڑ گیا ہے لیکن اس سے تیل لے کر اعظم گڑھ میں جو شمعیں جلائی گئی تھیں وہ برابر ضوفشاں ہیں۔

اب ذرا صفحہ ۲۷۲ ملاحظہ ہو:

معارف قدامت پرستی کا سب سے بڑا ترجمان اور دارالمصنفین رجعت پسندی کا سب سے بڑا (اعظم) گڑھ ہے۔ (ادیب شبلی نمبر ص ۷۹)

اس طرح کی اور بھی انہوں نے مثالیں دی ہیں۔ اسی طرح محمد امین زبیری کی کتاب ذکر شبلی کا بھی تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اور انہیں علی گڑھ کا بے جا طرف دار بتایا ہے۔ دیگر کتابوں کا بھی انہوں نے اچھا تجزیہ کیا ہے۔ سب سے آخر میں حیات شبلی کے بارے میں اپنے خیالات لکھے ہیں۔ اسے ایک بہترین سوانح عمری اور علامہ شبلی کی سچی تصویر قرار دیا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی سوانح نگاری کی بھی تحسین وستائش کی ہے۔ البتہ وہ اس بات سے خوش نہیں کہ حیات شبلی میں عطیہ فیضی کا ذکر نہیں کیا گیا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

''اس معاملہ میں بالکل خاموش رہ کر سید صاحب نے شبلی کی خدمت نہیں کی ہے بلکہ میرے نزدیک مخالفوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو اور تقویت پہنچائی ہے۔'' (ادیب شبلی نمبر ص ۹۹)

عبداللطیف اعظمی کا یہ مضمون خاصا طویل ہے اور اس میں علامہ شبلی کے مخالفین و موافقین کے ہر طرح کے خیالات کا تفصیلی ذکر و جائزہ آگیا ہے۔ مقالہ نگار اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

ادیب ''شبلی نمبر'' کے معاون مدیر پروفیسر کبیر احمد جائسی تھے۔ ان کی تعلیم شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ میں ہوئی تھی۔ انہوں نے دارالمصنفین اور مولانا عبدالسلام ندوی سے استفادہ کیا تھا۔ ان کے مقالے کا عنوان ''شبلی کی ایک یادگار دارالمصنفین'' ہے۔ اس میں انہوں نے دارالمصنفین کے قیام، اسباب و مقاصد اور خصوصیات قلم بند کی ہیں۔ معماران دارالمصنفین اور رفقائے دارالمصنفین کی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے جن اہل قلم کی خدمات کا ذکر کیا ہے ان کے نام یہ ہیں:

مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا

عبدالباری ندوی، مولانا سید ریاست علی ندوی، مولانا سعید انصاری، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا مجیب اللہ ندوی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی۔

آخر میں ماہنامہ معارف اور اس کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔

ادیب کے اس شمارے کے آخری حصہ کو ''مخطوطات'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں علامہ شبلی کے چند غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں۔ یہ خطوط بڑے اہم ہیں۔ ان سے شبلی کے حوالہ سے چند نئی معلومات سامنے آتی ہیں۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار [۴رفروری ۱۹۳۴ء] کے مقالہ کا عنوان ''شبلی بحیثیت صحافی'' ہے۔ یہ اصلاً ماہنامہ الندوہ کے مشمولات کا اشاریہ ہے۔ یہ اشاریہ بھی اس طرح ہے کہ ماہ بہ ماہ کی فہرست درج کردی گئی ہے۔ لیکن اس سے الندوہ کے مضامین و مقالات کے عناوین ضرور سامنے آجاتے ہے۔ شروع میں انہوں نے الندوہ کی تاریخ بھی مختصراً قلم بند کی ہے، حالانکہ ماہنامہ الندوہ کا اس سے زیادہ تفصیلی ذکر حیات شبلی میں آچکا تھا۔ ماہنامہ معارف کا علامہ شبلی نے جو خاکہ بنایا تھا اسے بھی بیدار صاحب نے نقل کردیا ہے۔ البتہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین جس کے علامہ شبلی تقریباً چار برس ایڈیٹر رہے۔ اس کا سرے سے ذکر نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے ذکر کے بغیر شبلی کی صحافتی خدمات کا مرقع مکمل نہیں ہوسکتا۔ بڑی بات یہ ہے کہ اس میگزین کی ادارت انہوں نے سرسید احمد خاں کی موجودگی میں کی تھی۔

ادیب شبلی نمبر کے اخیر میں کتب نما اور مقالہ نما برائے شبلی درج کیا گیا ہے۔ یہ اصلاً کتابیات شبلی ہے اور خانوادہ شبلی ہی کے ایک فرد احمد اسحاق نعمانی نے تیار کیا ہے۔ یہ شبلی پر پہلا اشاریہ ہے۔ اس کے بعد اختر راہی [کتاب نامہ شبلی] ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری [جہان شبلی] اور سب سے اخیر میں راقم کا تیار کردہ اشاریہ ''کتابیات شبلی'' شائع ہوا۔

ماہنامہ ادیب کا یہ شبلی نمبر مطالعات شبلی کا ایک عمدہ مجموعہ ہے۔ اس سے شبلی کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت کے متنوع پہلو سامنے آجاتے ہیں۔

ادیب کا شبلی نمبر ڈاکٹر ابن فرید کا ایک بڑا ادبی کارنامہ ہے۔ جسے شبلی شناسی کی تاریخ

میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ اس میں علامہ شبلی کے کئی اہم کارناموں کا ذکر نہیں آسکا ہے۔ مثلاً علامہ شبلی کی سب سے زیادہ پسندیدہ کتاب الفاروق پر کوئی مقالہ شامل نہیں۔ اسی طرح نہ صرف ان کا بلکہ اردو زبان کا لاثانی شاہ کار سیرۃ النبیؐ کے ذکر سے بھی ادیب کے اوراق سونے ہیں۔ اسی طرح الغزالی اور سیرۃ النعمان پر بھی مستقل مقالات شامل نہیں، اس کے باوجود ادیب کا یہ خصوصی شمارہ شبلی شناسی کے میدان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

کریسنٹ

مرتب

خالد بزمی

معاونین

خلیل احمد خلیل

سلیف پرویز مرزا

شوکت رانا

شبلی نمبر

جنوری ۱۹۷۱ء

اسلامیہ کالج ۔ ریلوے روڈ ۔ لاہور

کریسنٹ لاہور کے شبلی نمبر کا سرورق

(۷)

کریسنٹ، لاہور

[شبلی نمبر]

[مدیر: خالد بزمی، جنوری ۱۹۷۱ء، اسلامیہ کالج لاہور]

ادیب شبلی نمبر کے دس سال بعد جنوری ۱۹۷۱ء میں اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور کے مجلّہ کریسنٹ کا شبلی نمبر شائع ہوا۔ یہ ۲۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے مدیر خالد بزمی [پروفیسر محمد یونس ۱۹۳۲-۱۹۹۹ء] تھے، جو اس وقت اسلامیہ کالج لاہور کے طالب علم تھے۔ ان کے معاونین میں خلیل احمد خلیل، سلیم پرویز مرزا اور شوکت رانا کے نام درج ہیں۔ حرف آغاز میں لکھا ہے کہ

> ''اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور کے میگزین کریسنٹ کا زیر نظر شمارہ علامہ شبلی نعمانی مغفور و مرحوم کی شخصیت اور ان کی علمی و ادبی خدمات کے تذکرے کے لئے وقف ہے۔ علامہ مرحوم کو اردو ادب میں جو خاص ممتاز و منفرد مرتبہ حاصل ہے اس کا اقتضا ہے کہ ان کے علمی، ادبی، دینی، ملی، اخلاقی اور انسانی کارناموں کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا جائے۔ علامہ شبلی کے دل میں اسلام اور ملت اسلامیہ کے لئے جو درد اور جوش و جذبہ تھا اس کی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ مشاہیر اسلام میں انہیں نہایت باعزت اور قابل افتخار و نازش مقام نصیب ہے۔ اپنے اخلاق و اوصاف اور خدمات کے اعتبار سے وہ زیادہ سے زیادہ اظہار عقیدت اور

سپاس و تحسین کے حق دار ہیں۔ کریسنٹ کا شبلی نمبر شائع کرنے میں یہی جذبہ کارفرما ہے۔'' (حرف آغاز، کریسنٹ شبلی نمبر)

فاضل مدیر نے اسے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ اعتراف عظمت

۲۔ فکر و نظر

۳۔ اظہار عقیدت

۴۔ کف گل فروش

۵۔ دامان باغباں

ابتداء میں علامہ شبلی کی ۶ ر تصویریں ہیں۔ پھر ''غم شبلی'' کے عنوان سے دو مختصر تعزیتی مضامین شامل ہیں۔ یہ دونوں تعزیتی مضامین علامہ شبلی کے ایک شاگرد مولانا ظفر علی خاں [۱۸۷۳-۱۹۵۶ء] نے زمیندار لاہور میں شائع کیے ہیں اور غالباً انہی کے قلم سے ہیں۔ یہ دراصل علامہ شبلی کی وفات پر ان کا ماتم ہیں۔ اس میں ماتم کا ایک خاص انداز ہے۔ لکھتے ہیں:

''فرشتہ قضا نے ہم سے اسلام کی عظمت چھین لی مگر ہم بے دل نہ ہوئے کہ ہم میں اس کی یاد زندہ رکھنے کے لئے شبلی موجود تھا۔ قرآن کی حکومت چھین لی مگر ہم کو تشویش نہ ہوئی اس لئے کہ اس کا خضر طریقت شبلی موجود تھا۔ فاروق اعظم کی سطوت چھین لی مگر ہم پر بے دلی نہ چھائی اس لئے کہ الفاروق کا سکہ بٹھانے والا شبلی موجود تھا۔ مامون عباسی کی علمی برکتیں چھین لیں مگر ہم مضطرب نہ ہوئے اس لئے کہ المامون کا مصنف شبلی موجود تھا۔ امام اعظم ابوحنیفہ نعمان کوفی کا علم و فضل چھین لیا گیا مگر ہم ناامید نہ ہوئے کہ سیرۃ النعمان کا صورت گر شبلی موجود تھا۔ امام غزالی کے برکات و فضائل چھین لئے گئے مگر ہم وقف یاس نہ ہوئے اس لئے کہ الغزالی کے زمانے کا تعارف کرانے والا شبلی موجود تھا۔ مولوی روم کا فلسفہ

چھین لیا گیا مگر ہم پر اضطرار طاری نہ ہوا اس لئے کہ فلسفے کا سوانح نویس شبلی موجود تھا۔ علمائے اسلام کا ہم کلام چھین لیا گیا مگر ہماری ہمت نہ ٹوٹی اس لئے کہ الکلام کا شارح حقیقت شبلی موجود تھا۔ شہنشاہ اورنگزیب کی جاہ وجلالت چھن گئی مگر ہم بے حوصلہ نہیں ہوئے اس لئے کہ اس کے آثار و وقار بتانے کو شبلی موجود تھا۔ خلافت امویہ کا تمدن چھن گیا مگر ہم نے جزع فزع نہ کیا اس لئے کہ الانتقاد کا بدائع نگار شبلی موجود تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فیض مجسم ورحمت عالم زندگی پر اعتراضات ہو رہے تھے مگر ہم نے اعتنا نہ کی اس لئے کہ سیرت نبوی لکھنے کے لئے شبلی کا قلم موجود تھا۔ انیس و دبیر کی ادبی قابلیت ہم سے چھن گئی مگر ہم پر اثر نہ ہوئے اس لئے کہ ان کی قابلیت کا موازنہ کرنے والا شبلی ہم میں موجود تھا۔ بایزید کی روشن ضمیری ہم سے چھن گئی مگر ہم نے محسوس نہ کیا اس لئے کہ شبلی ہم میں موجود تھا۔ اس وقت نہ صرف شبلی کے ماتم دار اس کے فضائل کے ماتم دار ہیں بلکہ اسلام کے سوگوار ہیں۔ اسلامی تمدن کے سوگوار ہیں۔ عرب کے سوگوار ہیں۔ علوم عرب کے سوگوار ہیں۔ غزالی ورازی کے سوگوار ہیں۔ اس لئے کہ شبلی کی وجہ سے یہ سب زندہ تھے۔ اور خدا کرے اب بھی کوئی شبلی اٹھے کہ ان سب کی حیات جاوید کو صدمہ نہ پہنچنے پائے۔''

(کریسنٹ لاہور شبلی نمبر ص ۱-۲)

یہ علامہ شبلی کی وفات پر ایک شاگرد کی جذباتی تحریر ہے۔ اس طرح کی نہ جانے کتنی تحریریں اخبارات ورسائل میں شائع ہوئیں۔ کاش کوئی شخص انہیں جمع کر دیتا تو کم از کم ان سے یہ ضرور اندازہ ہو جاتا کہ شبلی کی وفات پر ہندوستان بالخصوص مسلمان کس قدر سوگوار ہوئے تھے۔

مذکورہ ماتم کے علاوہ اس مضمون میں کئی اہم باتیں ہیں۔ خاص طور پر شبلی کی ملی درد مندی اور اسلامی حمیت وغیرہ کا ذکر بڑے عمدہ پیرایہ میں کیا گیا ہے۔ اسی طرح نیشنل اسکول

اعظم گڑھ کے لئے ان کی جدوجہد کا ذکر بھی ہے۔ مرزا سلیم صاحب جو علامہ شبلی کے بچپن کے احباب میں تھے۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ شبلی کی وفات کے بعد زمینوں کی دارالمصنفین کے لئے وقف کی کارروائی انہیں کے دم پوری سے ہوئی اور خود انہوں نے اپنا باغ بھی وقف کیا۔ واضح رہے کہ علامہ شبلی نے وقف نامہ لکھ دیا تھا اور اس پر اپنے اعزہ سے دستخط بھی کرا چکے تھے مگر وہ رجسٹرڈ نہیں ہو سکا تھا کہ انہوں نے وفات پائی، اس کے بعد کی کارروائی مرزا صاحب نے مکمل کرائی۔

اس کے بعد سرسید [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] سے میاں ایم اسلم [۱۸۸۵-۱۹۸۳ء] تک کے ہندوپاک کے چند ممتاز اہل قلم اور دانشوروں کے شبلی کے بارے میں تاثرات و اعترافات نقل کیے گئے ہیں۔ اسے فاضل مرتب نے ''اعتراف عظمت'' کا نام دیا ہے۔ اس میں جن لوگوں کے تاثرات شامل ہیں ان کے نام یہ ہیں:

[۱] سرسید احمد خاں [۲] نواب محسن الملک [۳] مولوی عبدالحلیم شرر [۴] بابائے اردو مولوی عبدالحق [۵] مولانا عبدالماجد دریابادی [۶] مولانا عبدالسلام ندوی [۷] مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی [۸] مولانا سعید انصاری [۹] مہدی حسن افادی [۱۰] شیخ محمد اکرام [۱۱] ڈاکٹر محی الدین قادری زور [۱۲] مولانا ماہر القادری [۱۳] نصیر الدین ہاشمی [۱۴] تمکین کاظمی [۱۵] ڈاکٹر سلام سندیلوی [۱۶] سید جالب مظاہری [۱۷] علی عباس حسینی [۱۸] حافظ نذر احمد [۱۹] میاں ایم اسلم۔

مذکورہ اہل علم نے شبلی کی عظمت کا اعتراف جن مضامین اور کتابوں میں کیا ہے۔ مدیر مجلہ خالد بزمی نے ان کے حوالے نہیں دیئے ہیں۔ اس میں کئی ایسے اہل قلم کے اعترافات و تاثرات شامل ہیں جن کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کہاں اور کب کیا ہے؟ جن تحریروں کے حوالے راقم کی نظر سے گذرے ہیں، یہاں ان کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

سرسید احمد خاں کی رائے المامون کے دیباچے سے لی گئی ہے۔ نواب محسن الملک

کے خیالات ان کی اس تقریر کا حصہ ہیں جو انہوں نے شبلی کی روم و مصر و شام سے واپسی کے موقع پر ایک تہنیتی جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے کہی تھیں۔ یہ تقریر حیات شبلی میں درج ہے۔ مولوی عبدالحلیم شرر کی تحریر ان کے اس مضمون سے نقل کی گئی ہے جو انہوں نے شبلی کی وفات پر ماہنامہ دلگداز لکھنو میں لکھا تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کا اقتباس اس خط سے لیا گیا ہے جو انہوں نے عبداللطیف اعظمی کو لکھا تھا اور جو ماہنامہ ادیب شبلی نمبر میں شامل ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریر ان کے مشہور مقالہ ''شبلی انسان، مصنف اور مصنف گر'' سے لی گئی ہے۔ یہ مقالہ انہوں نے ۱۹۶۴ء میں دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کی طلائی تقریب میں پیش کیا تھا۔ اور ان کے ادبی مضامین کے مجموعہ ''انشائے ماجدی'' میں بھی شامل ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کا اقتباس ان کے مضمون ''شبلی کا طرز تحریر'' مشمولہ ادیب شبلی نمبر سے نقل کیا گیا ہے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور مولانا سعید انصاری کے اقتباسات بھی ادیب کے ''شبلی نمبر'' ہی سے نقل کئے گئے ہیں۔ شیخ محمد اکرام کے خیالات ان کی مشہور کتاب ''موج کوثر'' سے ماخوذ ہیں۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے شبلی کی اردو شاعری پر ایک طویل مقالہ ماہنامہ ادیب کے شبلی نمبر میں لکھا ہے، جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، اس سے بھی ایک اقتباس نقل کیا گیا ہے۔

ان کے علاوہ چند اہل قلم کے اقتباسات کا مجھے علم نہیں کہ وہ کہاں سے نقل کئے گئے ہیں چونکہ ان سے شبلی کی گوناگونی اور بوقلموں شخصیت کی ایک جھلک سامنے آتی ہے اور یہ تحریریں مشکل سے دستیاب ہوں گی، اس لئے انہیں نقل کیا جاتا ہے۔

۱۔ محی الدین قادری زور

''علامہ شبلی اردو کے ایک مایہ ناز ادیب، مورخ اور نظم نگار تھے۔ وہ دور سرسید کے آخری اور بڑے ادیب تھے۔ شبلی کی طرز تحریر اردو کے لئے باعث صد نازش ہے تاریخ، تذکرہ، سوانح، سیاسیات، ادب، معاشرت، فقہ، حدیث، عقائد اور تصوف جیسے متضاد مباحث پر لکھتے وقت بھی انہوں

نے ادبیت کا ضروری لحاظ رکھا۔ وہ نہایت سوچ سمجھ کر اور احتیاط سے عبارت آراستہ کرتے تھے۔ بے جا الفاظ اور اطناب سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کی تحریروں میں مغربی انداز کے محققانہ اسلوب کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ادبی شان برقرار رکھنے کا ان کو ہمیشہ خیال رہتا تھا۔

شبلی نعمانی ایک انسان تھے۔ ایک ایسا انسان جس کا دل زندہ تھا اور یہ واقعہ ہے کہ زندہ دلی کے بغیر رعنائی خیال اور شگفتگی بیان ممکن نہیں ہے اور شاید شبلی کے یہاں یہ دونوں خوبیاں محض اسی وجہ سے پیدا ہوئیں تھیں۔''

(کریسنٹ لاہور، شبلی نمبر ص ۱۳)

۲۔ نصیر الدین ہاشمی

''مجھے بچپن سے مولانا شبلی کی کتابوں سے محبت رہی ہے۔ اور میں نے مولانا کی کتابیں کئی کئی مرتبہ پڑھی ہیں۔'' (کریسنٹ، شبلی نمبر ص ۱۳)

۳۔ علی عباس حسینی

''مولانا شبلی نعمانی بڑے اچھے خطیب، متکلم، انشا پرداز، ناقد، بابصیرت عالم شاعر و سخن فہم، مورخ، سوانح نگار و سیرت نویس ہونے کے ساتھ ساتھ ندوۃ العلما لکھنو اور دار المصنفین اعظم گڑھ کے بانی بھی تھے۔ انہوں نے شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر لکھ کر اردو ادب کی اور مختلف سیرتیں اور سوانح حیات لکھ کر اسلامیات کی بڑی خدمت کی ہے۔ انہیں بات کو سمجھا کر کہنے کا سلیقہ تھا۔ وہ اردو نثر کے عظیم فن کاروں میں تھے۔ ان کی ہمہ جہت و باکمال شخصیت پر مختلف پہلوؤں سے کام کیا جا سکتا ہے اور داد تحقیق دی جا سکتی ہے۔ (کریسنٹ لاہور، شبلی نمبر ص ۱۵)

۴۔ ایم اسلم

''حضرت مولانا شبلی نعمانی کی زیارت تو مجھے نصیب نہیں ہوئی، لیکن مولانا

مرحوم ومغفور کی بہت سی تصانیف پڑھنے کا موقع ضرور ملا ہے۔ اس میں میں نے ایک بات خصوصیت سے دیکھی ہے کہ آپ کی تحریر عمر کے لحاظ سے اپنا انداز بھی مختلف رکھتی ہے۔ اس حقیقت سے تو شاید کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ جہاں تک اسلامی دور کی تاریخ کا تعلق ہے مولانا مرحوم نے اسلامی تاریخ لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ واقعات کی صحت تو خیر ایک ضروری امر ہے لیکن انداز بیان اتنا دلکش، دلفریب اور پاکیزہ ہے کہ دماغ کسی قسم کی تھکاوٹ محسوس نہیں کرتا۔ حضرت مولانا مغفور کا سب سے بڑا کارنامہ حضور شہنشاہ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہے۔ میں نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی سیرت اقدس پر کئی کتابیں پڑھی ہیں لیکن شبلی کی سیرۃ النبی ہر نقطہ نظر سے ایک بے نظیر تصنیف ہے۔ لفظ لفظ سے پاکیزگی اور سچی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ سیرۃ النبی جلد اول کے پیش لفظ کا ہر حرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ پیش لفظ پڑھ کر مجھ پر تو ہمیشہ ایک والہانہ کیفیت وارد ہو جاتی ہے اور آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں۔ مولانا شبلی کا یہ کارنامہ صرف ایک عظیم کارنامہ نہیں بلکہ مسلمانوں پر ایک احسان ہے۔'' (کریسنٹ، شبلی نمبر ص ۱۵-۱۶)

۵۔ سید جالب مظاہری

''شبلی ان خوش نصیب انسانوں میں سے ہیں جنہیں قدرت نے مختلف قسم کی صلاحیتیں بڑی فیاضی سے عطا کیں۔

شبلی میں جہاں اوراخلاق حسنہ اور اوصاف حمیدہ پائے جاتے تھے وہاں شگفتہ مزاجی اور زندہ دلی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انہوں نے عالم دین ہوتے ہوئے بھی کبھی اپنے آپ کو فرشتہ ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہر موقع پر ایک انسان کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ اور غالباً

یہی بات ہے کہ ان کی ذات میں ہر ایک کے لئے کشش پائی جاتی ہے۔"
(کریسنٹ، شبلی نمبر ص ۱۴)

۶۔ حافظ نذر احمد

"شبلی کو بجا طور پر ایک ہمہ گیر شخصیت کہا جا سکتا ہے۔ وہ معلم بھی تھے اور مصنف بھی۔ سیرت نگار بھی تھے اور مورخ بھی۔ ادیب شہیر بھی تھے اور تاریخ ادبیات کے ماہر بھی۔ وہ یگانہ محقق بھی تھے اور ماہر نقاد بھی۔ انہوں نے ایک طرف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چمن کی آبیاری کی دوسری طرف ندوۃ العلما کی منفرد درسگاہ کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے دارالمصنفین جیسا عظیم تصنیفی ادارہ قائم کیا اور اپنے پیچھے مشہور شاگردوں کی جماعت چھوڑ گئے۔ یہ خوش بختی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔"
(کریسنٹ، شبلی نمبر ص ۱۵)

اعتراف عظمت کے بعد حصہ فکر و نظر ہے۔ اس میں ہند و پاک کے ممتاز اہل قلم کی نگارشات شامل ہیں۔ پہلا مقالہ مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے "شبلی کے مذہبی عقائد" ہے۔ مرتب نے اگرچہ صراحت نہیں کی ہے لیکن یہ حیات شبلی سے نقل کیا گیا ہے۔ اس میں سید صاحب نے تفصیل سے علامہ شبلی کی مذہبیت اور پابندی صوم وصلوٰۃ کے ساتھ ان کے عقائد و خیالات کا ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ ان کے عقائد و خیالات اہل سنت و جماعت کے تھے۔ چونکہ ان میں عقلیت پسندی تھی اس لئے ان کے بعض خیالات میں جس وقت وہ علم الکلام کی تدوین میں مصروف تھے کسی قدر تبدیلی آگئی تھی مگر پھر آخر میں سیرۃ النبی کے زمانہ تصنیف میں ابتدا کی طرح وہ غالی حنفی ہو گئے تھے۔

دوسرا مقالہ مولانا عبدالماجد دریابادی کا "شبلی انسان، مصنف، مصنف گر" ہے۔ اس مقالہ میں انہوں نے شبلی کی عظمت و جامعیت اور بحیثیت مصنف ان کے مقام و مرتبہ کی وضاحت کی ہے اور آخر میں ان کی ایک بڑی خوبی تصنیف و تالیف کے لئے اہل قلم کی تربیت

بتایا ہے۔ اور بلاشبہ علامہ شبلی کا یہ بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے دارالمصنفین قائم کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں محض ان کی بدولت اہل قلم کی ایک جماعت قائم ہوئی اور اس چراغ سے ابتک چراغ روشن ہیں۔ اور امید ہے کہ آئندہ بھی چراغ سے چراغ جلتا رہے گا۔

تیسرا مقالہ ''شبلی کا اسلوب بیان'' ڈاکٹر سید عبداللہ کے قلم سے ہے۔ یہ مقالہ ماہنامہ ادیب کے شبلی نمبر میں بھی شامل ہے۔ جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

چوتھا مقالہ شبلی کی تنقید نگاری از ڈاکٹر عبادت بریلوی بھی ادیب کے شبلی نمبر سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ اصلاً ڈاکٹر صاحب کی کتاب ''اردو تنقید کا ارتقاء'' کا ایک باب ہے۔

پانچواں مقالہ شبلی کی سیاسی شاعری ہے۔ یہ سید وقار عظیم [م: ۱۷ ر نومبر ۱۹۷۶ء] کے قلم سے ہے۔ علامہ شبلی کی شاعری بالخصوص اردو شاعری میں ایک بڑا حصہ سیاسیات پر مبنی ہے۔ اس مقالہ میں اس کا قدرے تفصیل سے جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ خاص طور پر انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل اور عالم اسلام کے بعض خونی اور دل دوز واقعات پر جو نظمیں لکھی ہیں، سید وقار عظیم نے ان کا بڑا خوب صورت تجزیہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

> ''شبلی کی سیاسی شاعری کا کوئی حصہ احساس کے اس سوز (پیش بینی) اور جذبے کے اس شعلے کی گرمی سے خالی نہیں، اس لئے اسے ایک خاص طور کی سیاسی زندگی کی ''نوائے حق'' کہا جاسکتا ہے، جو لوگوں کو فریب کے طلسم سے محفوظ رکھنے اور صراط مستقیم کی طرف لانے کی خدمت انجام دیتی ہے۔ یہ آواز ایک صاحب بصیرت مورخ کی بھی ہے۔ ایک حق پسند سیاسی مبصر کی بھی ہے۔ اور ایک بے باک شاعر کی بھی ہے۔ جس نے تاریخ اور سیاست کے حقائق کو شاعری کے سانچوں میں ڈھالا ہے اور شاعر کو مصلحت کی راہ چھوڑ کر حق گوئی کا مسلک اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے کہ یہی مسلک حقیقت میں شاعری اور پیغمبری کو ایک ہی منزل مقصود کی

طرف لے جاتا ہے اور شاعر کی زبان سے ایسی باتیں بھی نکل جاتی ہیں
جن میں پیغمبرانہ شان ہوتی ہے۔شبلی کی سیاسی شاعری میں جا بہ جا اس
پیغمبرانہ شان کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔''

(کریسنٹ لاہور، شبلی نمبر ص ۱۰۲-۱۰۳)

''شبلی کی حیات معاشقہ'' کے مصنف ڈاکٹر وحید قریشی نے شبلی کی سوانح نگاری پر قلم اٹھایا ہے، لیکن یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس میں شبلی کے نظریہ سوانح نگاری یا شبلی کی سوانحی تصنیفات المامون سے سوانح مولانا روم تک کسی کتاب کا سرے سے ذکر نہیں بلکہ اس میں انہوں نے پھر وہی داستان سنائی ہے۔ البتہ اس میں سارا زور اس بات پر ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں شبلی کی زندگی کے بہت سے اوراق سادہ چھوڑ دئے ہیں۔ اشارہ عطیہ فیضی کے تعلقات کی طرف کیا ہے۔ اور کئی دلائل پیش کئے ہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے عطیہ فیضی سے تعلقات اور خط وکتابت کا ذکر حیات شبلی میں نہیں کیا ہے۔ لیکن اس سے وہ کہاں ثابت ہوتا ہے جو انہوں نے حیات معاشقہ میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وحید قریشی نے حیات معاشقہ میں جو کچھ لکھا اسے نفسیاتی مطالعے کا نام دیا گیا مگر اس مضمون سے ان کی اس مہارت نفسی کا بھی کوئی پہلو دکھائی نہیں دیتا۔ کریسنٹ کے شبلی نمبر کا شاید یہ سب سے کمزور مضمون ہے، جس میں موضوع پر ایک حرف بھی نہیں لکھا گیا ہے۔

اس کے بعد پروفیسر آل احمد سرور [۱۹۱۱-۲۰۰۲ء] کا مقالہ ''شبلی میری نظر میں'' نقل کیا گیا ہے۔ یہ اصلاً حیات شبلی پر ایک تبصرہ ہے۔ اس میں انہوں نے مولانا سید سلیمان ندوی سے اتفاق بھی کیا ہے اور اختلاف بھی۔ لیکن شبلی کی شخصیت کا جہاں جہاں تجزیہ کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مبصر نے شبلی کی شخصیت کا، تصنیفات کا افکار و خیالات کا بڑی گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا ہے اور شبلی کی عظمت کے نقوش ان کے دل و دماغ پر ثبت ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''شبلی پر لکھنے کے لئے کسی اعتذار کی ضرورت نہیں۔ وہ ہماری ذہنی زندگی

کے معماروں میں سے ہیں۔انہوں نے اپنی عمر کے چالیس سال علمی کاموں میں بسر کئے۔انہوں نے بہت سے عملی کام بھی کئے اوران میں کامیابی بھی حاصل کی،مگروہ محض اپنے عملی کاموں کی وجہ سے شاید اتنے مشہور نہ ہوتے اگر ان کاموں کے پیچھے ایک مسلسل اہم اور پرزور علمی وذہنی تحریک نہ ہوتی۔" (کریسنٹ لاہور،شبلی نمبرص ۱۱۰)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"نئی نسل پرشبلی کااثراپنے ہم عصروں سے زیادہ ہوا۔حالی نے اردوادب کی دنیابدل دی مگرشبلی نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ذہنی زندگی پراثر ڈالا۔انہیں اپنی چیزوں کی قدرکرناسکھائی۔انہیں ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ممالک کے مسائل کومحسوس کرنے کاعادی بنایا۔ان میں حقوق کی طلب اورخوشامدانہ سیاست سے بلندی پیداکی۔سید سلیمان ندوی،ابوالکلام عبدالسلام ندوی،ظفرعلی خاں،مولانامحمدعلی،اقبال سب پر سرسید سے زیادہ شبلی کااثرہے۔" (کریسنٹ لاہور،شبلی نمبرص ۱۱۶)

مکاتیب شبلی کے بارے میں لکھاہے کہ

"شبلی کے خطوط میں ان خطوط کوخوامخواہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے جوانہوں نے عطیہ فیضی اورزہرافیضی کولکھے تھے۔دراصل مکاتیب شبلی ان کی علمی و ادبی زندگی کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔شبلی جذباتی آدمی تھے۔پھر شاعرتھے۔

اچھی پڑھی لکھی خواتین سے متاثرہوئے۔وہ ان کی صحبت سے لطف اٹھانے اورزندگی میں اچھے کام کرنے کے ولولے حاصل کرتے تھے۔ان کی زندگی میں اس سے زیادہ ان خطوط کی اہمیت نہیں ہے۔مولوی عبدالحق صاحب کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ "ان کی کتابوں کولونی لگنی شروع ہوگئی

ہے۔'' (کریسنٹ لاہور، شبلی نمبر ص ۱۱۹-۱۲۰)

کلیم الدین احمد [۱۹۰۸-۱۹۸۳ء] کی کتاب ''اردو تنقید پر ایک نظر'' اوران کی نظریہ تنقید سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔انہوں نے اپنی مذکورہ کتاب میں علامہ شبلی کی تنقید نگاری کا بھی تجزیہ کیا ہے۔اوران کی نظری وعملی تنقید کا جائزہ لے کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''شبلی نئی اور پرانی تنقید کے درمیان معلق نظر آتے ہیں۔'' (کریسنٹ لاہور، شبلی نمبر ص ۱۲۸) کریسنٹ کے اس شبلی نمبر میں کلیم الدین احمد کا وہی قدیم مضمون شامل کیا گیا ہے۔

اسی طرح موازنہ انیس ودبیر پر پروفیسر سید احتشام حسین کا وہ مضمون جوادیب کے ''شبلی نمبر'' میں شامل تھا اور جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں، اس میں بھی شامل ہے۔ پروفیسر خورشید الاسلام کا مضمون ''شبلی'' جوان کی کتاب ''تنقیدیں'' میں شامل ہے اور جو اپنے خاص اسلوب کی وجہ سے بے حد مقبول ہوا تھا اور جس کا پہلا جملہ ''شبلی پہلے یونانی ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔'' آج تک اہل علم کے کانوں میں گونج رہا ہے۔اہمیت کے پیش نظر کریسنٹ میں شامل کیا گیا ہے۔

ایک اہل قلم سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی [۱۹۲۳-۱۹۸۷ء] نے شبلی کی ذوق آفرینی کا تجزیہ کیا ہے۔شبلی کا ذوق بہت بلند تھا۔نہ صرف ادبی ذوق بلکہ شاعرانہ، مورخانہ، محققانہ اور مبصرانہ۔یہی وجہ ہے کہ ہر محاذ پر وہ انفرادیت کا نقش قائم کر دیتے ہیں۔فاضل لکھنوی نے اس بلند ذوقی کے مختلف نمونے یکجا کر دئے ہیں۔اوران کا اچھا تجزیہ کیا ہے۔

مشہور اہل قلم مولوی عبدالباری ابوعلی اثری [۱۹۰۳-۱۹۹۳ء] شبلی وابوالکلام دونوں کے عظمت شناس اور عقیدت مند تھے۔دونوں کی شخصیت پر متعدد مضامین ان کے قلم سے نکلے، جوان کی وفات کے بعد ''علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔کریسنٹ کے اس نمبر میں ان کا مضمون ''شبلی وابوالکلام'' شامل ہے۔اس میں انہوں نے دونوں کے تعلقات کی داستان ماہنامہ الندوہ کے زمانہ سے شبلی کی وفات تک کی سنائی ہے۔دونوں کے خطوط سے بے تکلفی، ایک دوسرے کا خیال، علمی تحقیقات ومسائل، افادہ

واستفادہ، اشتراک مذاق وعمل وغیرہ کی ایک ایک تفصیل عمدہ پیرایہ میں قلم بند کی ہے۔ شبلی و ابوالکلام آزاد کے تعلقات پر بعض اہل قلم کے کئی اعتراضات کا نام لئے بغیر ابوعلی اثری نے جواب بھی دیا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ ابوعلی اثری نے بھی دونوں کے تعلقات کے آغاز کا ذکر ماہنامہ الندوہ لکھنو ہی سے کیا ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ نہیں بلکہ ان کے تعلقات کا آغاز ۱۹۰۱ء میں ہوا جیسا کہ مولانا آزاد نے ''آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی'' میں لکھا ہے۔ اور دونوں کے درمیان گہرے تعلق کا زمانہ ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ کی اشاعت [۱۹۰۳-۱۹۰۵ء] کا زمانہ ہے۔ علامہ شبلی نے لسان الصدق کی سرپرستی قبول کی۔ لسان الصدق کو انجمن ترقی اردو کا ترجمان اور مولانا آزاد کو اس کا رکن انتظامی نامزد کیا۔ لسان الصدق کے صفحات ان کے گہرے مراسم کے گواہ ہیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر ناظر حسن زیدی [م: ۸/ مارچ ۲۰۰۴ء] نے علامہ شبلی کی شیوہ بیانی کی روشنی میں انہیں ہزار شیوہ ادیب قرار دیا ہے۔ ان کی شیوہ بیانی کے مختلف اور متنوع مناظر ڈاکٹر ناظر حسن نے پیش کئے ہیں۔ یہ طویل مقالہ علامہ شبلی کا ایک الگ نوع سے تعارف کراتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ

> ''شبلی کی زندگی کا خاکہ اتنا طویل ہو جانے کے باوجود تشنہ ہے۔ ان کی زندگی اتنی گوناگوں اور ہمہ رنگ تھی کہ اس کی تصویر کشی کا فرض ان کے لائق جانشین شاگرد سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی لکھ کر ادا کیا ہے۔''
>
> (کریسنٹ لاہور، شبلی نمبر ص ۲۰۲)

سید غلام شبیر بخاری کے مقالے کا عنوان ''شبلی ایک ماہر تعلیم'' ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے تعلیم وتدریس، نظام تعلیم، قدیم وجدید تعلیم، فلسفہ تعلیم وغیرہ موضوعات پر گراں قدر تحریری ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ غلام شبیر بخاری کی تحقیق کے مطابق اس موضوع پر انہوں نے گیارہ بصیرت افروز مقالے لکھے ہیں۔ (کریسنٹ لاہور، شبلی نمبر ص ۱۳۹)

علامہ شبلی کا ایک خاص نظریہ تعلیم تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک قدیم وجدید تعلیم

کے ڈانڈے نہیں ملیں گے مسلمان ترقی نہیں کر سکتے۔ان کا یہ خیال علی گڑھ کے زمانہ قیام ہی میں ظاہر ہو گیا تھا۔انہوں اسی نظریہ کی ہم آہنگی کی وجہ سے تحریک ندوہ میں شمولیت اختیار کی اور اسی کے مطابق ندوہ کو ڈھالنے کی کوشش کی۔سید غلام شبیر بخاری نے ان کی تعلیمی حیثیت پر ان کے دو تعلیمی مقالات کی روشنی میں بحث کی ہے۔ان کے رسالہ ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' اور ''مدرسے اور دارالعلوم'' کے حوالے سے شبلی کے گہرے تعلیمی شعور کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''علامہ شبلی نعمانی جدید و قدیم علوم میں ایک نہایت حسین امتزاج کے حامی تھے، لیکن وائے حسرت کہ ان کا خواب ان کی زندگی میں شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا'' (کریسنٹ لاہور، شبلی نمبر ص ۱۴۳)

اس موضوع پر اب تک نسبتاً کم لکھا گیا ہے۔ڈاکٹر عبیداللہ فراہی سابق صدر شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی کی کتاب ''شبلی کا نظریہ تعلیم'' ایک اچھی کوشش ہے لیکن اس میں انہوں نے اختلافات کو مدنظر رکھا ہے اور شبلی جیسے ماہر تعلیم کے تمام تعلیمی افکار و خیالات کا احاطہ بھی نہیں ہو سکا ہے۔اس موضوع پر اب بھی ایک مکمل مطالعہ و تجزیہ کی ضرورت باقی ہے تاکہ شبلی کی تعلیمی خدمات اور ان کے تعلیمی نظریات کی توضیح کے ساتھ اس کی اہمیت اور افادیت اور عہد حاضر میں ان کی معنویت عیاں ہو جائے۔ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے اپنی کتاب ''تعلیم اور تعلیمی افکار'' اور پروفیسر اختر الواسع نے اپنے مقالہ ''علامہ شبلی اور ان کے تعلیمی افکار کی معنویت'' (معارف جنوری ۲۰۱۴ء) میں اگرچہ اچھے تجزیے کئے ہیں مگر اختصار ان کے بھی پیش نظر رہا ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار [۱۹۲۴-۲۰۰۷ء] مدیر سہ ماہی اقبال لاہور نے جو ۱۹۷۱ء میں اسلامیہ کالج کے طالب علم تھے، علامہ شبلی کے تصنیفی ادارے دارالمصنفین پر قلم اٹھایا ہے۔اور اسے ایک تصنیفی تحریک کا مرکز قرار دیا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ دارالمصنفین اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے۔اس کے لئے علامہ شبلی نے بڑی قربانیاں دیں۔اپنی زمین جائداد وقف کی۔اپنے متعدد تلامذہ کو اس میں قیام اور تصنیف و تالیف کے لئے آمادہ کیا۔افسوس کہ

دارالمصنفین ابھی نظریہ سے عمل کے بالکل ابتدائی دور میں تھا کہ علامہ شبلی نے وفات پائی، مگر ان کا یہ خیال اوران کی تمنائیں رائیگاں نہیں گئیں۔ان کے تلامذہ نے ان کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کردکھایا۔وفات کے تین دن بعد مولانا حمیدالدین فراہی کی سربراہی میں اخوان الصفاء قائم ہوئی اوردارالمصنفین کے نظم وانصرام کے لئے درج ذیل اشخاص پر مشتمل انتظامیہ وجود میں آئی:

۱۔صدر : مولانا حمیدالدین فراہی

۲۔ناظم : مولانا سید سلیمان ندوی

۳۔رکن : مولانا مسعودعلی ندوی

۴۔رکن : مولانا عبدلسلام ندوی

۵۔رکن : مولانا شبلی متکلم ندوی

ان تلامذہ شبلی نے دارالمصنفین کو اپنے خون جگر سے سینچا اوراسے ایک علمی مملکت بنا ڈالا۔خاص طور پر مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعودعلی ندوی نے اس کے بام ودرسنوارنے میں اپنی تمام صلاحیتیں اورزندگیاں صرف کردیں اورثابت کردیا کہ

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اس مقالے میں دارالمصنفین کے قیام سے ۱۹۷۰ء تک کی خدمات کاایک اجمالی مرقع پیش کیا ہے۔انہوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کی درج ذیل تحریر پر جوانہوں نے فروری ۱۹۶۴ء میں دارالمصنفین کے جشن طلائی کے موقع پر پیش کی تھی اپنی بات مکمل کی ہے:

''شبلی،روح پرفتوح والے شبلی!تو خوش ہوکہ آج تیری یادمنانے کے لئے ملک وملت کے اتنے چیدہ ومنتخب خوش مذاق علم دوست، بوڑھے اور جوان تیرے مزار پراور تیرے تصنیف کدہ پر جمع ہوئے ہیں۔تو جو چراغ جلا گیا تھا،اس سے بے شمار چراغ آج تک جل چکے ہیں اور آئندہ بھی جلتے رہیں گے، رحمت کے فرشتے ان کی عقیدت مندانہ سرگرمیاں تجھ تک

پہنچائیں گے تو مصنف ہی نہ تھا مصنف گر بھی تھا۔ عالم ہی نہ تھا معلم بھی تھا۔ تاریخ نگار ہی نہ تھا تاریخ ساز بھی تھا۔ حق تھا کہ دارالمصنفین سا ادارہ تصنیف و تالیف تو قائم کرتا اور دارالمصنفین کا حق تھا کہ وہ تیری یاد کی شمع روشن رکھے اور تیری ہی راہ پر چل کر ملک وملت، دین وعلم کی خدمت اسی طرح بجالاتا۔'' (کریسنٹ لاہور، شبلی نمبر ص ۱۰۹)

علامہ شبلی کی اردو شاعری پر کئی مضامین شامل ہیں۔ پروفیسر محمد طفیل دارا[۱۹۲۳ - ۱۹۹۷ء] نے شبلی کی شاعری کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ خاص طور پر علامہ شبلی کی دینی وملی اور سیاسی شاعری کے بیشتر نمونوں کو نقل کر کے ان کا پس منظر بیان کرنے کے ساتھ ان کے فکر وخیال کی تشریح وتوضیح کی ہے۔ شبلی کی مثنوی صبح امید کے پس منظر میں لکھا ہے کہ

''مولانا شبلی کے سینے میں ایک مرد مجاہد کا دل دھڑکتا تھا۔ اور ایک مرد مجاہد خدا کے سوا کسی بھی دوسری ہستی سے مدد کا طالب نہیں ہوتا۔ مولانا شبلی کی یہ خصوصیات نثر ونظم دونوں میں جاری وساری ہیں۔ مولانا کا یہ انداز فکر اس لئے تھا کہ مسلمان خدا کے سوا جس طاقت کے سامنے بھی جھکے گا، یا جس دروازے پر بھی دستک دے گا وہ غیر اسلامی ہوگا۔ اور کوئی مسلمان بھی اپنے فکر واعمال میں غیر اسلامی پیوند برداشت نہیں کرسکتا۔ اپنی اسی فکری فضا میں بستے ہوئے مولانا نے یہاں بھی مسلمانوں کو دوسروں کے احسان سے محفوظ رہنے اور خدا کے بھروسے پر اپنی مدد آپ کرنے کی تلقین کی ہے۔'' (کریسنٹ، شبلی نمبر ص ۲۱۹)

حفیظ مینائی نے ''شبلی اور علی گڑھ تحریک'' کے عنوان سے مقالہ لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے پہلے علی گڑھ تحریک کے بنیادی نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے، پھر شبلی کی اس تحریک سے وابستگی اور سرسید سے ان کے روابط کا ذکر کیا ہے۔ اس عہد کے قومی و مذہبی انداز فکر کو نمایاں کیا ہے۔ انہوں نے شبلی کو علی گڑھ تحریک کا مخالف قرار دیا ہے۔ اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

''اگر شبلی جوش جذبات میں علی گڑھ سے انحراف کرنے کے بجائے ترکیبی انداز سے عقل و دل کو ہم آہنگ کرنے اور زمانے کے نئے وجدان انگیز تقاضوں کو علی گڑھ تحریک کے اصلاحی منصوبوں میں سمو دینے کی کوشش کرتے تو غالباً وہ کہیں زیادہ کامیاب ہوتے۔ شبلی کا صحیح مقام طرز قدیم کے علماء میں تھا ہی نہیں، وہ اپنی تخلیقی افتاد، مزاج، اعلیٰ معیار کے ذوق اجتہاد اور شائستہ ترکیبی انداز فکر کی بدولت جدید طرز کے تعلیم یافتہ افراد کی رہنمائی کے لئے صحیح طور پر موزوں تھے۔ نئی راہ نکالنے کے بجائے شبلی نے اگر سرسید کے میدان فکر و عمل کو اپنی جولانی طبع کے فیضان سے شاداب و شگفتہ بنانے کی کوشش کی ہوتی تو اسلامی فکر کے ارتقا اور نئی نسل کی معیاری ذہنی تربیت کے نقطہ نظر سے کہیں زیادہ خوش گوار نتائج نکلتے۔'' (کریسنٹ لاہور شبلی نمبر ص ۲۴۰-۲۴۱)

یہ علامہ شبلی کی زندگی کا بڑا اہم گوشہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر متعدد مضامین و مقالات لکھے گئے ہیں۔ محمد فاروق دیوانے تو ایک مستقل کتاب ''سرسید و شبلی'' لکھ دی ہے مگر جس طرح حفیظ مینائی صحیح تجزیہ کرنے میں ناکام رہے، اسی طرح کئی اور اہل قلم بھی موضوع کا حق ادا نہیں کر سکے ہیں۔ اس میں ان کا قصور کم اور ابتدائی تجزیہ نگاروں کا زیادہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شبلی، سرسید اور ان کی تحریک کے کبھی مخالف نہیں رہے۔ اس کی اہمیت پہلے دن سے ان پر واضح تھی۔ اور اخیر تک ان کے موقف میں تبدیلی نہیں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں جدید تعلیم کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں ملتا۔ اسی طرح زندگی بھر سرسید کے احترام میں انہوں نے کمی نہیں کی۔ ہاں! دونوں کے نقطہ نظر میں کسی قدر فرق ضرور تھا اور یہ فرق، فرق تھا مخالفت کبھی نہیں بنا۔

شبلی ندوہ تحریک کے سب سے بڑے حامی تھے۔ اور اس لئے حامی تھے کہ ان کا پہلے دن سے یہ خیال تھا کہ جب تک قدیم و جدید کے ڈانڈے نہ ملیں گے اصل ترقی معدوم رہے

گی۔ بنظر غائر دیکھا جائے تو علی گڑھ تحریک کے نظریہ تعلیم پر یہ ایک اضافہ تھا۔ سر سید نے اس کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ تحریک ندوہ ان کے سامنے وجود میں آئی، مگر انہوں نے اس کی مخالفت نہیں بلکہ تائید کی۔ شبلی ان کے سامنے ہی تحریک ندوہ میں شامل ہوئے۔ یہاں تک کہ ندوہ میں وہ مستقل قیام کرنا چاہتے تھے، مگر جس طرح سر سید نے الفاروق کے سلسلے میں ایک موقف اختیار کیا اور چاہا کہ شبلی الفاروق کے بجائے الغزالی لکھیں، تحریک ندوہ کے سلسلے میں انہوں نے اس طرح کی کوئی رائے قائم نہیں کی، اور نہ شبلی کو منع کیا۔ سر سید کی وفات کے بعد شبلی نے علی گڑھ کالج چھوڑا لیکن بوجوہ ندوہ سے وابستہ نہ ہو سکے اور حیدر آباد کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے جو بنیادی کام کیا وہ سلسلہ علم الکلام کی تصنیفات ہیں۔ اہل علم بخوبی واقف ہیں کہ اس کی ابتداء سر سید اور مولوی چراغ علی نے کی تھی، اس کی تکمیل گویا سر سید کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ پھر الغزالی مکمل کی۔ وہ بھی سر سید کی خواہش کی تکمیل تھی۔ اس کے بعد وہ ندوہ آئے اور پیر توڑ کر بیٹھ گئے اور اپنی تمام صلاحیتیں اس کی ترقی میں لگا دیں۔ بظاہر ندوہ دیوبند کا مخالف نہیں تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں کے نقطہ نظر میں ایک بنیادی فرق تھا، اور یہی فرق شبلی کے قلم سے بھی نمایاں ہوا۔ ندوہ سے بعض ایسے علماء وابستہ تھے جو اگرچہ بظاہر تحریک ندوہ کے حامی تھے مگر ان کے ذہن تحریک ندوہ کی روشن خیالی اور اصلاح و تغیر کے نظریہ سے نا آشنا تھے۔ چنانچہ وہ شبلی کی روشن خیالی اور وسعت نظری کو برداشت نہ کر سکے اور اپنی تنگ نظری کا مظاہرہ کیا اور شبلی کی شدید مخالفت کی۔ جو دراصل تحریک ندوہ کی مخالفت تھی، اس کی پشت پناہی بعض قدیم علما نے کی، اس میں علمائے دیوبند کا بھی ایک گروہ شامل تھا۔ اور اس کے نمائندہ مولوی عبدالحق حقانی اور مولوی خلیل الرحمٰن سہارن پوری تھے۔ جن کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ شبلی کی توجہ بار بار ان کی طرف دلائی گئی مگر انہوں نے کارروائی سے روکا اور بالآخر وہ اس قدر بااثر ہو گئے کہ شبلی کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ اس میں اوروں کے ساتھ علی گڑھ کے بعض ذمہ دار بھی شامل تھے۔ سر سید اور نواب محسن الملک دنیا سے جا چکے تھے۔ ان کے ایک جانشین صاحبزادہ آفتاب احمد نے بعض معاملات میں علامہ شبلی کے مخالفین کی ہم نوائی کی۔ ستم

ظریفی یہ ہے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد اوران کے ہم نواؤں کے خلاف جو باتیں مکاتیب شبلی وغیرہ میں ملتی ہیں، انہیں علی گڑھ تحریک کے خلاف تصور کرلیا گیا۔ حالانکہ اسی دور میں شبلی نے یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے اجلاسوں میں پابندی سے شرکت کی اور کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تگ ودو میں وہ پورے طور پر ساتھ رہے۔

حیات شبلی کے مصنف مولانا سید سلیمان ندوی نے شبلی کی زندگی کا یہی دور دیکھا تھا۔ ان کو اپنے استاذ سے بے پناہ عقیدت تھی۔ چنانچہ حیات شبلی میں انہوں نے اس دور کی عکاسی کی تو بعض جزئی واقعات میں سرسید و شبلی کے عدم اتفاق کو اختلاف سے تعبیر کیا اور فطری طور پر تقریباً تمام مواقع پر شبلی کے نقطہ نظر کو درست ٹھہرایا اور ان کی برتری ثابت کی۔ جس کا نتیجہ یہ اخذ کیا گیا کہ سید سلیمان ندوی نے شبلی کو سرسید کا مدمقابل قرار دیا ہے۔ اس سے علی گڑھ کے بعض نام نہاد ہمدردوں کو مخالفت کا موقع ہاتھ آ گیا اور انہوں نے حیات شبلی پر بڑے جارحانہ حملے کئے۔ امین زبیری نے حیات شبلی کے جواب میں ذکر شبلی کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی۔ اس میں انہوں نے مولانا سید سلیمان ندوی اور ان کی تصنیف حیات شبلی کے بجائے شبلی کی عظمت اور شخصیت کو مطعون کیا۔ اور پھر یہ ایک سلسلہ قائم ہو گیا کہ جو بھی سرسید اور شبلی یا شبلی اور علی گڑھ تحریک پر قلم اٹھاتا ہے وہ سرسید یا شبلی پر مخالفانہ یا موافقانہ رائے ظاہر کر دیتا ہے اور سرسید و شبلی کے اصل تعلقات اور نظریات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ سرسید و شبلی کے ایک دوسرے سے عقیدت واحترام کی صحیح داستان ان کی تحریروں کی روشنی میں قلم بند کی جائے۔

شبلی نے سرسید اور علی گڑھ سے بہت کچھ سیکھا اور کالج کو ان سے بہت کچھ فائدہ بھی پہنچا۔ شبلی و سرسید کی تحریروں میں یہ باتیں اصل صورت میں موجود ہیں۔ ان کے صحیح تجزیہ کے بعد جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ شبلی سرسید سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ ان کے ساتھ رہ کر شعور و دانش کی بہت سی منزلیں طے کیں۔ وہ سرسید کے بڑے مداحوں میں تھے۔ خود سرسید انہیں بہت عزیز رکھتے۔ البتہ وہ سرسید تحریک میں پورے طور پر شامل ہونے اور ترقی دینے کے

باوجود اس سے مرعوب نہیں ہوئے۔ اور انہوں نے بھی مسلمانوں کی ترقی کا ایک خواب دیکھا، جس میں صرف جدید ہی جدید نہ تھا بلکہ قدیم ورثہ بھی شامل تھا، لیکن جن لوگوں (علماء) سے کٹ کر رہنا شبلی کے لئے گوارا نہ تھا انہیں شبلی ہی گوارا نہ تھے۔ سچی بات یہی ہے کہ علی گڑھ تحریک نے شبلی کو شبلی بنایا اور اسی تحریک کی نئی نسل نے ان کو سر آنکھوں پر بٹھایا اور شبلی نے جن کے لئے علی گڑھ کا تخت چھوڑ کر ندوہ کی بوریہ نشینی اختیار کی تھی وہ ان کے ساتھ چل نہ سکے۔ البتہ یہاں یہ ذکر نا مناسب نہ ہوگا کہ شبلی کے ندوہ نے بڑی مقبولیت پائی۔ عربوں تک اس کا شہرہ شبلی ہی نے پہنچایا۔ اور رشید رضا کے المنار کے ذریعہ اسے پورے عالم اسلام سے روشناس کرایا۔ نیز اس کے چشمہ علم سے سیراب ہونے والوں نے شبلی کو ہمیشہ اپنے دل کے قریب رکھا اور آج بھی فضلائے ندوہ کے فکری رہنما علامہ شبلی ہی ہیں۔

ذکر شبلی و سرسید کے بعد عابد نظامی نے ''شبلی اور حالی'' کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایک عمدہ مطالعہ اور صحیح نقطہ نظر سے لکھا گیا مقالہ ہے۔ اس میں انہوں نے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ ان دونوں بزرگوں میں کسی طرح کا کوئی اختلاف نہ تھا۔ دونوں میں اخیر تک بہت اچھے تعلقات قائم رہے اور دونوں ایک دوسرے کے بڑے قدرداں تھے۔ انہوں نے اپنے موقف کی تائید میں دونوں کی تحریریں پیش کی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ معاصرانہ چشمک کا قصہ تفریح طبع کے لئے مہدی افادی نے گھڑا تھا اور بعض لوگوں نے اسے قطعی خیال کر کے ایک ناگوار شکل دیدی۔ عابد نظامی نے لکھا ہے کہ

> ''یہ ایک افسوس ناک روش یہاں تک بڑھی کی حالی اور شبلی دو الگ الگ مکتبہ فکر قرار پائے۔ حالانکہ حالی اور شبلی کے نجی اور ادبی تعلقات پر نظر ڈالیں تو ہمیں اختلاف یا چشمک نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی بلکہ دونوں میں غایت درجہ محبت معلوم ہوتی ہے۔'' (کریسنٹ شبلی نمبر ص ۲۴۲)

سرسید کی سوانح عمری ''حیات جاوید'' پر شبلی کے نقطہ نظر سے اہل علم واقف ہیں۔ وہ شبلی کو پسند نہ تھی۔ اسے انہوں نے کتاب المناقب اور مدلل مداحی قرار دیا تھا۔ اس کا ذکر اہل قلم

کرتے رہے ہیں، مگر پروفیسر آل احمد سرور کے الفاظ میں معاملہ صرف یہ ہے کہ علامہ شبلی کو ''مصور پسند تھا، اس کی بنائی ہوئی ایک تصویر پسند نہ تھی۔''

علامہ شبلی کی تصنیفات کے عنوان سے ممتاز منگلوری نے تصانیف شبلی کا عمومی تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان کی نوعیت، جہات اور اقسام کا ذکر کیا ہے۔ شبلی کے قیام علی گڑھ کی تصانیف کو دور اول اور اس کے بعد کی تصانیف کو دوسرے دور میں شامل کیا ہے۔ ہر دوادوار کی تصانیف میں سوانح، تاریخ، ادب، فلسفہ، شاعری اور ادبی تاریخ وغیرہ موضوعات شامل ہیں، اس لئے ان پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔ البتہ چونکہ شبلی کا بیشتر اہم سوانحی سرمایہ المامون والفاروق وغیرہ سوانح سے زیادہ تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس لئے ان تمام انواع واقسام کا مختلف نوعیتوں سے تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ان کے نزدیک شبلی کا ایک بڑا کارنامہ فلسفہ تاریخ کی تدوین ہے۔ اس میں وہ ابن خلدون کی صف میں نظر آتے ہیں۔ (کریسنٹ شبلی نمبر ص ۲۵۵) ممتاز منگلوری نے شبلی کے فلسفہ تاریخ کا سماجی اور معاشرتی نقطہ نظر سے بھی مطالعہ کی کوشش کی ہے۔ علامہ شبلی کی مورخانہ بصیرت پر یہ ایک عمدہ مقالہ ہے۔

اس کے بعد تاج الدین طیش نے الفاروق پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ الفاروق کے مندرجات کے تعارف وتجزیہ کے ساتھ خصوصیت سے انہوں نے شبلی کے بعض نظریات تاریخ کا ذکر کیا ہے اور ان کی افادیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ بنیادی کتب وماخذ، قدیم تاریخوں کے نقائص اور اس کے اسباب، واقعات کی صحت کا معیار، الفاروق کی ترتیب اور اصول تحریر، حضرت عمرؓ کا نام ونسب، سن رشد وتربیت، ولادت باسعادت، سن رشد، قبول اسلام، اذان کا طریقہ اور حضرت عمرؓ کی رائے، غزوات میں شمولیت، غیرت وحمیت اسلام، فتوحات عہد فاروقی، ابومجن ثقفی کی شجاعت، بہرہ شہر اور دیواں آمد ند، حضرت عمرؓ کا بیت المقدس جانا، حضرت عمرؓ کی فتوحات کے اسباب، نظام حکومت، عام رعایا کی مداخلت، محکمہ عدالت، احکام عدالت، بیت المال، رفاہ عامہ، صیغہ فوج، صیغہ تعلیم، طریقہ تعلیم، حضرت عمرؓ کے ذاتی حالات اور اخلاق وعادات، مذاق شاعری، لطیفہ، علم الانساب، ذہانت وطباعی،

حکیمانہ مقولے، صایب الرائے ہونا، مذہبی زندگی، بے تعصبی، ارباب صحبت، اخلاق و عادات میں تواضع و سادگی، زندہ دلی، مزاج میں سختی وغیرہ مقالے کے ذیلی عنوانات ہیں۔ یہ دراصل الفاروق کے عنوانات ہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے کتاب کا ایک عمومی تجزیہ پیش کر دیا ہے۔

حصہ فکر ونظر کا آخری مضمون ش عباسی کے قلم سے ''شبلی کا ادبی مرتبہ'' ہے۔ انہوں نے شبلی کی ادبی کاوشوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے ادبی درجے کا تعین ان الفاظ میں کیا ہے:

''شبلی کے ادبی مقام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آج تک اردو ادب ان کا ثانی نہ پیدا کر سکا۔ درحقیقت ایسے باکمال انسان زمانہ صدیوں میں پیدا کرتا ہے۔'' (کریسنٹ شبلی نمبر ص ۲۹۳)

کریسنٹ کے مدیر نے ''فکر ونظر'' کے بعد اظہار عقیدت کے عنوان سے چند منظومات پیش کی ہیں۔ ان کی فہرست یہ ہے:

۱۔ کسوف الشمسین	احسن مارہروی	ص ۳۰۳
۲۔ ذکر شبلی	خواجہ دل محمد	ص ۳۱۷
۳۔ شبلی نعمانی	سید نظر زیدی	ص ۳۱۸
۴۔ خامہ شبلی	مظہر جعفری	ص ۳۱۹
۵۔ یاد شبلی	سید عبدالجمیل	ص ۳۲۰
۶۔ نذر شبلی	سبطین شاہ جہانی	ص ۳۲۱
۷۔ تضمین شبلی	خالد بزمی	ص ۳۲۲

اس طرح کی تمام منظومات اور ان کے شاعروں کا تذکرہ راقم الحروف کی کتاب ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' شائع ہو چکا ہے، اس لئے یہاں ان سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ''دامان باغباں'' کے عنوان سے وہ مضامین و مقالات شامل کئے گئے ہیں جو اسلامیہ کالج لاہور کے اس وقت کے اساتذہ نے لکھے ہیں۔ یہ حصہ بڑے اہم اور وقیع مقالات پر مشتمل ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلامیہ کالج لاہور کے اساتذہ کس درجہ

علم و تحقیق اور شعر و ادب سے شغف رکھتے تھے اور ان کا علمی و ادبی مذاق کس درجہ پختہ تھا۔

پہلا مقالہ ڈاکٹر اے ڈی ارشد [۱۹۱۲-۱۹۸۶ء] کا ہے۔ اس کا عنوان ''شبلی کا تحقیقی شعور'' ہے۔ اس میں انہوں نے شبلی کی تصنیفات اور مقالات کے حوالے سے علامہ شبلی کے تحقیقی شعور کا تجزیہ کیا ہے۔ پہلے تحقیق و تنقید اور اس کے فرق کو واضح کیا ہے پھر اردو تحقیق کا ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں علامہ شبلی کے تحقیقی سرمایے اور ان کی تحقیقی بصیرت پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ

> ''یہ حقیقت ہے کہ شبلی گہرا تحقیقی شعور رکھتے تھے۔ جسے ان کے مخصوص انفرادی اور اجتماعی حالات نے تقویت دی۔ شبلی کا زمانہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں نشأۃ ثانیہ کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کو سرسید جیسا راہ بر ملا، جس کے کارناموں نے شبلی کے تحقیقی شعور کو جلا دی۔ مغربی تہذیب کے زیر اثر جو فضا ملک اور دنیا میں پیدا ہو رہی تھی وہ بھی شبلی کے یہاں تحقیقی کام کے لئے وجہ تحریک ثابت ہوئی۔ علاوہ ازیں شبلی نے بہت سے اعلیٰ علوم و فنون بڑے انہماک سے حاصل کئے تھے۔ انہوں نے بھی شبلی کے تحقیقی کام میں زبردست اعانت کی۔ ہندوستان میں اسلامی معاشرہ کی تشکیل نو کے تقاضے بھی شبلی کے تحقیقی شعور کی نشو و نما کا موجب بنے۔ ان تمام محرکات نے شبلی کو ایک اعلیٰ پایہ کے تحقیقی شعور سے آشنا کیا، جس سے شبلی نے نظریاتی اور عملی دونوں صورتوں میں قابل قدر نتائج استنباط کر کے اہل علم کے سامنے پیش کئے۔''
>
> (کریسنٹ، شبلی نمبر ص ۳۲۵-۳۲۶)

ان محرکات کے بعد شبلی کے تحقیقی سرمایے اور خاص طور پر ان کی تصنیفات کا ذکر ہے۔ شعر العجم سے آغاز کیا ہے۔ حافظ محمود شیرانی کے اعتراضات نقل کئے ہیں اور پھر ان سے کیا چوک ہوئی اس کا ذکر ہے اور اسے تصویر کا دوسرا رخ نام دیا ہے۔ پھر موازنہ انیس و دبیر، سوانح

مولانا روم، الفاروق، مضامین عالم گیر، الانتقاد کے تحقیقی پہلوؤں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ نیز سوانح نگاری میں اجتہاد، نظریہ تحقیق اور تاریخی تحقیقات پر ضمناً بحث کی ہے۔ آخر میں علامہ شبلی کی اہم تحقیقات جس نے انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کیا مثلاً کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کے الزام کی تردید، الجزیہ، اسلامی کتب خانے اور یورپ اور قرآن کے عدیم الصحت ہونے کے دعویٰ کی تردید میں انہوں نے جو مقالے لکھے تھے اس سے بحث کرکے ثابت کیا ہے کہ شبلی کا تحقیقی شعور بہت بلند تھا اور وہ اپنے عہد کے ایک بڑے محقق تھے۔

علامہ شبلی کا سب سے اہم اور عظیم الشان کارنامہ سیرت نبویؐ کی تالیف وتصنیف ہے۔ نذیر احمد خواجہ [م: ۳۰ رنومبر ۱۹۷۹ء] نے سیرۃ النبیؐ کی اہمیت، افادیت اور علامہ شبلی کی انفرادیت وغیرہ پر ایک عمدہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ مقالہ نگار نے سیرۃ النبی کا پہلی بار اس وقت مطالعہ کیا تھا جب وہ درجہ ہشتم کے طالب علم تھے۔ اس کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''شبلی کی سیرۃ النبیؐ پڑھ کر جو لذت ملی تھی آج تک اس کی حلاوت قائم ہے۔ یہ کتاب میری زندگی کو ایک خاص نہج پر ڈالنے اور ایک خاص انداز اختیار کرنے میں بے حد مفید رہی۔ اس کتاب نے میرے دل کی رگ و پے میں اور خون کے ایک ایک قطرے میں جو رسول خدا کی محبت بھر دی، اس کے لئے میں مولانا شبلی کا کسی طرح بھی شکریہ ادا کرنے کے قابل نہیں۔ یوں تو شبلی نے اور کئی ایسے کام کئے ہیں جن کے باعث وہ یقیناً جنت میں ہوں گے مگر جس چیز نے ان کو لازماً جنت کا حق دار بنا دیا ہوگا وہ ان کی یہی کتاب سیرۃ النبی ہے جو کئی انسانوں کی زندگی کو نئے موڑ عطا کرنے میں کامیاب رہی ہے۔'' (ایضاً ص ۳۴۵)

اس کے بعد مقالہ نگار نے سیرۃ النبی کے دیباچے سے لے کر خاتمہ کتاب تک کے تمام مباحث کا تعارف و تجزیہ پیش کیا ہے۔ جابجا اقتباسات نقل کئے ہیں۔ شبلی کے نقطہ نظر کی

وضاحت کی ہے۔شبلی کی تحقیقات کا ذکر کیا ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کو علامہ شبلی نے ظہور قدسی کا عنوان دیا ہے اور ایک بڑی پر اثر تحریر لکھی ہے، اسے مقالہ نگار نے نقل کیا ہے۔اہمیت کے پیش نظر اسے یہاں بھی نقل کیا جاتا ہے۔

''چمنستان دہر میں بار ہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں۔چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے۔سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔کارکنان قضا وقدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، ابرو باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجز طرازی موسوی، جاں نوازی مسیح، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز شاہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے، ارباب سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ'' آج کی رات ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدہ فارس بجھ گیا لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے، آتش کدہ فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدہ کفر، آزر کدہ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا۔چمنستان سعادت میں بہار آگئی۔آفتاب ہدایت کی

شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں۔اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔" (سیرۃ النبی جلد اول ص۱۱۴، طبع جدید)

شبلی کے قلم نے سیرت نبویؐ کے ایک ایک پہلو کی جس خوبصورتی سے ترجمانی کی ہے، فاضل مقالہ نگار نے تقریباً اسی انداز میں انہیں نقل کر کے سیرۃ النبیؐ کا ایک خوب صورت اور دل پذیر مرقع تیار کر دیا ہے۔اور ساتھ میں شبلی کی سیرۃ النبیؐ کی عظمت کے ذکر کے ساتھ خود شبلی کی شخصیت، عظمت اور سیرت نگاری میں منفرد مقام کو واضح کیا ہے۔

"شبلی اور علم الکلام" معراج الدین احمد کے مقالے کا عنوان ہے۔اس میں انہوں نے شبلی کی دو اہم کتابوں کا تعارف اور اس کے مشمولات کا ذکر کیا ہے اور تنقیدی نقطہ نظر سے شبلی کے علم کلام پر روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے ان دونوں کتابوں کے بنیادی مباحث کو جن کا گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے۔تفصیل سے بیان کیا ہے۔خوبیوں کے ساتھ ساتھ بعض کمیاں بھی دکھلائی ہیں اور اقبال سلیم گاہندری [۱۹۱۵-۱۹۸۱ء] کے الفاظ میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

"یہ دونوں کتابیں (علم الکلام والکلام) علم کلام کی تاریخ، متکلمین اسلام کا تذکرہ اور ایک جدید علم کلام پر مشتمل ہیں۔اس موضوع پر ان سے بہتر کتاب آپ کو نہ اردو میں مل سکتی ہیں اور نہ ترکی وانگریزی میں۔فارسی کا تو ذکر ہی کیا عربی میں بھی اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔" (ایضاً ۳۸۰)

شبلی کی الکلام اور علم الکلام ظاہر ہے ادبی موضوعات کے مقابلہ میں انتہائی خشک اور دقیق مذہبی مباحث پر مشتمل ہیں۔ان میں اسلوب کی باد بہاری دکھلانا آسان نہیں، لیکن مقالہ نگار نے ان کی اس خوبی کا ذکر کیا ہے اور اقبال سلیم گاہندری ہی کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ "شبلی کے اسلوب نگارش میں سلاست و شگفتگی اور شکوہ کا ایسا خوش گوار امتزاج پایا جاتا ہے کہ کسی دوسری جگہ اس کی مثال نہیں ملتی۔" (کریسنٹ شبلی نمبر ۳۸۰)

دوسری جگہ سے مراد اگر شبلی کی تصنیفات اور تحریریں ہیں تو یہ قطعی طور پر درست نہیں کہ کیوں کہ الکلام و علم الکلام کے مقابلہ میں شبلی کی دیگر کتابیں بالخصوص الفاروق، شعر العجم اور

سیرۃ النبیؐ زیادہ ادبی رعنائی اور جمالیاتی عناصر سے لبریز ہیں۔

ایک مضمون میں محمد شریف ہلال نے لکھا ہے کہ:

''مولانا شبلی کو جب ہم یونانی کہتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو ذہن رسا دے رکھا تھا وہ کسی طرح بھی کسی یونانی سے کم نہیں۔ وہ ایک مورخ، ایک انشا پرداز، نقاد، سوانح نگار، فلاسفر، شاعر، رہبر، غرض بھی کچھ تھے۔ سرزمین پاک و ہند میں ایسی خصوصیات کا حامل کوئی نہیں تھا۔'' (کریسنٹ شبلی نمبر ص ۳۸۳)

پھر انہوں نے شبلی کے ذوق جمال کا ذکر کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شبلی انسان تھے، فرشتہ نہیں۔ وہ جمالیات کا ذوق لے کر پیدا ہی ہوئے تھے۔ ان کے الفاظ میں:

''شبلی اگر ایک طرف جید عالم ہیں تو دوسری طرف ایک دھڑکتا ہوا دل بھی رکھتے ہیں۔ انہوں نے دل کی دھڑکنوں کو سنا اور اس کے سروں کو صفحہ قرطاس پر بکھیرا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

من کہ در سینہ دلے دارم و شیدا چہ کنم ‏ ‏ ‏ ‏ میل بالالہ رخاں گر نہ کنم تا چہ کنم؟

شبلی کے ذوق جمال کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا۔''

(کریسنٹ شبلی نمبر ص ۳۸۴)

اس کے بعد محمد شریف ہلال نے نظریات حسن بیان کئے ہیں۔ خاص طور پر حکمائے یونان کے نظریہ حسن کی وضاحت کی ہے اور اسے ایک مشاہدہ قرار دیا ہے۔ انہوں نے حسن کی تین صورتیں بتائی ہیں:

۱۔ جذبات میں منجذب ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔

۲۔ جذبات میں منجذب ہو کر ایک حد تک زندہ رہتا ہے۔

۳۔ مادی رنگ میں آ کر کوئی اور صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اور پھر لکھا ہے کہ ''حسن'' کے مشاہدہ کی یہ تینوں صورتیں شبلی کی شاعری میں نظر آتی

ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اس مشاہدے سے جس قدر لطف اندوز ہوتے ہیں اس کا اظہار بعینہ کر دیتے ہیں۔" (کریسنٹ شبلی نمبر ص ۳۸۵)

انہوں نے مشاہدہ حسن کی دو صورتیں قرار دی ہیں:

۱۔ خارجی ۲۔ داخلی

خارجی و داخلی حسن کے معنی و مفہوم واضح کر کے ان دونوں صورتوں کو شبلی کی تحریروں میں تلاش کیا ہے۔ اور یہ رائے قائم کی ہے کہ

"شبلی بھی خارج سے مواد لیتے ہیں۔ وہ بمبئی جاتے ہیں، مناظر فطرت اور مظاہر قدرت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اپالو اور چوپاٹی کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔" (کریسنٹ، لاہور شبلی نمبر ص ۳۸۵-۳۸۶)

خارجی حسن کے بعد داخلی حسن کا تجزیہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"شبلی ایک انسان تھے اور انسان طبعاً حسن شناس، حسن پرست اور حسن آفریں ہے۔ حسن اور عشق اس کے فطری عناصر ہیں۔ وہ جہاں بھی حسن کو دیکھے گا خواہ وہ حسن کسی دوشیزہ کے خدوخال اور رنگ و روپ میں ہو، یا کسی موسیقار کی لے میں ہو، یا کسی سنگ تراش کے مجسمے میں ہو، یا کسی شاعر کی شاعری میں ہو، وہ اگر اس کی پرستش نہیں کرے گا تو اس کو سراہے گا ضرور۔ شبلی بدذوق نہ تھے، اس لئے اگر انہوں نے انا اول العابدین کہہ بھی دیا تو کیا ہوا، چوپاٹی اور اپالو کے حسینوں کا ذکر کیا تو کیا ہوا۔ انہوں نے ریا کا لبادہ نہیں اوڑھا اور حافظ کے اس شعر کے مصداق:

چوں بہ خلوت می روند آں کارے دیگری کنند

کوئی ایسا کام نہیں کیا جو ان کی پیشانی پر سیاہ داغ بن جاتا۔ یہ حسن کا ایک داخلی عمل تھا جو جذبات و تخیل کی وجہ سے ان کے کلام میں بکھرا پڑا ہے۔"

(کریسنٹ، لاہور، شبلی نمبر ص ۳۹۰)

شریف صاحب نے داخلی حسن کے تجزیے میں ''بمبئیات'' ہی کو نہیں پیش کیا ہے، بلکہ حسن داخلی کے سلسلے میں شبلی کے دل میں اسلام کی عظمت، دینی حمیت وغیرت، اسلام اور شعائر اسلامی سے جذباتی وابستگی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عقیدت وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ان کے الفاظ میں:

''شبلی کو جہاں کہیں اسلام کی عظمت دکھانا مقصود ہو یا کسی ایسی ہستی کا ذکر کرنا ہو جس سے ان کو عقیدت ہی نہ ہو بلکہ عشق ہو تو شبلی کا قلم ایسے ایسے گل و لالہ کھلاتا ہے کہ اس کے ذوق جمال کی داد دینے کے لئے عاجز آجاتے ہیں۔'' (کریسنٹ، لاہور، شبلی نمبر ص ۳۹۰)

انہوں نے اپنے موقف کی تائید میں سیرۃ النبی سے ظہور قدسی کا مشہور اقتباس بھی نقل کیا ہے۔آخر میں میں حسن کے معیار و مذاق اور اس کے مختلف طبائع کا ذکر کیا ہے۔ یہاں ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ معاندین شبلی بالخصوص ڈاکٹر وحید قریشی نے نفسیاتی تنقید کے نام پر شبلی کے پاک دامن کو داغدار کرنے کی جو کوشش کی ہے، محمد شریف بلال اس سے اتفاق نہیں کرتے۔انہوں نے لکھا ہے کہ اس کے خلاف شبلی کی صفائی میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

بہر حال شبلی کے جمالیاتی ادب پر مختصر ہی سہی یہ ایک عمدہ مقالہ ہے۔

کریسنٹ کے اس شبلی نمبر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں علامہ شبلی کی شخصیت کے نئے نئے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔یہاں حمید کوثر کے مضمون ''شبلی کے مقاصد حیات'' کا ذکر کیا جاتا ہے۔حمید کوثر نے شبلی کے پانچ مقاصد حیات کا ذکر کیا ہے۔اور اس قدر مبہم انداز میں کیا ہے کہ اس کی وضاحت مشکل ہے۔پانچویں مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ:

''شبلی کا پانچواں مقصد تعلیم کو ان بنیادوں پر استوار کرنا تھا جو خالص اسلامی ہوں۔سرسید احمد خاں کے نظریہ تعلیم سے وہ جداگانہ اور عالمانہ ماحول پیدا

کرنا چاہتے تھے۔ وہ انگریزی لکھنے بولنے یا پڑھنے والے نہیں (؟) بلکہ علماء پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ندوۃ العلماء کا نام ہی ان کے اس عظیم مقصد پر دلالت کرتا ہے اور حق یہ ہے کہ دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ندوۃ العلماء کے ذریعہ جس قدر عظیم شخصیتیں مسلمانوں میں پیدا ہوئیں، علی گڑھ سے حاصل نہ ہوسکیں، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ علی گڑھ مسلم کالج کے بانیوں کا ہم رتبہ بھی وہاں سے کوئی نہ اٹھا اور مسلمانان ہند پر ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین غالب آ گئے۔'' (کریسنٹ لاہور شبلی نمبر ص ۳۹۶-۳۹۷)

تقریباً اسی انداز میں انہوں نے پورا مضمون لکھا ہے۔ ظاہر ہے یہ ان کے سرسری مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد ایک مختصر سا مضمون ''انشائے شبلی'' محمد بشیر چٹھ کے قلم سے ہے، البتہ اس کے بعد رفیق احمد خاں [۱۹۲۱-۱۹۸۳ء] نے ''شبلی ایک نظم گو'' میں علامہ شبلی کی نظم نگاری کا اچھا تجزیہ کیا ہے۔ اور قدرے تفصیل سے شبلی کی نظم نگاری کی خوبیاں واضح کی ہیں۔ مثال میں منظومات شبلی کے متعدد بند نقل کئے ہیں۔ ان کی تشریحات کے ساتھ ان کا پس منظر بھی بیان کیا ہے اور حق یہ ہے کہ موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ ۶۲ صفحات پر مشتمل یہ مقالہ ایک کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طویل مقالے کا تجزیہ بھی طویل ہوسکتا ہے، اس لئے یہاں اس کے دو اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں:

۱۔ ''شبلی کی سیاسی نظموں میں ایک خاص رنگ ہے جو صرف انہی کا حصہ ہے۔ جذبہ کی شدت، دلیل و برہان کا زور اور انداز بیان کے حسن کے ساتھ طنزیہ رنگ کی آمیزش اور پھر توازن و اعتدال کی کیفیت ایک نرالی بات اور خاص دلکشی پیدا کرتی ہے۔ انہوں نے اخلاقی و تاریخی موضوعات پر جس انداز میں طبع آزمائی کی ہے، وہ بھی انہی کا حصہ ہے۔ مگر ان کی قادرالکلامی کا اصلی روپ ان کی سیاسی نظموں میں جلوہ گر ہے۔ یہ نظمیں پرسوز بھی ہیں اور پرجوش بھی اور ان کی ڈرامائی کیفیت ان کا خاص وصف

ہے۔قوم میں ان نظموں سے نئی امنگیں اور ولولے بیدار ہوئے۔''

(کریسنٹ، لاہور، شبلی نمبر ص ۴۰۶)

۲۔ ''شبلی مسلمانوں کے زوال اور پس ماندگی کو روایات اسلامی سے بغاوت وانحراف کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ وہ اپنی شاعری میں تاریخ کے حوالہ سے مسلمانوں کو اسلامی شوکت وعظمت اور شاندار ماضی سے متاثر کر کے ان کے اداس اور پریشان قلوب کو بیدار اور پرجوش بنانا چاہتے تھے، جوان کے بزرگوں کی میراث تھی۔'' (کریسنٹ، لاہور، شبلی نمبر ص ۴۰۷)

ان کے علاوہ ''علامہ شبلی ایک تحریک'' بھی اہم مضمون ہے۔ جس میں عہد شبلی سے پہلے کے مسلمانوں کے حالات، شبلی کی عظمت وجامعیت، علی گڑھ سے علاحدگی کے اسباب ندوۃ العلماء کے لئے جدوجہد، سیرۃ النبی کی تالیف وغیرہ موضوعات کا مطالعہ وتجزیہ ہے۔ اور ان تجزیوں کی روشنی میں علامہ شبلی کی تحریکیت واضح کی گئی ہے۔ آغا حیدر نے موازنہ انیس ودبیر کی روشنی میں شبلی کی ناقدانہ حیثیت پر گفتگو کی ہے۔ پروفیسر غلام حسین [۱۸۹۴-۱۹۷۶ء] کے مقالہ میں شبلی کی مورخانہ حیثیت زیر بحث آئی ہے۔ بشیر احمد نے شبلی کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ اس حصہ کا ایک مضمون ''شبلی مکاتیب کے آئینے میں'' ہے۔ یہ کریسنٹ کے مدیر خالد بزمی کے قلم سے ہے اور خاصا طویل ہے، لیکن اس میں کوئی انفرادیت نہیں ہے۔ مکاتیب کے طول طویل اقتباسات کثرت سے نقل کئے گئے ہیں، جن سے کسی خاص پہلو کی وضاحت بھی نہیں ہوتی۔

اس نمبر کا آخری حصہ ''کف گل فروش'' اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ کے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس حصہ میں کل ۱۴ رمضامین ہیں۔ اس میں علی العموم علامہ شبلی کی سیرت وسوانح اور ان کی علمی، دینی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی خدمات نیز ان کی اہم تصانیف کا ذکر ومطالعہ ہے، اس میں بعض بڑے اہم مضامین شامل ہیں۔ اور بعض کے عنوانات بہت اہم ہیں۔ گو طلبہ ان کا حق ادا نہیں کر سکے ہیں تاہم ان کے خیالات اور شبلی کی شخصیت کو بنظر غائر دیکھنے، مطالعہ کرنے اور اپنے خیالات کے اظہار کی جرأت بھی کم اہم نہیں ہے۔ مثلاً حسین ثاقب کے مقالے کا

عنوان ہے ''شبلی ایک مصلح''، مختصر سہی مگر عمدہ خیالات پیش کئے ہیں۔ اور علامہ شبلی کو ایک مصلح قرار دیا ہے۔ اسی طرح سید محمد کلیم نے اپنے مقالے کا عنوان ''شبلی ایک انسان'' رکھا ہے۔ ادریس احمد نے شخصیت اور ادبی کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ شوکت رانا نے جو کریسنٹ کے معاون مرتب ہیں علامہ شبلی کے انداز نگارش کا تجزیہ کیا ہے۔ اور اچھا تجزیہ کیا ہے۔ اس موضوع پر اس نمبر میں کوئی بھی مقالہ شامل نہیں ہے۔ بحیثیت مجموعی طلبہ کے یہ مضامین اسلامیہ کالج کے علمی و ادبی ماحول اور تعلیمی فضا کے عکاس اور شبلی سے گہری عقیدت کا مظہر ہیں۔ ۴۳ رسال قبل یہ نمبر شائع ہوا تھا۔ اس کے مرتبین اور مقالہ نگاروں میں ممکن ہے اب بھی کچھ لوگ موجود ہوں اور اسے ایک طالب علمانہ کوشش قرار دیتے ہوں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کریسنٹ کا یہ نمبر اپنے مشمولات، ضخامت، تنوع مضامین، کسی لحاظ سے ماہنامہ ادیب علی گڑھ کے شبلی نمبر سے کسی طرح کم درجہ نہیں رکھتا بلکہ اسے کئی معنوں میں تفوق بھی حاصل ہے۔ کریسنٹ کا یہ ''شبلی نمبر'' اب نایاب ہے۔ ہندوستان میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں اس کی ایک کاپی محفوظ ہے۔ میرے پیش نظر جو مطبوعہ نسخہ ہے، وہ میرے ایک علم دوست کرم فرما ڈاکٹر محمد عبداللہ صالح مدیر مجلہ جہات الاسلام لاہور کی نوازش ہے۔ یہ نمبر اس لائق ہے کہ اسے کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔

اس نمبر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں علامہ شبلی کی ایک نایاب غزل کا عکس شائع کیا گیا ہے۔ جسے راقم نے اپنی کتاب آثار شبلی میں نقل کیا ہے۔ البتہ اس کے فاضل مدیر نے یہ تصریح نہیں کی ہے کہ یہ غزل انہیں کہاں سے دستیاب ہوئی۔

کریسنٹ کے مرتب نے اس کی اشاعت میں بڑا اہتمام کیا ہے۔ اس وقت تک علامہ شبلی کی جتنی تصویریں دستیاب تھیں ان سب کو اس میں شائع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ہندو پاک کے چند مشاہیر اہل قلم اور متعدد مقالہ نگاروں کی تصویریں بھی اس میں شامل کی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے بھی یہ نمبر انفرادیت کا حامل ہے۔

---

(۸)

ہماری زبان، دہلی

[شبلی نمبر]

[مدیر: ڈاکٹر خلیق انجم، اپریل ۱۹۹۵ء، انجمن ترقی اردو ہند دہلی]

ہفت روزہ ہماری زبان دہلی انجمن ترقی اردو ہند دہلی کا ترجمان ہے۔ انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری علامہ شبلی تھے۔ وہ جنوری ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۵ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ اس دوران انہوں نے انجمن کی بڑی خدمت انجام دی۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری اور مشہور محقق و نقاد ڈاکٹر خلیق انجم نے انجمن کے پہلے محسن کی یاد میں ایک سہ روزہ سمینار ۱۴-۱۶/اپریل ۱۹۹۵ء کو منعقد کیا۔ اس موقع پر انہوں نے ہماری زبان کا ایک شمارہ [۱۵-۲۲/اپریل ۱۹۹۵ء] شبلی نمبر کے طور پر شائع کیا۔ اس میں کل چار مضامین شامل ہیں۔ پہلا مقالہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور ماہر تعلیم جناب سید حامد کے قلم سے ہے۔ اس میں انہوں نے شبلی کی درخشاں زندگی کے چند نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ شروع میں شبلی کی فارسی شاعری کا ذکر ہے۔ پھر فارسی زبان و ادب پر گہری نظر، فہم و شعور اور ان کی گراں مایہ خدمات کا تذکرہ شعر العجم کے حوالہ سے کیا ہے۔ انجمن ترقی اردو کے ذریعہ علامہ شبلی نے اردو کی جو خدمت کی اس کی تفصیل پیش کر کے ان کاموں کی اہمیت واضح کی ہے۔ یہ مقالہ خاصا اہم ہے۔ یہاں اس کے اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں:

۱۔ ''شبلی کا زیادہ سرمایہ نظم ونثر اردو میں ہے تاہم انہیں فارسی پر غیر معمولی قدرت تھی۔ انہوں نے بے شمار قصائد اور نظمیں برجستہ اور قلم

برداشتہ کئی مواقع اور تقاریب وحوادث پر لکھیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ شخص جو ہندوستان کے ایک دور افتادہ اگرچہ مردم خیز اور علم پرور خطہ سے اٹھا اس نے فارسی پر اہل زبان کا سا عبور کیوں کر حاصل کرلیا۔ یہ کہنا بھی شاید غلط نہ ہوگا کہ فارسی زبان، روز مرہ اور محاورہ پر انہیں اپنے نوخیز معاصر لیکن بہ مراتب بڑے شاعر اقبال سے زیادہ قدرت حاصل تھی۔''

(ہماری زبان دہلی، شبلی نمبر ص۲)

۲۔ ''ان کے حسن انتخاب کی داد دینا ہو تو شعر العجم کے اوراق پلٹ کر دیکھئے۔ فارسی شاعری کی نشو ونما اور اس کے نشیب وفراز، اس کے لطائف ونکات، اس کے مزاج کے عناصر ترکیبی، اس کا پھیلاؤ اور اس کی سمائی، ان سب کی رونمائی کے علاوہ شبلی نے چمن پارس کا عطر کھینچ دیا ہے۔ ان کی نگاہ بے اختیار ان اشعار پر ٹھہرتی ہے جو دل ودماغ کو منور کر جاتے ہیں۔ اور ذوق جمال جن پر وجد کرنے لگتا ہے۔ خانہ برانداز چمن نے گل اس طرح پھینکے ہیں کہ جو چمن کے پہلو سے گذر رہا ہو اس کا دامن بھی پھولوں سے بھر جاتا ہے۔'' (ہماری زبان دہلی، شبلی نمبر ص۲)

۳۔ ''یہ اعتراف کیا کم ہے کہ اہل ایران جو اہل زبان ہونے کے سارے تیور، عصبیت کو شامل کرتے ہوئے رکھتے ہیں، اور جنہوں نے شبلی کے فارسی کلام کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا شعر العجم کے قدرداں اور ثناخواں ہیں۔ کلاسیکل فارسی شاعری پر شعر العجم ابھی تک حرف آخر ہے۔

شبلی نعمانی نے نہ صرف ایک ایسے دور میں جب فارسی کا چلن دن بہ دن کم ہوتا جارہا تھا اردو والوں کو فارسی سے بہرہ ور کیا۔ بلکہ ان میں شعر فارسی کا ذوق پیدا کردیا۔ فارسی اساتذہ کے جو اشعار گذشتہ ۸۰/۷۰ سال سے ہمارے یہاں زبان زد خاص وعام رہے ہیں وہ شبلی کے حسن انتخاب اور

شعرالعجم کی دین ہیں۔'' (ہماری زبان دہلی، شبلی نمبر ص ۳)

دوسرا مقالہ ''علامہ شبلی نعمانی اوران کی فکر'' نظام الدین ایس گوریکر نے لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے شبلی کے بعض افکار کا جائزہ لیا ہے۔ صابوں صدیق پالی ٹکنک ممبئی کے سابق پرنسپل جناب سید شہاب الدین دسنوی [۱۹۱۳-۱۹۹۸ء] کے مقالے کا عنوان ''عطیہ، اقبال اور شبلی'' ہے۔ اس میں انہوں نے ان تینوں کے روابط کا تجزیہ اوراس سلسلہ میں بابائے اردو مولوی عبدالحق وغیرہ کے خیالات کی تردید کی ہے۔ یہ مقالہ اصلاً ان کی کتاب ''شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں'' کا ایک باب ہے۔ جسے انجمن ترقی اردو ہی نے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا تھا۔

ہماری زبان کے ''شبلی نمبر'' کا آخری مضمون ایک شبلی شناس ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے قلم سے ہے۔ انہوں نے علامہ شبلی کے مختصر حالات زندگی لکھے ہیں۔ اس طرح اس مختصر نمبر میں شبلی کے حالات زندگی بعض افکار وخیالات اوران کے علمی وادبی کارناموں کا ایک اجمالی مرقع آگیا ہے۔ آخری صفحہ پر انجمن کے شبلی سمینار کا پروگرام شائع ہوا ہے۔ فاضل مرتب ڈاکٹر خلیق انجم نے اِسے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

شبلی نمبر کے بعد ہماری زبان دہلی کے ۸ رمئی ۱۹۹۵ء کے شمارے میں انجمن کے سہ روزہ سمینار کی مفصل روداد، مقالات کی تلخیص اور سمینار کے کی چند تصاویر شائع کی ہیں۔ گویا یہ دوسرا شمارہ بھی ذکرِ شبلی ہی پر مشتمل ہے۔

---

(۹)

اردو ادب، دہلی

[شبلی نمبر]

[مدیر: ڈاکٹر خلیق انجم، ۱۹۹۶ء، انجمن ترقی اردو ہند دہلی]

اردو ادب انجمن ترقی اردو ہند دہلی کا سہ ماہی رسالہ ہے۔ انجمن ترقی اردو نے ۱۴-۱۶/اپریل ۱۹۹۵ء کو علامہ شبلی کے فکروفن پر دہلی میں جو سہ روزہ سمینار منعقد کیا تھا اور جس میں ۴۵/مندوبین نے شرکت کی تھی، اردو ادب کا یہ شبلی نمبر اسی سمینار میں پیش کئے گئے منتخب مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس میں مختلف موضوعات پر ۲۵/مقالات شامل ہیں۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ [۱۹۱۸-۲۰۰۹ء] صدر انجمن ترقی اردو ہند کے قلم سے ہے۔ اس میں انہوں نے ہندوستان کی علمی ادبی، معاشرتی اور پولیٹکل کروٹ کا ذکر کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

> ''شبلی سیاسی، سماجی اور تعلیمی ہر میدان میں تنگ نظری کے خلاف ہیں۔ موجود سے ناآسودہ ہیں اور ممکن الحصول کے لئے جہد حیات کے علم بردار ہیں۔ وہ نشاۃ ثانیہ میں اپنے ہم عصروں سے آگے ہیں۔ اور ان کی کوتاہیوں کو دور کر کے آگے کی طرف بڑھتے ہیں۔ یہی نشاۃ ثانیہ شبلی کی دین ہے۔'' (اردو ادب، دہلی، شبلی نمبر ص ۲۱)

علامہ شبلی سرسید کے ساتھ ۱۶/سال رہے۔ اس صحبت نے ان کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کیا، جس کا خود انہوں نے اعتراف کیا ہے۔ اردو ادب کے اس نمبر میں اس موضوع پر تین اہل قلم ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، پروفیسر صغرا مہدی اور ڈاکٹر خلیق انجم کے

مقالات شامل ہیں۔ پروفیسر صغرا مہدی نے بڑے پتے کی بات لکھی ہے کہ

''ہم لوگوں کی یہ پرانی عادت ہے کہ ہم دو ہم قامت ہم عصر شخصیتوں کو ایک دوسرے کا حریف بنا کر موازنہ کرتے ہیں۔'' (ایضاً ص ۴۸)

یہی غلطی کمال احمد صدیقی نے بھی کی ہے اور سرسید و شبلی کا مد مقابل کی حیثیت سے موازنہ کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ صحیح نتیجہ اخذ نہیں کر سکے ہیں۔ وہ سرسید و شبلی کے نظریات اوران کے احوال سے بھی بخوبی واقف نہیں۔ نظریاتی مباحث کے ذکر میں ارتقائی مراحل کا بھی انہوں نے خیال نہیں رکھا ہے۔ یعنی جو خیال عہد اول میں تھا اسے عہد آخر اور عہد آخر کے خیالات کو عہد اول میں لکھ کر معاملہ کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ لاطائل اور دور از کار مباحث بلا وجہ مقالے میں شامل کئے گئے ہیں۔ ان کی بہ نسبت پروفیسر صغرا مہدی نے اصولی بحثیں کی ہیں، صحیح نتائج اخذ کئے ہیں اور موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ لیکن اس موضوع پر سب سے عمدہ تجزیہ و تحقیق ڈاکٹر خلیق انجم کے قلم سے ہے۔

پروفیسر کمال احمد صدیقی کے مقالے کا آغاز ہی شبلی کی غلط تاریخ پیدائش کے اندراج سے ہوا ہے۔ انہوں نے شبلی کی تاریخ پیدائش ۸ رمئی ۱۸۵۷ء لکھی ہے۔ یہ تاریخ پیدائش انہوں نے کس بنیاد پر طے کی ہے، اس کی انہوں نے کوئی وضاحت بھی نہیں کی ہے۔ حیات شبلی میں شبلی کی تاریخ پیدائش مئی ۱۸۵۷ء درج ہے۔ بعد میں شبلی کالج کے ایک استاذ ڈاکٹر محمد طاہر مرحوم نے اس کی تحقیق کی اور ماہنامہ نیا دور لکھنو میں ایک مقالہ لکھ کر ثابت کیا کہ صحیح تاریخ پیدائش ۳ رجون ۱۸۵۷ء ہے۔ یہی تاریخ پیدائش علی العموم اہل علم درج کرتے رہے ہیں۔ یہی تاریخ ان کے مزار پر بھی کندہ ہے۔ کاظم علی خاں [۱۹۳۸ - ۲۰۱۱ء] نے شبلی کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں بڑی عمدہ بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ

''مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ بیان کہ شبلی ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے اپنے دامن میں کئی ایسی باتیں رکھتا ہے جو ہمارے نزدیک حقیقت سے دور ثابت ہوتی ہے۔ اگر ہم سید سلیمان ندوی کے اس

بیان پر اعتماد کرلیں کہ شبلی ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ میں پیدا ہوئے تو تقویم میں ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ / مئی ۱۸۵۷ء کے بجائے جون جولائی ۱۸۵۸ء کے مطابق نکلتا ہے۔ (تقویم یک صد و دو سالہ، مطبع نول کشور ۱۸۶۵ء) جسے ہم تو کیا شاید قدر شناسان شبلی بھی قبول نہ فرمائیں گے۔ سلیمان ندوی نے عیسوی تقویم کی رو سے ولادت شبلی کو مئی ۱۸۵۷ء کا واقعہ قرار دیتے ہوئے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ شبلی عین اس دن پیدا ہوئے جس روز ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے دوران باغی ڈسٹرکٹ جیل اعظم گڑھ کا پھاٹک توڑ کر بہت سے قیدیوں کو نکال لے گئے تھے۔ سریندر ناتھ سین کی تحقیق ہے کہ اعظم گڑھ میں بغاوت کی خبر سرکاری حلقوں تک ۴/ جون ۱۸۵۷ء کو پہنچ چکی تھی اور مولف ''خدنگ غدر''، معین الدین حسن خاں نے اعظم گڑھ میں بغاوت کی تاریخ ۲/ جون ۱۸۵۷ متعین کی ہے۔ (ایٹین ففٹی سیون ص ۱۵۳، پبلی کیشن ڈیویزن، نئی دہلی ۱۹۷۷ء) ڈسٹرکٹ گزیٹیر اعظم گڑھ سے انکشاف ہوتا ہے کہ باغیوں نے ۳/ جون ۱۸۵۷ء کی شب میں جیل کا پھاٹک توڑ کر قیدیوں کو آزاد کرایا تھا۔ (ڈسٹرکٹ گزیٹیر اعظم گڑھ ص ۳۵) ان شواہد کی بنیاد پر ہم شبلی کی تاریخ ولادت ۳/ جون ۱۸۵۷ء متعین کرتے ہیں۔ ان حالات میں سلیمان ندوی کا درج کردہ مولانا شبلی کا عیسوی ماہ ولادت مئی بھی درست نہیں ثابت ہوتا۔ ہماری تحقیق کی روشنی میں شبلی دراصل دوشنبہ ۳/ جون ۱۸۵۷ء مطابق ۹/ شوال ۱۲۷۳ھ کو پیدا ہوئے تھے۔ اور سید سلیمان ندوی کا یہ ارشاد بے بنیاد ثابت ہوتا ہے کہ ''مولانا شبلی مرحوم کی ولادت ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق مئی ۱۸۵۷ء میں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے کسی حوالے کے بغیر شبلی کی تاریخ ولادت یکم جون ۱۸۵۷ء درج فرمائی ہے۔ (شبلی ص ۹، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی ۱۹۸۸ء) ظاہر ہے کہ

یہ بے حوالہ اندراج بھی نظر ثانی کا محتاج ہے۔''

(اردو ادب دہلی، شبلی نمبر ص ۷۲-۷۳)

حال ہی میں دارالمصنفین کے ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی (سابق پروفیسر شعبہ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) کی یہ تحقیق سامنے آئی ہے کہ چونکہ اعظم گڑھ جیل کا پھاٹک توڑنے کا واقعہ ۳/جون دیر رات گئے پیش آیا تھا اور یقینی طور پر اس کا شہرہ ۴/جون کو ہوا ہوگا، اس لئے صحیح تاریخ پیدائش ۴/جون ۱۸۵۷ء ہے۔ (معارف اعظم گڑھ، شذرات، جون ۲۰۱۰ء) یہ تحقیق زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ سریندر ناتھ کا بیان اوپر آچکا ہے کہ جیل کا پھاٹک توڑنے کی اطلاع سرکاری حلقوں میں ۴/جون کو پہنچی تھی، ظاہر ہے جب سرکاری حلقے میں یہ خبر ۴/جون کو پہنچی ہوگی تو عوامی حلقے میں اس کی شہرت اس کے بعد ہی پہنچی ہوگی۔

پروفیسر کمال احمد صدیقی کا خیال ہے کہ شبلی اگر سرسید کے سائے سے محروم رہتے تو مسجد کے امام یا مدرس ہوتے۔ (ص ۲۵) یہ ان کا کوئی نیا خیال نہیں ہے، ان سے پہلے بھی بعض اہل قلم اس طرح کے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ جن کو انہوں نے دہرایا ہے۔ بلاشبہ سرسید کے زیر اثر شبلی علامہ شبلی بنے۔ مسجد کی امامت اور مدرسے کی مدرسی حقارت کی چیزیں نہیں۔ تاہم مذکورہ خیال یکسر صحیح نہیں ہے۔ شبلی کے گھر کا جو ماحول تھا اس سے بھی مذکورہ خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ علامہ شبلی نے ایک زمیندار گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے دادا حسن علی [م: ۲۷-۲۸/مئی ۱۸۹۰ء] کچہری سے وابستہ اور والد شیخ حبیب اللہ [م: ۱۹۰۰ء] اعظم گڑھ کے نامور وکیل تھے۔ تعلیم اور حج سے فراغت کے بعد شبلی کے حصہ میں امینی اور وکالت آئی اور اس وقت کے اعظم گڑھ کا جو تہذیبی منظر نامہ تھا، اس میں شبلی کی ایک علاحدہ شناخت قائم ہو چکی تھی۔ وہ ترکوں کی اعانت میں ایک خطیر رقم جمع کر کے قسطنطنیہ بھیج چکے تھے۔ سید محمود [۱۸۵۰-۱۹۰۳ء] کے الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہونے پر اعظم گڑھ میں جو جلسہ ہوا اس میں وہ بھی شریک تھے۔ اس میں انہوں نے جو تقریر کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس وقت کے ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل سے بخوبی واقف تھے۔ علی گڑھ پہنچنے سے چار سال قبل

خطبات احمدیہ کے لئے سرسیدؔ سے خط و کتابت کر چکے تھے۔ گویا وہ اپنے عہد کے ہندوستان سے اور مسلمانوں کے مسائل سے واقف ہو چکے تھے۔ اس لئے یہ کہنا اور خیال کرنا کہ وہ محض مسجد میں امام یا مدرس ہوتے صحیح خیال نہیں معلوم ہوتا، لیکن جب خود شبلی نے سرسید کی عظمت اور ان کے احسانات کا برملا اظہار کیا ہے تو دوسروں کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اس سے انکار کریں۔ کمال احمد صدیقی صاحب سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ سرسید کے ساتھ صرف شبلی ہی نہیں اور بھی لوگ تھے، ان کو سرسید کے سائے نے شبلی کیوں نہیں بنایا؟۔ پروفیسر صغرا مہدی کا خیال ہے کہ شبلی و سرسید کے اختلافات کو غیر ضروری طور پر ہوا دی گئی۔ وہ لکھتی ہیں:

''ان دونوں کے اختلافات کو غیر ضروری ہوا دی گئی۔ شبلی کے شاگرد رشید حضرت سید سلیمان ندوی نے شبلی کی مذہبیت اور علمیت پر حد سے سوا زور دیا۔ ان کو سرسید کے ہم پلہ بلکہ ان سے برتر قرار دیا۔ ان پر علی گڑھ اور سرسید کے اثر سے انکار کیا تو دوسری طرف محمد اکرام، مولوی عبدالحق اور وحید قریشی نے شبلی کی دوہری شخصیت، ان کی حسن پرستی اور قیادت کی ہوس پر گل افشانیاں کیں۔ شبلی سرسید کے حریف ٹھہرے، مخالف تنقیدیں اور اس کے جواب میں تنقیدیں لکھی جانے لگیں۔'' (اردو ادب شبلی نمبر ص ۴۸)

بعد ازاں صغرا مہدی نے دونوں کے ہم نواؤں کی بے اعتدالیوں کا ذکر کیا ہے۔ اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ

''سرسید اور شبلی اپنے وقت کی قد آور شخصیتیں ہیں۔ مسلمانوں کی تہذیبی، تعلیمی اور سیاسی زندگی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کو فرشتوں کی صف میں جگہ دلانے کی کوشش کیوں کی جائے۔ یہ اپنی اپنی ترجیحات ہیں کہ کس کو شبلی کی شخصیت زیادہ متاثر کرتی ہے، کس کو سرسید کی۔ ان کے بت بنا کر آپس میں ٹکرانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے سے ہم لوگوں کی ذہنی کجروی کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان دونوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم

ہے۔" (اردو ادب شبلی نمبر ص ۱۵)

یہ اگرچہ صحیح ہے کہ سرسید و شبلی کے فکری اختلاف کو سید صاحب نے حیات شبلی میں تفصیل سے لکھا ہے لیکن اس کا آغاز ان سے بہت پہلے مولوی عبدالحلیم شرر نے کیا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا بھی یہی خیال ہے مگر اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ مولوی عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ

"سید صاحب کی صحبت، علی گڑھ کالج کی مرجعیت اور ان کی ذاتی قابلیت نے انہیں ابتداءً اس حیثیت سے پبلک میں انٹروڈیوس کرایا کہ سید صاحب کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں۔ خصوصاً جب وہ سید صاحب کے ہم رکاب حیدرآباد گئے تو مسلمانوں میں اس خیال کو اور پختگی ہوگئی، مگر خود مولانا شبلی کی خودداری اس حیثیت کو اپنی شان سے بہت کم بلکہ اپنی ذلت اور سبکی تصور کرتی تھی۔ اپنی ان تصنیفوں اور نظموں کو تو وہ مٹا نہیں سکتے تھے جن میں خود ہی اپنی اس حیثیت کو آشکارا کر چکے تھے، لیکن اب اس بات کو ناقابل برداشت دیکھ کے علی گڑھ کالج سے علاحدگی اختیار کر کے ندوۃ العلما میں شرکت کی اور سمجھے کہ اس ذریعہ سے میں علماء کا سرتاج اور شیخ الکل بن کے اس درجے پہنچ جاؤں گا جو سید صاحب کے درجے سے بھی مافوق ہے۔ میں نے ان کو بارہا اس خیال سے روکا اور اسی زمانہ میں کہہ دیا تھا کہ علماء بس میں آنے والے نہیں ہیں .... ان کے بہت سے دوستوں نے بھی روکا اور کہا کہ آپ کی ترقی کا میدان علی گڑھ کالج ہی ہے، مگر انہوں نے نہ مانا اور نتیجہ ہوا کہ گو انہوں نے ندوہ کو بے حد فائدہ پہنچایا اور ندوہ کو ندوہ بنا دیا مگر آخر میں ندوہ والے مرحومین امت ہی کے ہاتھ مار کھا گئے، جس کا ان کے دوستوں کو بے حد ملال ہوا اور وہ خود بھی

اپنی اس محنت کے اکارت جانے پر کف افسوس ملتے ہوئے مرے۔''

(مجموعہ نظم شبلی ص ٦٦-٦٧ بحوالہ اردو ادب شبلی نمبر ص ۳۱۵)

مولوی عبدالحلیم شرر بنیادی طور پر ایک ناول نگار تھے۔ جس میں ذرا سی بات کو افسانہ کرنا ''حسن'' خیال کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی انہوں نے وہ حسن برقرار رکھا ہے۔ اسی طرح کمال صدیقی نے بھی شبلی کو سرسید کا حریف قرار دیا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سرسید ندوہ کے خلاف نہ تھے۔ بلکہ اس کے ابتدائی موئیدین میں تھے۔ علامہ شبلی اپنے نظریے کی ہم آہنگی کی بنیاد پر ندوہ تحریک سے وابستہ ہوئے تھے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ سرسید اپنے عہد کے حالات اور اس کے تقاضوں سے ایک خاص نظریہ حیات پر پہنچے تھے۔ بالکل اسی طرح شبلی بھی اپنے عہد کے تغیرات کی بنا پر مسلمانوں کی ترقی کے اس خیال پر پہنچے تھے کہ قدیم و جدید تعلیم اور ان دونوں طبقوں کا اتحاد ہی مسلمانوں کو زوال سے بچا کر ترقی کی راہ پر لا کھڑا کر سکتا ہے۔ ان دردمندانہ جذبات اور ملی خیر خواہی کو سرتاج بننے اور شیخ الکل ہونے کی تمنا سے تعبیر کرنا کس قدر خلاف حقیقت ہے۔ سب جانتے ہیں اور علامہ شبلی نے بھی لکھا ہے کہ اس زمانہ میں ذاتی ترقی کے لئے علی گڑھ سے بہتر شبلی کے لئے اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ کمال احمد صدیقی اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ البتہ ڈاکٹر خلیق انجم نے گہرائی سے مطالعہ و تجزیہ کر کے صحیح صورت حال بیان کی ہے۔

سرسید اور شبلی کے سیاسی نقطہ نظر میں قدرے اختلاف تھا۔ سرسید کو کانگریس پسند نہ تھی اور شبلی اس کے حامی تھے۔ یہ نظریاتی اختلاف تھا، مگر یہ صرف اختلاف تھا مخالفت کبھی نہیں بنا اور اگر یہ نظریاتی اختلاف شبلی کا گناہ تھا تو اس کے مرتکب مولانا حالی بھی تھے اور مولوی سمیع اللہ بھی۔ اور دیگر کئی اور بھی جو علی گڑھ تحریک کے ستون خیال کئے جاتے ہیں۔ اس بات کا ذکر پروفیسر صغرا مہدی نے بھی کیا ہے اور ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی۔ دراصل سرسید و شبلی کے درمیان مسلمانوں کی ترقی اور خوش حالی کے جو منصوبے تھے، اس کے طریقہ کار میں فرق تھا، اس فرق کو پہلے اختلاف اور پھر مخالفت کا نام دیدیا گیا۔ اور غلط فہمیوں پر غلط فہمیوں کی عمارتیں تعمیر کی گئیں اور دونوں کے درمیان ایک بڑی دیوار حائل کر دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ شبلی نے جس طرح

سرسید کی عظمت اور علی گڑھ کالج کے احسانات کا ذکر کیا ہے سرسید کے غالی سے غالی ہم نوا نے بھی نہیں کیا ہوگا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

''حضرات!

یہ سچ ہے کہ اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی زندگی قرار دیا جاسکتا ہے تو اس کا آغاز، اس کی نشونما، اس کی ترقی، اس کی نمود، اس کا امتیاز جو کچھ ہوا ہے اس کالج [علی گڑھ] سے ہوا ہے۔

میں نہیں کہتا کہ یہاں آنے سے پہلے میں نے تصنیف کے دائرہ میں قدم نہیں رکھا تھا۔ یہ سچ ہے کہ آج سے بہت پہلے میری دو تین کتابیں چھپ چکی تھیں اور شائع ہو چکی تھیں، لیکن ان کا کیا مقصد تھا؟ آپ کے مذہبی جھگڑے، مسلمانوں کی جماعت کو منتشر کرنا اور جو انتشار پہلے سے موجود تھا اس کو قوت اور استحکام دینا۔

میں آج سے بہت پہلے فارسی شعر بھی کہتا تھا لیکن وہ کس قسم اور کس درجہ کے تھے؟ یہ نہ خیال فرمائیں کہ میں اپنی موجودہ شاعری کو اعلیٰ رتبہ کی خیال کرتا ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آج کی میری شاعری اگر پست ہے تو اس وقت پست تر تھی۔ غرض یہ میں نے جو کچھ سیکھا ہے اور جو کچھ ترقی کی ہے وہ اسی کالج کی بدولت ہے۔ اس لحاظ سے میں جس طرح کالج کا پروفیسر ہوں اسی طرح اس کا ایک تربیت یافتہ شاگرد بھی ہوں۔

آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ یہ کالج صرف طالب علموں اور اسٹوڈنٹس کو علمی ترقی دلاتا ہے بلکہ وہ پروفیسروں اور ماسٹروں کو علمی اور روحانی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اگر وہ طالب علموں کو بی اے، ایم اے کی ڈگریاں دیتا ہے تو پروفیسروں اور ماسٹروں کو شمس العلماء کرسکتا ہے۔''

اسی خطبہ میں آخر میں ہے کہ

''حضرات!

میں نے بزرگوں کی جو فہرست پیش کی ہے اس میں ایک نام اور سب سے بڑا نام دانستہ بھولا ہوں، کیونکہ میرے نزدیک جب اس کالج کا یا کالج کے متعلق جس چیز یا جس شخص کا نام لیا جائے اس میں اسی بڑے شخص [سرسید] کا جلوہ ہے۔

جدھر دیکھتا ہوا ادھر تو ہی تو ہے

سرسید کی وفات پر لکھا کہ

''قومی عمارت کے ستون ہل گئے، یعنی سید احمد خان بہادر اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں چلے گئے۔ یہ سانحہ یکشنبہ ۲۷؍مارچ کو پیش آیا اور ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا۔ میں کچھ دنوں تک کوئی کام نہیں کرسکتا۔''

(مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۲۲۷)

علامہ شبلی نے سرسید احمد خاں کی وفات کے بعد ''سرسید اور اردو لٹریچر'' کے عنوان سے مضمون لکھا تو یہ بھی لکھا کہ

''ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں، بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے، بعض نے مدعیانہ اپنا الگ راستہ نکالا تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے ہیں۔'' (مقالات شبلی ج ۲ ص ۵۷)

اسی طرح سرسید احمد خاں نے بھی اپنی وفات تک ہر موقع پر شبلی کے علم وفضل، تصنیف وتالیف، کالج سے متعلق ان کی خدمات وغیرہ کی تعریف وتحسین میں کبھی کمی نہیں کی۔ پروفیسر کمال احمد صدیقی نے ان تمام امور کو نظر انداز کردیا ہے۔ اور ضمناً مولانا ابوالکلام وسرسید کے نظریاتی اتحاد واختلاف پر بحث کرڈالی ہے۔ چونکہ یہ غیر ضروری بحث ہے اور سب جانتے ہیں کہ ابوالکلام آزاد کو نہ صرف شخصی بلکہ علمی وفکری ہر لحاظ سے شبلی سے عقیدت تھی۔ اس لئے

اس غیر ضروری بحث کو نظر انداز کرنا ہی زیادہ بہتر ہے۔

اس بحث کے بعد اردو ادب کے مدیر ڈاکٹر خلیق انجم نے ڈاکٹر عبداللطیف اعظمی کی ایک تحریر ''شبلی اور ابوالکلام'' شائع کی ہے۔ جس سے دونوں کے تعلقات اور نظریاتی ہم آہنگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ (اردو ادب شبلی نمبر ص ۵۷)

علامہ شبلی کی علی گڑھ کی ۱۶ر سالہ زندگی کی روداد ایک اور مقالہ میں کاظم علی خاں نے بھی لکھی ہے۔ یہ اپنے موضوع پر ایک اچھا تجزیہ ہے۔ انہوں نے تمام تفصیلات پیش کر کے ایک اور پہلو تلاش کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ

> ''شبلی کی علی گڑھ کالج کی ملازمت کا ۱۶ر سالہ سلسلہ جب اواخر ۱۸۹۸ء میں ختم ہوا تو اس کے بعد ۱۸۹۹ء سے ۱۹۱۴ء تک وہ صرف ۱۶ر سال ہی بہ قید حیات رہے لیکن اپنی زندگی کے ان آخری ۱۶ر برسوں میں بھی انہوں نے علی گڑھ کالج کے ارباب حل وعقد سے مشورے اور مدد لینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ شبلی نے علی گڑھ کالج میں متعدد موقعوں پر سرسید سے اختلاف کرنے کے باوجود کالج سے اپنا تعلق وفات سرسید تک منقطع نہ کیا۔ کیونکہ سرسید نے شبلی کو اختلاف رائے کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ شبلی نے علی گڑھ تحریک کو اپنی تحریروں اور تقریروں سے جو زبردست تقویت دی، اس کا اعتراف ارباب علی گڑھ بھی کرتے رہے ہیں۔ شبلی نے علی گڑھ تحریک کی کمزوریوں کو بھی دور کرنے کی سعی کی تھی۔ علی گڑھ تحریک کے لئے سیاست ایک ممنوع میدان تھا مگر شبلی نے اس میدان میں بھی ملت کی رہنمائی کر کے علی گڑھ تحریک کو نئے ابعاد وامکانات سے روشناس کرانے کا تاریخی کارنامہ انجام دیا۔'' (اردو ادب شبلی نمبر ص ۸۱)

سرسید اور ابوالکلام آزاد کے علاوہ اردو ادب کے اس شبلی نمبر میں شبلی اور مہدی افادی کے تعلقات، اعترافات، ایک دوسرے کے تئیں محبت آمیز جذبات کا ذکر پروفیسر آفاق احمد

نے اپنے مقالہ میں کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ

''مہدی افادی کو''خوش اوصاف شبلی'' سے بے پناہ عقیدت اور دلی لگاؤ تھا وہ ہر ایک کی اہمیت وعظمت کو تسلیم کرتے تھے۔جس میں جو خوبی تھی اس کی برملا ستائش کرتے تھے۔لٹریچر کی کسی طرح بھی حق تلفی ہو یہ انہیں گوارہ نہیں تھا لیکن شبلی کے دل ودماغ کے نتائج سے انہیں جو لگاؤ تھا وہ کسی دوسرے مصنف سے اس حد تک نہ ہوسکا۔اگر شبلی کو مہدی افادی کا ادبی محبوب کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔شبلی کی تحریر کی ہر ادا،شبلی کے اسلوب کا اچھوتا پن،موضوع سے خلوص،سب ہی انہیں بڑے بھائے تھے۔مہدی نے شبلی کی ادبی فتوحات کے بارے میں جتنا لکھا کسی اور نے اتنا نہیں لکھا ہے۔شبلی کا ذکر مہدی کی کمزوری بن گیا تھا۔مختلف دوستوں کو خط لکھتے تو کہیں نہ کہیں سے شبلی کا ذکر ضرور چھیڑ دیتے ہیں۔'' (ایضاً ص ۵۹)

پروفیسر آفاق احمد نے اپنے مذکورہ بالا خیالات کی تائید میں مہدی افادی کی مندرجہ ذیل تحریروں سے استدلال کیا ہے:

ا۔''شبلی ملک میں پہلے شخص ہیں جن کو تاریخ وفلسفہ میں ربط باہمی کا خیال پیدا ہوا اور وہ ان جواہرات عقلی کی تحلیل وترکیب کیمیائی اس طرح کر سکے جس سے لٹریچر میں ایک خاص امتزاج پیدا ہو گیا ہے۔انہوں نے اپنی متعدد قیمتی تصنیفات میں ہمیشہ اپنا درجہ قائم رکھا ہے۔وہ جانتے ہیں کہ آج کل کے ترقی یافتہ مذاق ادبی کے مطابق وسیع سلسلہ تحقیقات اور زبردست قوت استقرائی سے اسباب ونتائج تصرفات فلسفیانہ میں کس طرح کام لیا جاسکتا ہے۔مجھ کو اصرار ہے کہ شبلی کی تحقیقات سے جو ان کی اولیات میں داخل ہونے کے لائق ہے،ہندوستان کی علمی قلم رو میں ایک نیا تاریخی دور شروع ہوگا۔'' (افادات مہدی ص ۱۵۷-۱۵۸)

۲۔ ''شبلی بلحاظ فن میرا خیال ہے صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام اسلامی دنیا میں کسی سے دوسرے درجہ پر نہیں ہیں۔ اس کو میری قاصر النظری پر نہ محمول کیجئے، فلسفہ تاریخ جو آج کل تمام علوم میں سرفہرست ہے، ایک مستقل فن ہو گیا ہے۔ اور اس قدر اہم ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فاضل مورخانہ موشگافیوں کو بہترین مشغلہ ہستی سمجھتے ہیں۔ مصری اور ترکی لٹریچر میں تاریخی مذاق جس قدر موجود ہے ہم اس سے ناواقف نہیں ہیں، لیکن جن مضامین پر وہاں سرگرمی سے طبع آزمائیاں ہو رہی ہیں وہ شبلی کے یہاں دست فرسودہ اور مسائل ابتدائی ہیں، جن کو فاضل مورخ کی سرسری جنبش قلم مدت ہوئی ایک سے زیادہ موقع پر طے کر چکی ہے۔ سچ یہ ہے کہ شبلی جامعیت اور وسیع النظری نیز مورخانہ تدقیق اور کمال فن کی حیثیت سے آج یورپ کے بڑے سے بڑے مورخ سے پہلو بہ پہلو ہو سکتے ہیں۔''

(افادات مہدی ص ۱۸۶)

۳۔ الکلام

''فاضل شبلی نے ایک طرف تو بڑے میاں یعنی مذہب کی پگڑی نہیں اتاری اور ساتھ ہی یورپ کے نوخیز چلتے پرزوں یعنی فلسفہ و سائنس کے سامنے تیرہ سو برس کے بوڑھے سے ہاتھ نہیں جڑوائے بلکہ دونوں میں مصافحہ کرا دیا۔ یہ معتدل روش جو اس ادبی نزاع میں اختیار کی گئی ہے لائق رشک شبلی ہی کا حصہ ہے۔'' (افادات مہدی ص ۱۱۹)

۴۔ شعرالعجم

''تنقید عالیہ [ہائی کریٹی سزم] کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے۔ جس پر دنیا کی کوئی بھی زبان ناز کر سکتی ہے۔ .... شعرالعجم میں بھی بالخاصہ یہ کہربائیت موجود ہے کہ وہ کم سے کم تعلیم یافتہ طبقہ کے منتخب افراد

کو کسی ایک مرکز پر لا سکتی ہے۔" (افادات مہدی ص ۲۷۵-۲۷۶)

۵۔ موازنہ انیس و دبیر

"مولف کے کمالات میں اختراع فائقہ (یعنی ماسٹر پیس) نہ سہی تاہم اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اردو ادب میں وہ اسے ایک قیمتی اضافہ سمجھتا ہے۔"

(افادات مہدی ص ۱۶۱)

۶۔ مکاتیب شبلی

"مکاتیب شبلی دراصل دیکھنے کی چیز ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس علم کے پتلے کا کوئی رونگٹا بے کار نہیں۔"

"باتوں باتوں میں سب کچھ یوں کہہ جاتے تھے گویا واقعات سنے سنائے نہیں آنکھوں دیکھے ہیں۔ یہ مادہ اجتہادی (اوریجنلٹی) جسے جان ادب کہیے، ان کی وسیع معلومات کے ساتھ ان کی تقریر کا خاصہ امتیازی تھا۔ ان کی شستہ اور نہایت پاکیزہ تحریروں میں یہ رنگ اور نکھر جاتا تھا۔ شراب محبت تھی جو کھنچ کھنچا کر دو آتشہ ہو جاتی تھی۔"

۷۔ اسلوب

"جن صاحبوں کو میری طرح شبلی کے دل و دماغ کے نتائج سے تعلق رہا ہے، وہ ان مضامین میں ایک خاص بات دیکھیں گے یعنی طرز ادا [اسٹائل) اس قدر اچھوتا اور صاف ہے کہ بڑے سے بڑا فصیح البیان بھی اس قسم کے دقیق مسائل کو ایسی برجستگی اور لطافت کے ساتھ ادا نہیں کر سکتا، .... غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی اردوئے خاصہ کی داد ملتی / جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔" (افادات مہدی ص ۷۶)

پروفیسر آفاق احمد نے مہدی افادی کی تحریروں کا باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مہدی شبلی کی محبت میں دوسرے مصنفین کی حق تلفی نہیں کرتے۔ اور یہ بھی کہ وہ شبلی کے کمزور پہلوؤں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس خیال کی تائید میں انہوں نے مہدی افادی کے درج ذیل اقتباسات پیش کیے ہیں:

۱۔ الکلام

''الکلام میں شبلی نے فلسفہ پر جو کچھ لکھا آشنائے فن ہو کر نہیں لکھا۔ جدت و اجتہاد نے رومانیت کو اس قدر پھیلا دیا کہ نفسیت میں غائب ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب پایہ سے گر گئی۔'' (مکاتیب مہدی ص ۱۰۱)

۲۔ حیات جاوید

''بلحاظ فن حالی کے جس اختصار کی طرف نیک نیتی سے شبلی کا ذہن منتقل ہوا ہے خود ان کی تصنیفات میں یہ رعایت کہاں تک ملحوظ رکھی گئی ہے، یعنی المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق اور الغزالی میں انسانی کمزوریاں کس حد تک ابھار کر دکھائی گئی ہیں؟ اس کا جواب مجھے خوف ہے کہ غیر امید افزا ہوگا۔ کیا یہ علم النفس کی حق تلفی نہیں ہے جو ایک نکتہ سنج مورخ کے قلم سے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ عظمت خود ملک کے سب سے بڑے مورخ کے خیال کے مطابق واقعات کو بدل نہیں سکتی۔'' (افادات مہدی ص ۳۱۶)

علامہ شبلی کی سیاسی بصیرت پر نسبتاً کم لکھا گیا ہے۔ اردو ادب کے اس نمبر میں اس موضوع پر دو مقالے شامل ہیں۔ پہلا مقالہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری کے قلم سے ہے۔ اور دوسرا مقالہ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے ڈائرکٹر جناب شاہد ماہلی نے لکھا ہے۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری نے پہلے علامہ شبلی کے سیاسی نظریات کی توضیح ان کی تحریروں کی روشنی میں کی ہے۔ پھر ان کی آزادی رائے کا ذکر کیا ہے۔ ملکی اور عالمی سیاسیات

سے متعلق انہوں نے جو مضامین و مقالات لکھے ہیں اور نظمیں کہی ہیں، ان کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔

علامہ شبلی کانگریس کے حامی تھے۔ مسلم لیگ کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ جمہوریت نواز تھے۔ انگریزوں کی سامراجی پالیسیوں کے مخالف تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار تھے۔ گوکھلے کو پسند کرتے تھے۔ سیاسی معاملات میں سرسید ان کی ناپسندیدہ شخصیت تھے۔ یہ اور اس طرح کے کئی خیالات کا اظہار ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری کے مقالہ میں ملتا ہے۔ یہ ایک منفرد مقالہ ہے۔ اب تک شبلی کی سیاسی بصیرت پر جو مضامین لکھے گئے ہیں ان میں اس مقالہ کو اس لحاظ سے اہمیت حاصل ہے کہ اس میں چند نئے حوالوں کا اضافہ ہے۔ تفصیلی مطالعہ کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''مولانا شبلی کے سیاسی افکار و نظریات کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عقیدت اور محبت کا عنصر غالب ہے۔ انہیں اسلام سے گہری عقیدت، پیروان اسلام سے محبت تھی۔ انسانیت سے بھی محبت تھی اور اپنے وطن عزیز سے بھی محبت تھی۔ اسلام سے عقیدت انہیں حب الوطنی سے نہیں روکتی بلکہ اس میں مدد و معاون ہوتی ہے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے بھی علم بردار تھے۔ ان سے جہاں عالمی سطح پر مسلمانوں کی پستی اور شکست و ہزیمت نہیں دیکھی جاتی وہیں ہندوستان کی غلامی بھی ان کے لئے سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ وہ ہر قیمت پر یہ زنجیریں توڑ دینا چاہتے تھے۔ اسی لئے وہ کانگریس کے حامی تھے اور گوپال کرشن گوکھلے کی قائدانہ صلاحیت کے معترف۔ ان کا سب سے بڑا وصف صاف گوئی اور آزادی رائے تھا۔ انہوں نے اظہار رائے میں تحفظات یا مصلحت کوشی کو کبھی حائل ہونے نہیں دیا۔ یہی سبب ہے کہ علی گڑھ میں قیام کے دوران بھی انہوں نے اپنے سیاسی خیالات کا اظہار برملا کیا اور اس بات کی بھی پروا نہیں کی کہ یہ کالج

کی عام پالیسی کے خلاف ہے۔'' (اردو ادب شبلی نمبر ص۱۸۱)

شاہد ماہلی نے بھی شبلی کی سیاسی بصیرت کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی کبھی عملی سیاست میں نہ تھے۔ ان کی تحریروں کا موضوع بھی عام طور سے سیاست نہ تھا، مگر ان کو مکمل سیاسی شعور تھا۔ وہ سیاسیات کے ہمیشہ دلدادہ رہے۔ علماء میں وہ پہلے شخص تھے جس نے اپنے وقت کے سیاسی مسائل میں دلچسپی لی۔ کانگریس کی حمایت کی۔ ہندو مسلم اتحاد اور سیاسی مصالحت پر مضامین لکھتے رہے۔ ہندوستان میں عالم گیر اتحاد کے وہ داعی اول تھے۔ اوقاف اسلامی، تعطیل جمعہ اور بہت سے مسلم مسائل پر بحث کا آغاز کیا اور حکومت ہند کے سامنے پیش کرنے کی جرات کی۔'' (اردو ادب ص۱۸۲)

جناب شاہد ماہلی نے اپنے موقف کی تائید میں سید طفیل احمد [۱۸۶۸-۱۹۴۶ء] کی یہ تحریر بھی نقل کی ہے:

''سیاسی کاموں میں حصہ لینے والوں میں ابتک زیادہ تر نام جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے آئے تھے مگر عجیب بات ہے کہ جب سے مسلمان فرقہ وارانہ سیاست سے نکل کر عام ملکی سیاست میں داخل ہوئے قدیم تعلیم یافتگان کا حصہ اس میں نمایاں ہوگیا بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو فرقہ پرستی کے دلدل سے نکالنے میں خاص کام کیا، جس میں سب سے اول مولانا شبلی تھے۔''

(مسلمانوں کا روشن مستقبل ص۳۸۶)

شاہد ماہلی [ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی] کا خیال ہے کہ علامہ شبلی کی کوششوں سے روز بروز احرار کی تعداد بڑھتی گئی۔ ابوالکلام، محمد علی، شوکت علی، ظفر علی خاں، حسرت موہانی اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری بہت سے نوجوان آگے بڑھے اور رہبری کی۔ (اردو ادب شبلی نمبر ص ۱۸۶) انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ شبلی اور سر سید کے سیاسی نظریات کے دو نمائندے مولانا آزاد

اور محمد علی جناح [۱۸۷۶-۱۹۴۸ء] ہندوستان کی مسلم سیاست پر کس قدر اثر انداز ہوئے ہیں اس کی تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ (اردو ادب، دہلی، شبلی نمبر ص ۱۸۷)

البتہ علامہ شبلی ہندو مسلم اتحاد کے پرزور داعی تھے، لیکن شاہد ماہلی کے الفاظ میں

''مولانا (شبلی) کے انتقال کے بعد یہ اتحاد کی کوشش بھی آگے نہ بڑھ سکی بلکہ مولانا جس بات سے خائف تھے وہی ہوا۔ اور مسلم لیگ نے دو قومی نظریے کا جو زہر بویا تھا وہ پھیلتا گیا۔ ان کے بعد کی سیاست اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے مگر مولانا شبلی کے سیاسی نظریات کا پیکر ایک ایسے شخص میں ڈھل رہا تھا جو انہی کی طرح مذہبی عالم، دانشور، ادیب اور ہندو مسلم اتحاد کا ایک عظیم ستون تھا اور اس کا نام مولانا ابوالکلام آزاد تھا۔''

(اردو ادب شبلی نمبر ص ۱۸۷)

ڈاکٹر ابوالفیض سحر [۱۹۳۷-۲۰۰۳ء] نے دانشوری کی روایت میں علامہ شبلی کے رول کی نشاندہی کی ہے۔ اور انہیں دانشوری کی روایت کا ایک روشن اور تابندہ چراغ قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ

''شبلی کی حیات اور کارنامے بنیادی طور پر ہماری دانشوری کی روایت کی روشنی کے پھول ہیں۔ دیگر کاموں کے ساتھ بطور خاص سیرۃ النعمان، الفاروق، الجزیہ، المامون، الکلام، الغزالی، علم الکلام، سوانح مولانا روم، شعر العجم اور پھر سیرۃ النبی جیسی معرکہ آراء تصانیف اسی درد اسی فکر اور اسی دانش کی دین اور اس کے استحکام اور توسیع و فروغ کے سمت اٹھائے گئے تاریخ ساز اور نہایت مبارک اور مستحسن کارنامے ہیں، جو علمیت اور عظمت میں اپنی مثال آپ ہیں۔ شبلی نے ہماری عظمت رفتہ کی تاریخ کے حقیقی عربی ماخذ تلاش کرنے اور انہیں شایان شان انداز میں لکھ کر ساری دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے وقف ہوکر پورے خلوص وانہاک اور

گہرے شعور وادراک سے جو بلند پایہ خدمات انجام دی ہیں وہ جمال الدین افغانی کے مجاہدوں کی ہم نوا بھی ہیں اور ہم پلہ بھی۔ ان کے لئے عالم اسلام اور ملت اسلامیہ شبلی کی مرہون منت ہے۔''

(اردو ادب شبلی نمبر ص ۱۹۵)

اردو ادب کے اس نمبر میں علامہ شبلی کی تصنیفات میں اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، سفرنامہ روم ومصروشام اور سیرۃ النبی کے مطالعات بھی شامل ہیں۔ شریف الحسن نقوی نے اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر کا عمدہ جائزہ لیا ہے۔ عہد عالم گیری کی تاریخ پر علامہ شبلی کی یہ ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے عالم گیر اور عہد عالم گیر پر عائد الزامات کا جائزہ لیا ہے اور بدلائل ثابت کیا ہے کہ یہ الزامات بے بنیاد ہیں۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے سفرنامہ روم ومصروشام کے مشمولات کا عمدہ تعارف کرایا ہے۔ اور مقاصد سفر کی توضیح شبلی کی تحریروں کی روشنی میں اس سلیقے سے کی ہے کہ اس سفرنامہ کی تمام خصوصیات سامنے آگئی ہیں۔

سیرۃ النبی کی اہمیت، افادیت، مقاصد اور خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد ڈاکٹر محمد عارف عمری نے چند اعتراضات کا جواب بڑے عالمانہ اور محققانہ انداز میں دیا ہے۔ سیرۃ النبی جیسی بلند پایہ کتاب نہ صرف اردو میں بلکہ عربی زبان میں بھی نہیں لکھی گئی، ڈاکٹر محمد عارف عمری کے مقالہ کا لب لباب یہی ہے۔

جناب ظفر الدین نے شبلی کی شخصیت کا جائزہ شبلی کے خطوط کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ اس موضوع پر ادیب کے شبلی نمبر میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کا مقالہ شائع ہوا ہے۔ بعض اور مقالات بھی لکھے گئے ہیں، ان کے مقابلہ میں اس میں کسی قسم کا اضافہ نہیں۔ کشمیری لال ذاکر نے اپنے مخصوص انداز میں شبلی کی شخصیت اور عظمت بیان کی ہے۔ ادیب و انشاپرداز، شاعر، مورخ، نقاد، فلسفی اور عالم کی حیثیت سے ان کے کارناموں کا جائزہ لے کر انہیں اردو ادب کا درونہ آچاریہ قرار دیا ہے۔ (اردو ادب، شبلی نمبر ص ۲۴۶)

علامہ شبلی کی فارسی شاعری پر احمد سعید کا مقالہ شامل ہے۔اس میں انہوں نے شبلی کی علمی زندگی اور شاعرانہ خیالات کا موازنہ کیا ہے۔ یہ میدان تنقید میں اگر چہ ایک غلط روش ہے تاہم عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ ''دستہ گل ان کی شگفتہ مزاجی، زندہ دلی، ظرافت طبعی اور فن شاعری میں ان کی بہترین صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔'' (اردو ادب شبلی نمبر ص ۱۵۴)

شبلی کی اردو شاعری پر ڈاکٹر شمس بدایونی نے اچھا مقالہ لکھا ہے۔ گو اس موضوع پر متعدد مضامین و مقالات لکھے گئے ہیں تاہم ڈاکٹر شمس بدایونی نے سلیقے سے اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے اور شبلی کی شاعرانہ عظمت واضح کی ہے۔ چونکہ مقالہ نگار بنیادی طور پر محقق ہیں، اس لئے اس مقالہ میں بھی ان کے تحقیقی شعور کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

شبلی ایک بڑے نقاد تھے۔ بلکہ ان کا شمار اردو تنقید کے معماروں میں ہوتا ہے۔اس نمبر میں تحقیق و تنقید پر کئی مضامین شامل ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی نے ادیب کے شبلی نمبر میں ''شبلی کی تحریکیت کے عنوان سے مقالہ لکھا تھا۔اس نمبر میں ان کا مقالہ شبلی بحیثیت نقاد شامل ہے۔ اس میں انہوں نے شبلی کی عملی و نظری تنقید اور تنقیدی تحریروں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ ''شبلی کی تنقیدی فکر اور ان کے تنقیدی عمل نے مل کر اردو تنقید کو منزل مقصود کا راستہ دکھایا ہے۔ (اردو ادب شبلی نمبر ص ۸۶)

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ان کے عالمانہ نقطہ نظر اور تجزیاتی انداز بیان نے ان اہم بنیادی موضوعات و مسائل کی گرہیں کھول دی ہیں جن میں اردو تنقید کے بعض حلقے آج تک الجھے ہوئے ہیں۔'' (اردو ادب شبلی نمبر ص ۸۶)

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے شعر العجم کے حوالہ سے علامہ شبلی کے تصور لفظ و معنی کی توضیح و تشریح کی ہے۔اس مقالہ کا تعلق لسانیات سے ہے۔ مرزا صاحب چونکہ لسانیات پر گہری نظر رکھتے ہیں، اس لئے انہوں نے اس نقطہ نظر اور مغربی افکار و تصورات کی روشنی میں علامہ شبلی کے تصور لفظ و معنی کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ تمام مباحث شعر العجم کے حوالہ سے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ علامہ شبلی کے تصور لفظ و معنی کے تعین کے بعد ان کے تصور اسلوب کو سمجھنا آسان ہو جاتا

ہے۔ پھر انہوں نے تصور لفظ و معنی ہی کی طرح ان کی تصنیفات شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر کے اقتباسات سے استدلال کرتے ہوئے علامہ شبلی کے اسلوبیاتی نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے۔ اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

> آج جدید لسانیات اور اسلوبیات کی روشنی میں اسلوب کی تشکیل و توضیح کا جو کام ہو رہا ہے اس کی جڑیں بلاشبہ شعر العجم میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔
> (اردو ادب، شبلی نمبر ص ۱۰۰)

علامہ شبلی نے ''املا اور صحت زبان'' کے عنوان سے ایک اہم مقالہ لکھا ہے جو ان کے مجموعہ مقالات میں شامل ہے۔ فاضل مقالہ نگار اور ماہر لسانیات نے اس سے تعارض نہیں کیا ہے۔ حالانکہ اس کے مطالعہ کے بغیر شبلی کی لفظیات اور لسانیات کا صحیح ادراک شاید ممکن نہیں۔

ڈاکٹر رحمت یوسف زئی نے ''شبلی اور تقابلی تنقید'' کے عنوان سے پہلے تقابلی تنقید کے معنی و مفہوم کے تعین کی کوشش کی ہے۔ پھر شبلی کے نقطہ نظر کا تجزیہ کیا ہے۔ انہوں نے موازنہ انیس و دبیر کو تقابلی تنقید کا ایک نمونہ قرار دیا ہے۔ مگر وہ اس کی اولیت کے قائل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ شبلی نے شعر العجم میں بھی بعض مواقع پر موازنہ و تقابل سے کام لیا ہے، ان کی نشاندہی کر کے تقابل کی نوعیت واضح کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شبلی نے یہ طریقہ کار اختیار کر کے اپنے ممدوح کی عظمتیں تلاش کی ہیں۔ اور یہ جو ہر شبلی نے شعر العجم میں بھی دکھلایا ہے۔

فارسی شعر و ادب کی ایک بہترین تاریخ، شبلی کے تنقیدی نقطہ نظر کی ترجمان اور اپنے موضوع پر بے مثال کتاب کی حیثیت سے شعر العجم کا ذکر اس نمبر کے مختلف مضامین میں آچکا ہے۔ پروفیسر ظہور الدین نے ایک مستقل مقالہ ''شبلی: شعر العجم جلد اول کی روشنی میں'' لکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شعر العجم سے شبلی کی شخصیت کے دو اہم پہلو ''تحقیق و تنقید'' ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس مقالہ میں انہی دونوں پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ علامہ شبلی نے شعر العجم میں ''چند ضروری باتیں'' کے عنوان سے شعر العجم کی جن کمیوں کی نشاندہی کی تھی پہلے انہیں نقل کیا گیا ہے۔ پھر شعر العجم کے مآخذ کا ذکر ہے۔ بعد ازاں شعر العجم کے مشمولات و مندرجات کی

روشنی میں شبلی کی بعض تحقیقی کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔اس کے بعد تنقیدی نقطہ نظر سے اس کا جائزہ لیا ہے۔اور آخر میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ

''ہمیں نظریاتی نقاد کے مقابلے میں عملی نقاد کی حیثیت سے شبلی کا قد زیادہ بلندو بالا نظر آتا ہے۔'' (اردو ادب شبلی نمبر ص ۱۲۰)

فاضل مقالہ نگار نے اس کی وجہ نہیں لکھی کہ شبلی کا قد نظریاتی نقاد کی حیثیت سے کیوں کر اس سے کم تر ہے۔اس سلسلہ میں مشہور نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی یہ رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ شبلی کی شعریات منضبط نہ ہونے کی وجہ سے اس کا ادراک ہمارے نقادوں کو پورے طور پر نہ ہوسکا۔(شبلی نیشنل کالج میگزین ۱۹۷۵ء ص ۱۰-۱۱)

''شبلی کی تحقیق'' پر ایک مقالہ ڈاکٹر بیگ احساس شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدر آباد کے قلم سے ہے۔اس کا پہلا جملہ ہی یہ ہے کہ'' علامہ شبلی ان معنی میں محقق نہیں تھے جیسا کہ آج اعلیٰ ادبی محقق کا تصور ہے۔لیکن علامہ اردو کے پہلے محقق ہیں جنہوں نے اپنی تصانیف میں وہ سارے اصول اپنائے جو تحقیق کے لئے ضروری ہیں۔'' (اردو ادب شبلی نمبر ص ۱۲۱) اور پورا مقالہ اسی نقطہ نظر کا ترجمان ہے۔

پروفیسر عبدالحق، سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے مقالے کا عنوان ''شبلی بلبل شیراز ہند'' ہے۔ان کا خیال ہے کہ

''علامہ شبلی ایک انسائیکلوپیڈیائی شخصیت کے امین ہیں۔ان جیسی ہمہ گیر طبیعت اور متنوع جہات میں منفرد موضوع اور اسلوب کا مالک ان کے علاوہ دوسرا نظر نہیں آتا۔تاریخ وتمدن، فلسفہ و مذہب، سیرت وسوانح، نقدو انتقاد، عرفان و ادراک سے بہرہ مند، خروش احساس سے مالامال، ملی حمیت وغیرت سے سرفراز، دوراندیشی ودوربینی کے ساتھ کارگہ فکر میں تقدیر کے ستاروں کی تخلیق کرنے والا شبلی اور صرف شبلی ہے۔''

(اردو ادب شبلی نمبر ص ۱۴۱)

پروفیسر عبدالحق نے شبلی کی فارسی شاعری کا بہت عمدہ اور تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔ شبلی جیسے قادرالکلام اور ہندوستان میں غزلیہ شاعری کی آخری بہار دکھلانے والے شاعر کا یہ ایک خوب صورت مرقع و تجزیہ ہے۔

پروفیسر عبدالحق صاحب نے اور باتوں کے ساتھ ایک بات یہ بھی واضح کی ہے کہ شبلی اثر آفریں اسلوب کے سحر ساز صاحب طرز ادیب ہیں۔ جس میں نثر و شعر کے کمال امتیاز کی دلکشی دامن دل کو منور کرتی ہے۔ اسی نقطہ نظر کا ترجمان ایک اور مقالہ ''علامہ شبلی کا اسلوب نثر'' قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی کے قلم سے ہے۔ انہوں نے مختلف زاویوں سے بحث کر کے شبلی کے دلکش اور اثرانگیز اسلوب کی خوبی یہ بتائی ہے کہ

> ''ان کا نثری اسلوب بحیثیت مجموعی علمیت اور ادبیت، وجدان و تعقل کی ایک دل نشیں آمیزش سے عبارت ہے۔ جو آج ایک صدی سے زاید عرصہ گذر جانے کے باوجود بھی اپنی معنویت اور افادیت کے ہر لحاظ سے ہر ادب شناس کی توجہ کا مرکز و محور بنا ہوا ہے۔ اور اس کے ہمہ گیر اثرات کا فیضان ہنوز جاری ہے۔'' (اردو ادب، شبلی نمبر ص ۱۳۹)

گذشتہ اوراق میں ذکر آچکا ہے کہ علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری تھے۔ انہوں نے انجمن کو انجمن ترقی اردو بنایا۔ علمی کتابیں لکھوائیں۔ اہم کتابوں کے ترجمہ کی کوشش کی۔ ہندوستان کے ممتاز اشخاص کو انجمن سے وابستہ کیا۔ ہندوؤں کے اس اعتراض کا جواب لکھا کہ انجمن صرف مسلمانوں کی ہے۔ ماہ بہ ماہ اس کی رپورٹ لکھی۔ اس کی ترقی کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کو انجمن کا رکن انتظامی اور ان کے رسالہ لسان الصدق کا ترجمان قرار دیا۔ اور اس کے ذریعہ سے ملک میں ہر طرف انجمن کی آواز بلند ہوئی۔ اردو ادب کے اس نمبر میں جو کہ انجمن ترقی اردو ہی کا ترجمان ہے ضرورت تھی کہ اس کا تفصیل سے جائزہ لیا جاتا مگر صرف ایک مختصر اور ناکافی مضمون ''شبلی اور انجمن ترقی اردو ہند'' پر اکتفا کیا گیا ہے۔ جو ایم حبیب خاں کے قلم سے ہے۔

اردو ادب کا یہ شبلی نمبر کئی لحاظ سے بہت اہم ہے۔شبلی کی شخصیت کے بنیادی خدو خال اس سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ان کی شخصیت کی عبقریت اور انفرادیت کے متعدد پہلو مقالہ نگاروں نے واضح کئے ہیں۔ان کی ادبی وتنقیدی حیثیت کی تعیین کی ہے۔محققانہ روش پر گفتگو کی گئی ہے۔لیکن ایک کمی محسوس ہوتی ہے کہ علامہ شبلی کے علم وادب پر جو اثرات مرتب کئے یا اردو شعر وادب جس حد تک ان کا رہین منت ہے،اس پر کسی مقالہ نگار نے روشنی نہیں ڈالی ہے۔اس کے باوجود اردو ادب کا یہ نمبر گذشتہ خصوصی شماروں سے کسی طرح کم اہمیت نہیں رکھتا۔ شبلی شناسی میں اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔اردو ادب کا یہ نمبر ڈاکٹر خلیق انجم نے ''شبلی کی علمی وادبی خدمات'' کے نام سے کتابی صورت میں بھی انجمن کی طرف سے شائع کر دیا ہے۔

سہ ماہی **فکر و نظر** علی گڑھ

شبلی نمبر

جون | خصوصی شمارہ | ۱۹۹۶ء

مدیر

شہریار

مدیر معاون

محمد صابر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

فکر و نظر علی گڑھ کے شبلی نمبر کا سرورق

(۱۰)

فکر و نظر، علی گڑھ

[شبلی نمبر]

[مدیر: پروفیسر شہریار، جون ۱۹۹۶ء، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ]

سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا علمی، ادبی اور تحقیقی مجلہ ہے۔ اسے ڈاکٹر یوسف حسین خاں [۱۹۰۲-۱۹۷۹ء] نے جنوری ۱۹۶۰ء میں جاری کیا تھا۔ اس وقت سے پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کا شمار اردو کے اہم علمی و تحقیقی رسائل میں ہوتا ہے۔ اس کے متعدد خصوصی شمارے مثلاً تحریک آزادی نمبر، حالی نمبر، ڈپٹی نذیر احمد نمبر اور مولانا ابوالکلام آزاد نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ جون ۱۹۹۶ء میں اس کا شبلی نمبر شائع ہوا۔ اس کے مدیر پروفیسر شہریار [۱۹۳۶-۲۰۱۲ء] تھے۔ اس خصوصی شمارے کی اشاعت کے اسباب بیان کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''سرسید نے ایم اے او کالج میں جن بڑے دانش وروں کو جمع کیا تھا، ان میں شبلی کا نام بہت اہم ہے۔ وہ لمبے عرصے تک علی گڑھ سے وابستہ رہے۔ ان کی تخلیقی اور ادبی زندگی کا یہ سنہرا دور ہے۔ اس کا اظہار انہوں نے جگہ جگہ کیا ہے۔ ان کی ایک دو رایوں کو نام نہاد سرسید پرستوں نے اتنی ہوا دی کہ عام لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ شبلی سرسید اور علی گڑھ تحریک کے مخالف تھے۔ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی یہ ایسی مثالیں ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سرسید کے تمام رفقاء

جہاں سرسید کی تحریک کے بنیادی تصورات سے اتفاق کرتے تھے، وہیں ان کی تعبیر وتشریح اوران کے عملی نفاذ میں سرسید سے ان کو ضمنی اختلاف بھی تھا۔ سوچنے والے ذہنوں میں اس نوع کے اختلاف نہ ہوں تو حیرت کی بات ہے۔ سرسید اور شبلی کے درمیان فاصلے پیدا کرنے والوں میں ان لوگوں کی اکثریت رہی ہے جو اس دور میں ہوتے تو یا سرسید کے خلاف ہوتے یا شبلی کے۔ علی گڑھ نے شبلی کو ہمیشہ اپنے معماروں میں شمار کیا ہے۔ یہ خاص نمبر اس کا ثبوت ہے۔'' (فکر ونظر شبلی نمبر ص ۵-۶)

سہ ماہی فکر ونظر علی گڑھ کا یہ نمبر پانچ ذیلی عناوین میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ شعر نقد شعر

۲۔ مشرق اور علوم مشرق

۳۔ سیرۃ النبی اور علم الکلام

۵۔ علمی وادبی روابط

۶۔ جہان شبلی

اس کا آغاز پروفیسر آل احمد سرور کے مقالہ سے ہوا ہے۔ علامہ شبلی کی اردو شاعری پر جو چند اچھے مقالے لکھے گئے ہیں ان میں سے یہ ایک ہے۔ سرور صاحب کی تنقیدی بصیرت اور نقادانہ حیثیت کا کون منکر ہوگا، اس مقالہ میں بھی انہوں نے اپنی تنقیدی بصیرت کا جلوہ دکھایا ہے اور شبلی کی اردو شاعری کے مختلف پہلوؤں کا مختلف زاویوں سے تجزیہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ

''ان کی اردو شاعری ان کی خلاقی کے بحر بیکراں کی ایک موج ہے۔ مگر یہ موج بھی کسی آب جو کی ہلکی سی لہر نہیں ہے بلکہ جوئے کوہستاں کا سا جلال وجمال رکھتی ہے۔'' (فکر ونظر شبلی نمبر ص ۸)

اس طویل مقالے میں شبلی کی نظموں، قصیدوں، مثنویوں اور دیگر اصناف سے مثالیں

دے کر سرور صاحب نے شبلی کی شاعرانہ عظمت کا مرقع تیار کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ شبلی کی مثنوی صبح امید میں جو پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم کی بحر میں ہے وہی ایجاز واختصار اور بلاغت جلوہ گر ہے جو گلزار نسیم کا امتیاز ہے۔فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ گلزار نسیم میں حسن وعشق کی منظر کشی ہے اور صبح امید میں قوم کے امراض اور مریض غم کی چارہ گری کا بیان ہے۔اسی طرح شبلی کی مشہور نظم عدل جہاں گیری کے اس شعر

اس کی پیشانی نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن

کو معجز بیانی کا لاثانی شعر قرار دیا ہے۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری [پ: ۱۹۲۵ء، دہلی] ہمارے عہد کے بڑے بالغ نظر اور وسیع المطالعہ نقاد ہیں۔انہوں نے موازنہ انیس ودبیر کا تجزیہ کیا ہے۔بعض بے جا تنقیدیں بھی کی ہیں۔اس کے باوجود ان کے نزدیک یہ علامہ شبلی کا ایک اہم ادبی وتنقیدی کارنامہ ہے۔

اسی سلسلے کا ایک اور مضمون ڈاکٹر نیر مسعود [پ: ۱۶ر نومبر ۱۹۳۶ء] کے قلم سے "موازنہ کے دو جواب" ہے۔موازنہ انیس ودبیر میں چونکہ علامہ شبلی نے انیس کو دبیر سے برتر ثابت کیا ہے، اس لئے دبیریوں نے اس کے خلاف متعدد مضامین اور کتابیں لکھیں، ڈاکٹر نیر مسعود صاحب نے اس کے جواب میں لکھی جانے والی دو کتابوں کا تعارف اور کسی قدر جائزہ لیا ہے۔ان دونوں کے نام یہ ہیں:

۱۔تردید الموازنہ، شیخ محمد جان عروج، مطبع تصویر عالم لکھنو

۲۔ردالموازنہ، میر افضل علی ضو، مطبع تصویر عالم لکھنو ۸-۱۹۰۷ء

مقالے میں انہیں دونوں کتابوں کا تعارف اور ان کے مندرجات کا تجزیہ ہے۔ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ ان دونوں کتابوں کے مصنفین کو یہ شکایت ہے کہ شبلی نے میر انیس کے مقابلہ میں مرزا دبیر کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔(فکر ونظر شبلی نمبر ص ۴۹)

موازنہ انیس ودبیر پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔اوپر پروفیسر اسلوب احمد انصاری

کے گراں قدر مقالے کا ذکر آ چکا ہے۔ موازنہ کے جواب میں نظیر الحسن فوق رضوی [۱۸۵۶-۱۹۴۸ء] نے بھی ایک کتاب ''المیزان'' لکھی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موازنہ انیس ودبیر سے بہتر اس موضوع پر کوئی کتاب اب تک نہیں لکھی جا سکی۔ خاص طور پر علامہ شبلی نے موازنہ میں جس عملی اور تاثراتی تنقید اور گہرے تقابلی شعور سے کام لیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا [۱۸ر مئی ۱۹۲۲ء] نے شبلی کی سیاسی نظموں کو موضوع بنایا ہے۔ علامہ شبلی کی شاعری میں ان کی نظموں کی حیثیت گل سرسبد کی ہے۔ شبلی کا شعری شعور ان نظموں میں جس قدر بلند آہنگ ہے شاید ان کی دیگر نگارشات میں اس قوت و توانائی کے ساتھ جلوہ گر نہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے مختلف زاویوں سے جائزے کے بعد لکھا ہے کہ

> ''یہ نظمیں خلوص، تڑپ اور ہمدردانہ انداز بیان کے باعث بھی حد درجہ مقبول ہوئیں۔ الفاظ کے استعمال کا انہیں ایسا اچھا سلیقہ ہے اور مافی الضمیر کے اظہار کے لئے انہیں اتنی کم تگ و دو کرنا پڑی ہے کہ ان کی بیشتر نظمیں ایک قدرتی غنائیت سے لبریز دکھائی دیتی ہیں۔''
>
> (فکر ونظر شبلی نمبر ص ۱۴۱)

علامہ شبلی کے تصور لفظ و معنی کے عنوان سے ڈاکٹر مرزا خلیل احمد کا جو مقالہ اردو ادب کے شبلی نمبر میں شامل تھا اسے اس میں دوبارہ شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح گیان چند جین کا مضمون ''شبلی کے نقد مثنوی کے اصول'' بھی شائع شدہ اور ادیب کے شبلی نمبر میں شامل ہے۔

علامہ شبلی نے اردو میں اپنے چھوٹے بھائی محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ کا بڑا پر درد مرثیہ لکھا ہے۔ اور فارسی میں کئی مرثیے کہے ہیں۔ فکر ونظر میں شبلی کے مراثی کا تجزیہ شامل ہے۔ علامہ شبلی نے مراثی کی جو مختصر تاریخ قلم بند کی ہے حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی نے اس کا جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی نے علامہ شبلی نعمانی کی تنقید نگاری پر مقالہ لکھا ہے۔ اس موضوع پر متعدد مقالات لکھے گئے ہیں۔ اس مقالہ میں بھی تقریباً انہیں مباحث کا اعادہ ہے،

البتہ ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی وسیع المطالعہ ناقد ہیں۔ان کا اسلوب تحریر بڑا دل کش اور قطعیت سے بھر پور ہے، جس نے شبلی کے تنقیدی شعور کی وضاحت میں ایک نیا تنقیدی رنگ پیدا کر دیا ہے۔

ایک مقالہ ''علامہ شبلی مکتوبات کے آئینے میں'' ڈاکٹر اخلاق احمد نے لکھا ہے۔اس عنوان پر اس سے قبل کئی رسائل کے شبلی نمبر میں لکھا جا چکا ہے۔اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کی ڈاکٹر اخلاق احمد نے اپنے خوب صورت اور پروفیسر خورشید الاسلام کی یاد دلانے والے اسلوب سے کام لے کر خطوط شبلی کے مطالعہ کی خواہش میں اضافہ کیا ہے اور اپنے مخصوص لب و لہجے میں مکاتیب شبلی کا اچھا تجزیہ کیا ہے۔

۲۔مشرق اور علوم مشرق کے تحت چار مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ پہلا مقالہ ''ادب اور مشرقی تاریخ کا مخزن شبلی'' پروفیسر خلیق احمد نظامی کے قلم سے ہے۔نظامی صاحب کی تاریخ پر گہری نظر تھی۔بالخصوص مشرقی تاریخ کے نشیب و فراز کا انہوں نے گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔زیر نظر مقالے میں انہوں نے علامہ شبلی کے مورخانہ شعور و آگہی ،نظریات تاریخ اور تاریخی خدمات کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔یہ واقعہ ہے کہ شبلی اپنے عہد کے ایک بڑے مورخ اور ادیب و انشاپرداز تھے۔ان دونوں جہتوں میں یہ فرق کہ آیا وہ بڑے مورخ تھے یا بڑے ادیب،اس لئے مشکل ہے کہ ان دونوں موضوعات پر ان کی لازوال تحریریں موجود ہیں۔البتہ مورخ کی حیثیت سے انہوں نے جو کتابیں سپرد قلم کیں، جیسے المامون والفاروق یہ مشرقی تاریخ کا بہتر سے بہتر نمونہ قرار دی جا سکتی ہیں۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے نہ صرف ان کا پس منظر اور نظریہ تاریخ نویسی میں ان کے اعلیٰ معیار وغیرہ کی نشاندہی کی ہے بلکہ اصول تاریخ نویسی پر ان کے گہرے نظری اور عملی طریقہ کار کی بھی تعریف و تحسین کی ہے۔اس سے پہلے ان کا ایک مقالہ ''علامہ شبلی بحیثیت مورخ'' ماہنامہ معارف (نومبر ۱۹۸۶ء) میں شائع ہو چکا تھا۔ان دونوں مقالات سے بہتر شبلی کی تاریخ نویسی کا تجزیہ اب تک نہیں ہوا ہے۔ حالانکہ اختر وقار عظیم نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب ''شبلی بحیثیت مورخ'' لکھی ہے۔

علامہ شبلی ہندوستان کے پہلے ایسے پروفیسر تھے جنہوں نے محض علم و تحقیق کے لئے

روم ومصروشام کا سفر کیا۔اور وہاں کے علمی وتعلیمی اور سماجی حالات کا مطالعہ ومشاہدہ کیا۔اور سفرنامہ لکھ کراس سے ہندوستان کوروشناس کرایا۔اس سے اس عہد کے ممالک اسلامیہ کی ایک تصویر سامنے آجاتی ہے۔پروفیسر محمد راشد ندوی نے اسی تصویر کو ابھارا ہے۔

علامہ شبلی نے مذکورہ ممالک کی تعلیمی حالت ،اخلاق اور طرز معاشرت اور پستی و زبوں حالی کے ایک ایک پہلو کو جوانہوں نے دیکھا اسے اپنے احساسات وتاثرات کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔چونکہ علامہ شبلی ایک بڑا احساس دل لے کر آئے تھے، وہ مسلمانوں کی پستی اور ذلت ونکبت کسی شکل میں برداشت نہیں کر سکتے تھے۔اس احساس نے اس سفرنامہ کو ایک رجزیہ پہلو دیدیا ہے۔اس سے عالم اسلام سے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔پروفیسر راشد نے سفرنامے کے اقتباسات اور مندرجات کی روشنی میں اس وقت کے مسلم ممالک کا ذکر کیا ہے۔راشد صاحب کی نظر عالم اسلام بالخصوص مصر وغیرہ پر گہری ہے۔اس لئے اس کے تجزیے بھی خاصے اہم ہیں۔

علامہ شبلی کی فارسی شاعری کا ذکر گذشتہ اوراق میں بارہا آچکا ہے۔پروفیسر شعیب اعظمی [۱۹۳۲-۲۰۱۳ء] نے شبلی کی فنکارانہ شخصیت اور ان کی شاعری کا ذکر فارسی کلام کی روشنی میں کیا ہے۔پروفیسر شعیب اعظمی مرحوم فارسی شعروادب پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ان کا ادبیات فارسی کا مطالعہ وسیع وعمیق تھا۔مدۃ العمر وہ اسی کے استاذ رہے۔اس لحاظ سے ان کا یہ مقالہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔دستہ گل، بوئے گل اور برگ گل شبلی کے فارسی کلام کے مجموعے ہیں بلکہ ان کی غزلیہ شاعری کے بہترین نمونے بھی۔شبلی نے غزلوں کے ساتھ معرکہ آرا نظمیں بھی کہی ہیں۔قصیدے، مثنوی، مراثی وغیرہ بھی خاصی تعداد میں ان کے کلیات میں شامل ہیں۔ان سب کا تفصیلی جائزہ خود مقالہ کی اہمیت واضح کرتا ہے۔پروفیسر شعیب اعظمی نے شبلی کے ہر طرح کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔البتہ ایک اور مقالہ جس میں کلیات شبلی فارسی کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور جو ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی کے قلم سے ہے۔اس کا یہ اقتباس خاص طور پر متوجہ کرتا ہے:

"شبلی سب سے زیادہ حافظ شیرازی کے زیر تاثیر ہیں۔اور اگرچہ فکر اور

جذبے کا وہ بھرپور اور حسین امتزاج ان کے ہاں عام طور پر نہیں پایا جاتا جس نے حافظ کی شاعری کو ساحری بنا دیا ہے۔ تاہم تراکیب اور انداز بیان کی لطافت کی حد تک وہ ہم رفتاری حافظ میں غالب سے بہت آگے ہیں۔'' (فکر و نظر شبلی نمبر ص ۱۷۹)

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی نے یوں تو اپنے مقالے کو ایک طائرانہ نظر کا نام دیا ہے مگر یہ خاصا طویل ہے۔ پس منظر کے بعد قصائد، ترکیب بند، مثنوی، قطعات، معارضات اور غزلیات، ذیلی عناوین کے تحت علامہ شبلی کی شاعری کے تقریباً تمام اوصاف و امتیازات کا ذکر کیا ہے۔ اس سے شبلی کی فارسی شاعری کا ایک عمدہ مرقع سامنے آ جاتا ہے۔

۳۔ علامہ شبلی کی معرکہ آراء تصنیف سیرۃ النبی کا ایک خاص پس منظر تھا۔ علامہ شبلی نے سیرۃ النبی کے مقدمہ میں جو اردو زبان میں طویل مقدمات کی تاریخ میں ایک اہم درجہ بلکہ ایک تصنیف کا درجہ رکھتا ہے۔ اس میں سیرۃ النبی کے سبب تالیف اور مقاصد وغیرہ کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے سیرۃ النبی کے پس منظر و پیش کش کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ اس نوعیت سے سیرۃ النبی کا اب تک جائزہ نہیں لیا گیا تھا۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے قلم سے بھی سیرۃ النبی کا جائزہ اس نمبر میں شامل ہے۔

سیرۃ النبی کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس کا غلغلہ تمام ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک بلند ہو چکا تھا۔ اور شائع ہوتے ہی اس کے مطالعے و تجزیہ کا آغاز ہوا اور اس کے حسن و قبح پر نہ صرف مضامین و مقالات لکھے گئے بلکہ بعض مستقل کتابیں بھی لکھی گئیں لیکن اس کی ادبی رعنائی و گل کاری اور ادب و انشاء کی لالہ کاری پر کسی نے توجہ نہ دی۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے سیرۃ النبی میں شبلی کی ادبی رعنائی و گل کاری کے نہایت عمدہ نمونے پیش کئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شبلی کے قلم نے اس کتاب میں جس قدر موتی بکھیرے ہیں اور ادبی رعنائی و گل کاری سے کام لیا ہے وہ الفاروق کے سوا شاید ہی کسی اور کتاب میں مل سکے۔ البتہ ظہور قدسی جیسی لافانی تحریر خود شبلی کی کسی کتاب میں نہیں ہے۔ مولانا ضیاء الدین

اصلاحی نے اس کی متعدد مثالیں نقل کی ہیں۔ظہور قدسی کا ذکر تو متعدد اہل قلم نے کیا ہے، مگر مولانا مرحوم نے اور بھی متعدد اقتباسات نقل کر کے شبلی کی سدا بہار نثر کے جلوے دکھائے ہیں۔ یہاں سیرۃ النبی کے دو اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں جو مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے اپنے مقالے میں درج کئے ہیں۔علامہ شبلی لکھتے ہیں:

۱۔''کیا عجب بات ہے ارباب سیر مغازی کی داستان جس قدر زیادہ دراز نفسی اور بلند آہنگی سے بیان کرتے ہیں، یورپ اسی قدر اس کو زیادہ شوق سے جی لگا کر سنتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ داستان اور پھیلتی جائے۔ کیونکہ اس کو اسلام کے جور وستم کا جو مرقع آراستہ کرنا ہے، اس کے نقش ونگار کے لئے لہو کے چند قطرے نہیں بلکہ چشمہ ہائے خوں درکار ہیں۔''

۲۔''خطبہ کے بعد آپ ﷺ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جباران قریش سامنے تھے۔ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب سے پیش رو تھے۔وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں۔وہ بھی تھے جن کی تیغ وسناں نے پیکر قدسی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں۔وہ بھی تھے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے۔وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا کرتے تھے۔وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی چیز سے نہیں بجھ سکتی تھی۔وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا۔وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجے میں پوچھا کہ تم کو معلوم ہے کہ میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں۔ یہ لوگ

اگر چہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے، لیکن مزاج شناس تھے، پکار اٹھے کہ

اخ کریم و ابن اخ کریم (تو شریف بھائی اور شریف برادرزادہ ہے)

ارشاد ہوا:

لاتثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء (تم پر کچھ الزام نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔)

اس کے بعد ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کا مقالہ شبلی اور علم کلام شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے قدرے تفصیل سے شبلی کے علم کلام کا جائزہ لیا ہے۔ بعض اعتراضات بھی کئے ہیں، لیکن وہ اہم نہیں کہ اس سے پہلے تو الکلام کی بعض عبارتوں پر فتوی کفر بھی صادر کیا جا چکا ہے۔ البتہ انہوں نے اس فتوے کا ذکر نہیں کیا ہے اور اس کے اسباب بھی نہیں لکھے ہیں۔ علامہ شبلی کے خلاف دو بار کفر کا فتویٰ دیا گیا۔ پہلی بار ۱۹۱۲ء میں ندوہ کے اجلاس دہلی میں چار چار فتوے تقسیم ہوئے۔ پھر ان کی وفات کے ۲۲ رسال بعد ۱۹۳۶ء میں۔ دونوں دفعہ الکلام ہی کے ایک اقتباس کا سہارا لیا گیا تھا۔ یہ فتاوے راقم کی نظر سے اب تک نہیں گذرے۔ حیات شبلی میں بھی وہ درج نہیں ہیں۔ چونکہ دوسرے فتوے کی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی [۱۸۶۳-۱۹۴۳ء] نے بھی تائید و توثیق کی تھی اور پھر اصلیت سے واقفیت کے بعد رجوع کر لیا تھا۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے چونکہ اپنے مقالے میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس لئے اس کو تلاش کرنے کی ذمہ داری بھی انہی پر عاید ہوتی ہے۔

۴۔ علامہ شبلی کی زندگی کا سب سے اہم اور قیمتی حصہ علی گڑھ میں سرسید کے ساتھ گذرا۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون، سیرۃ النعمان، سفرنامہ روم و مصر و شام، تاریخ بدء الاسلام اور الفاروق جیسی اہم کتابیں اور الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ اور حقوق الذمیین جیسا اہم تحقیقاتی کارنامہ بھی یہیں انجام دیا۔ یہیں ان کی شاعری اور خطابت کے جلوے نمایاں ہوئے، غرض شبلی کی ابتدائی علمی زندگی کے تمام اہم کارنامے علی گڑھ کالج میں منصۂ شہود پر آئے۔ اس کی ایک تاریخ پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی نے اپنے مقالے میں قلم بند کی ہے۔ اس موضوع پر

بعض اور اہل قلم نے بھی قلم اٹھایا ہے۔ راقم نے بھی ایک مقالہ ''شبلی علی گڑھ میں'' لکھا ہے۔ جو متعلقات شبلی میں شامل ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ محترم ظفر الاسلام اصلاحی صاحب نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ البتہ ایک پہلو کی طرف ان کی توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ہندوستان کے بعض مشاہیر مثلاً علی برادران، مولانا ظفر علی خاں، بابائے اردو مولوی عبدالحق وغیرہ نے علی گڑھ ہی میں علامہ شبلی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا، اس مقالہ میں ان کا ذکر ہونا چاہئے تھا۔

علامہ شبلی نے عربی زبان میں اسکات المعتدی اور الانتقاد جیسی اہم کتابیں لکھی ہیں۔ عربی میں ان کے ایک دو اشعار، ایک خط اور سرسید کی شان میں ایک قصیدہ بھی ہے۔ ان کی عربی زبان وادب سے دلچسپی اور خدمات کا مفصل ذکر مولانا سعید انصاری کے مقالے میں آچکا ہے، جو ادیب کے شبلی نمبر میں شامل ہے۔ زیر نظر نمبر میں اسی موضوع پر ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی نے بھی ایک مضمون لکھا ہے، لیکن یہ محض ایک مضمون ہی ہے۔

شبلی کی فارسی شاعری اور غزل گوئی میں حافظ شیرازی سے متاثر ہونے اور ان کے رنگ وآہنگ میں شعر کہنے کا ذکر آچکا ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر آصف نعیم نے قدرے تفصیل سے شبلی کے فارسی کلام کا جائزہ لیا ہے۔ اور حافظ وشبلی کی مشترک شعری قدروں کے ساتھ شبلی کے تاثر اور ان کے ذوق ووجدان پر حافظ کے اثر انداز ہونے کا ذکر کیا ہے۔

اس حصے کا ایک اہم مقالہ ''شبلی نعمانی اور انجمن ترقی اردو'' ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس موضوع پر ایک اہم کتاب ''انجمن ترقی اردو کی علمی وادبی خدمات'' لکھی ہے، جس کا یہ خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔ انجمن ترقی اردو پر شبلی کے حوالہ سے اب تک جتنے مقالات لکھے گئے ہیں، ان میں یہ سب سے اہم ہے۔ البتہ ایک بات وہ لکھنے سے رہ گئے کہ علامہ شبلی نے مولانا ابوالکلام آزاد کو انجمن کا رکن انتظامی نامزد کیا تھا اور ان کے رسالہ لسان الصدق کو انجمن کا ترجمان قرار دیا تھا۔ اسی طرح تراجم کتب کی جانچ پڑتال کرنے والوں میں ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ علامہ اقبال بھی شامل تھے۔

۵۔ فکر ونظر کے اس نمبر کا آخری حصہ ''جہان شبلی'' ہے۔ یہ دراصل کتابیات شبلی ہے، جسے مشہور اشاریہ ساز ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری نے تیار کیا ہے۔ اس میں جون ۱۹۹۶ء تک کی شبلی شناسی کا مکمل اشاریہ آ گیا ہے۔ البتہ اس کے متعدد اندراجات غلط ہیں۔ مثلاً انہوں نے الفاروق کے طبع اول کا سنہ اشاعت ۱۸۹۸ء لکھا ہے جبکہ وہ ۱۸۹۹ء میں طبع ہوا۔ اسی طرح مکاتیب شبلی حصہ اول کے پہلے ایڈیشن کو معارف پریس اعظم گڑھ سے طبع لکھا ہے جب کہ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۶ء میں شاہی پریس لکھنو سے چھپا تھا وغیرہ۔ راقم نے ''کتابیات شبلی'' میں ان پر اعتماد کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتابیات شبلی میں بھی متعدد اغلاط راہ پا گئے۔ حالانکہ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری ایک بڑے اشاریہ ساز تھے۔ انہوں نے متعدد مشاہیر کا اشاریہ مرتب کیا ہے۔ سر سید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مولانا حالی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا حسرت موہانی ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ پر ان کے اشاریے شائع ہو چکے ہیں۔ نقوش ذاکر تو کتابی صورت میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے شائع ہو چکا ہے۔

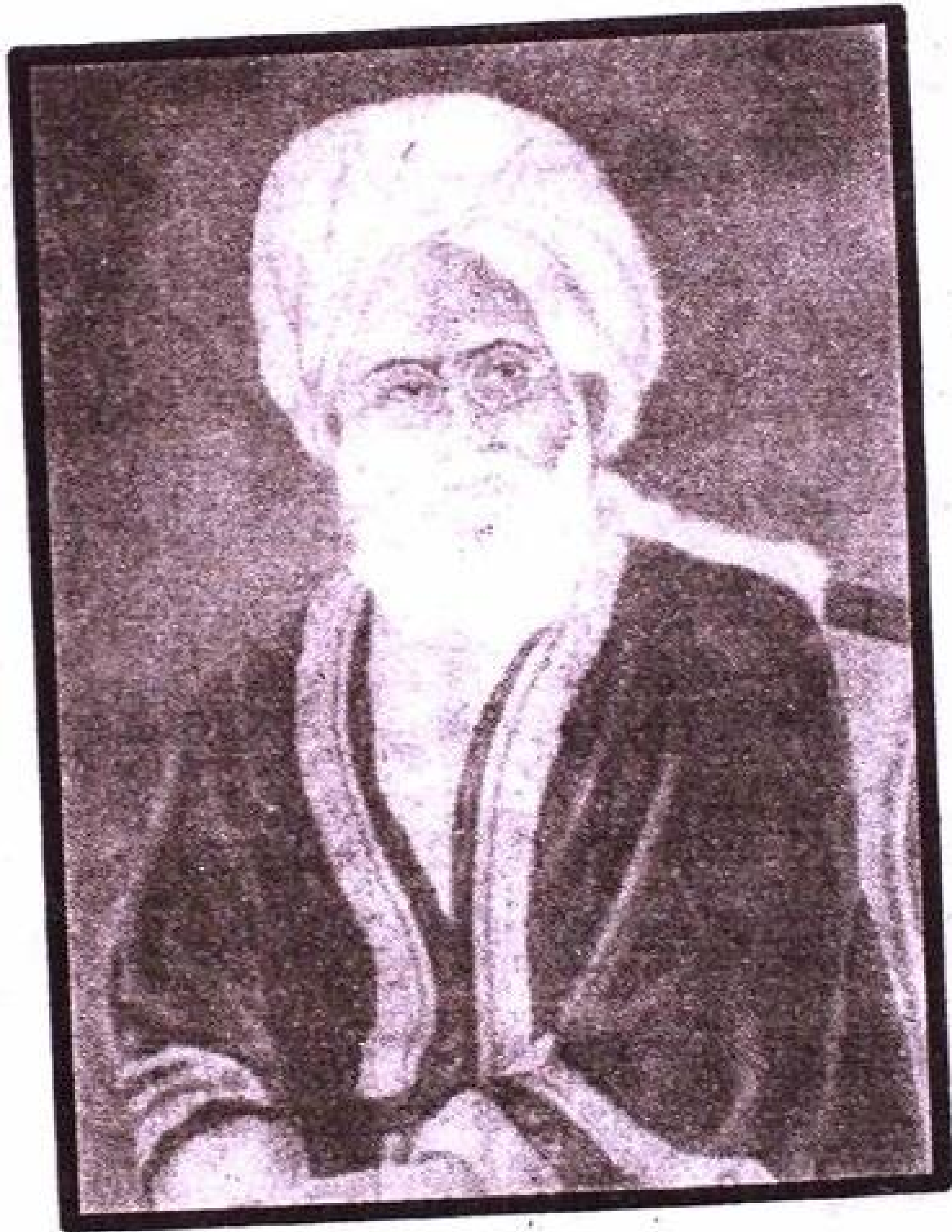
اشاریہ شبلی کی پہلی کوشش خانوادہ شبلی کے ایک فرد احمد اسحاق نعمانی نے کی تھی۔ اسے ڈاکٹر ابن فرید نے ماہنامہ ادیب کے شبلی نمبر میں شائع کیا۔ ان کے بعد اختر راہی نے کتاب نامہ شبلی مسلم اکیڈمی لاہور سے شائع کیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری نے 'جہان شبلی' مرتب کیا۔ جو فکر ونظر کے اس خصوصی شمارہ میں شامل ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس نمبر کا حاصل یہ اشاریہ ہے۔ اس کے پندرہ سال بعد راقم نے کتابیات شبلی مرتب کی، جسے ۲۰۱۱ء میں دارالمصنفین نے شائع کیا ہے۔ فکر ونظر کا یہ شبلی نمبر شبلی شناسی کے میدان میں ایک نمایاں پیش رفت ہے۔ علامہ شبلی پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ ضروری قرار دیا جا سکتا ہے۔

شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ

میگزین

شبلی نمبر

۲۰۰۸-۲۰۰۷



۱۸۵۷-۱۹۱۴

شبلی کالج میگزین شبلی نمبر کا سرورق

(۱۱)

شبلی کالج میگزین اعظم گڑھ

[شبلی نمبر]

[مدیر: ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی، شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ، ۸-۲۰۰۷ء]

علامہ شبلی ۲۴/۲۵ سال کی عمر میں فروری ۱۸۸۳ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ سے وابستہ ہوئے۔ پانچ ماہ کے اندر ہی ۲۶/جون ۱۸۸۳ء کو اپنے وطن اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول کی بنیاد رکھی۔ یہ نیشنل اسکول ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا آج شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے نام سے ملک کا ایک ممتاز تعلیمی ادارہ ہے۔ ۱۳۰/برس سے یہ تعلیمی ادارہ بلا تفریق مذہب و ملت تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس سے بے شمار افراد نے اپنی علمی تشنگی بجھائی ہے۔ اس سے تعلیم حاصل کرنے والے چند ممتاز افراد کے نام یہ ہیں:

مولانا اقبال احمد خاں سہیل، مرزا احسان احمد، مرزا سلطان احمد [آئی، سی، ایس]، مولوی محبوب الرحمٰن کلیم شعیب احمد وزیر خزانہ پاکستان، جنرل مرزا اسلم بیگ چیف آف آرمی پاکستان، پروفیسر عقیل احمد فضا اعظمی، پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی، پروفیسر کبیر احمد جائسی، پروفیسر خورشید نعمانی رودولوی، پروفیسر مرزا اعجاز بیگ پروفیسر اسرار احمد، پروفیسر شمیم جیراجپوری، محمد ایوب واقف، ڈاکٹر انور جلال پوری سابق چیرمین عربی، فارسی بورڈ اتر پردیش، جناب وسیم احمد وزیر مملکت برائے بیسک تعلیم اتر پردیش وغیرہ۔ آخر الذکر وسیم احمد صاحب علامہ شبلی کی بڑی بیٹی فاطمہ خانم [م: ۱۹۰۹ء] کے پوتے ہیں۔

شبلی کالج کا ایک سالانہ میگزین شائع ہوتا ہے۔ یہ میگزین کب جاری ہوا یہ تو نہیں

معلوم ہوسکا، اس لئے کہ اس کی مکمل فائل کہیں محفوظ نہیں ہے، حتیٰ کہ شبلی کالج میں بھی نہیں۔ قیاس ہے کہ یہ آزادی کے فوراً بعد جاری ہوا اور تقریباً ۶۰-۶۵ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے گذشتہ دو شمارے بزم شبلی کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

اس کے تین خصوصی شمارے ''عبدالسلام ندوی کی یاد میں''، ''افکار سہیل'' اور ''جگر نمبر'' راقم کی نظر سے گذرے ہیں۔ علمی حیثیت سے اس کی طرف ابتک کسی نے توجہ نہیں دی۔ حالانکہ اس میں گذشتہ نصف صدی سے زاید عرصہ کے نہ صرف شبلی کالج کے بلکہ اس پورے خطہ اعظم گڑھ کے علمی و تعلیمی اور تہذیبی نقوش ثبت ہیں۔ کالج سے وابستہ متعدد اشخاص، اساتذہ اور اہل علم کے حالات و خدمات بھی اس میں لکھے گئے ہیں۔ قدیم طلبہ اور ممتاز اساتذہ کی علمی و تعلیمی سرگرمیوں اور ان کی حوصلہ مندیوں کی داستان بھی اس میں سمٹی ہوئی ہے۔ اس لئے انہیں جمع کرنا اور ان کے مشمولات کا اشاریہ تیار کرکے شائع کرنا ایک ضروری کام ہے۔ یقین ہے اس سے شبلی نیشنل کالج کا شاندار ماضی سامنے آجائے گا۔

علامہ شبلی علیہ الرحمہ کے ایک شاگرد اقبال احمد خاں سہیل کا شمار ملک کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی وفات [۱۹۵۵ء] کے بعد ان کے ادبی، تنقیدی اور تبصراتی مضامین کا مجموعہ ''افکار سہیل'' جناب شوکت سلطان صاحب سابق پرنسپل اور میجر علی حماد عباسی، استاذ شبلی کالج کی ترتیب و تقدیم کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ بھی پھر کبھی شائع نہیں ہوا۔ حالانکہ اقبال احمد خاں سہیل صاحب کے ادبی و تنقیدی افکار کے مطالعہ کے لئے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ شبلی کالج کی قدیم و جدید مطبوعات کی اشاعت کے لئے پبلی کیشن ڈیویزن کا قیام ضروری ہے۔ اسی طرح شبلی کالج میگزین کے قدیم شماروں سے ''ناموران شبلی کالج'' کی تدوین بھی کی جاسکتی ہے۔

۸-۲۰۰۷ء میں کالج میگزین کے ایڈیٹر ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی صاحب صدر شعبہ عربی نے ''شبلی نمبر'' شائع کیا۔ ان کی ادارت میں شائع ہونے والا میگزین کا یہ آخری شمارہ تھا۔ اس کو یادگار بنانے کے لئے انہوں یہ شبلی نمبر شائع کیا۔ اس کی اشاعت کے اسباب بیان کرتے

ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ:

''آج جب کہ اسلام کی روشن شبیہ کو دھندلا کرنے اور اس کی تعلیمات کو غلط انداز میں پیش کئے جانے کی منصوبہ بند سازشیں ہو رہی ہیں ایسی صورت حال میں علامہ شبلی کی علمی وفکری خدمات کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔علامہ نے مستشرقین کے الزامات واعتراضات کا علمی انداز میں جواب دے کر ان خطوط پر کام کرنے والوں کے لئے ایک لائحہ عمل پیش کر دیا ہے کہ ہر زمانے میں اسلام کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کا مقابلہ کس طرح علمی انداز میں کیا جائے۔اس کا اندازہ مولانا سید سلیمان ندوی مولانا مودودی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے کہ بعد میں آنے والے اصحاب فکر ونظر نے علامہ کی تحریروں سے کتنا زیادہ اثر قبول کیا۔موجودہ زمانے میں سنجیدہ اہل قلم کی تحریروں میں بھی شبلی کا رنگ صاف جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اسی طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ موجودہ زمانہ میں علمی شناخت شبلی سے جڑی ہوئی ہے، کالج میگزین کا یہ شمارہ شبلی شناسی کی اسی زریں سلسلے کی ایک کڑی ہے۔'' (شبلی کالج میگزین، شبلی نمبر ص ۵-۶)

شبلی کالج میگزین کے اس نمبر میں کل ۱۷ مضامین و مقالات شامل ہیں۔اس کا آغاز حبیب شبلی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے مقالہ ''مرحوم علامہ شبلی نعمانی'' سے ہوا ہے۔اس کے بعد مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا مقالہ ''علامہ شبلی اور اعظم گڑھ'' شامل ہے، جو ان کی کتاب ''چند ارباب کمال'' سے نقل کیا گیا ہے۔

علامہ شبلی ۴ رجون ۱۸۵۷ء کو اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بندول میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے ان کے والد شیخ حبیب اللہ [م: ۱۲ رنومبر ۱۹۰۰ء] نے شہر اعظم گڑھ میں ایک عربی مدرسہ قائم کیا جس میں پہلے مولوی فیض اللہ مئوی [۱۲۳۰-۱۳۰۶ھ]

بعدازاں مولانا فاروق چریاکوٹی [۲۸/اکتوبر ۱۹۰۹ء] نے درس دیا۔ یہ مدرسہ اگرچہ صرف علامہ شبلی کی تعلیم کے لئے قائم کیا گیا تھا تاہم بعض دوسرے طلبہ بلکہ دوسرے شہروں کے طلبہ نے بھی اپنی علمی تشنگی بجھائی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد شبلی نے یہیں وکالت کا امتحان دیا۔ امینی اور وکالت کی۔ مناظرے، درس وتدریس، شعروشاعری کے ساتھ قومی وملی کام مثلاً ترکی کے لئے چندہ وغیرہ انجام دئے۔ بعد میں اسی شہر میں نیشنل اسکول قائم کیا۔ بعض کتابوں کی تصنیف کا آغاز اور بعض اسی شہر میں پایہ تکمیل کو پہونچیں۔ پھر آخر میں دارالمصنفین قائم کیا۔ اور یہیں آخری سانس بھی لی اوراسی کی خاک میں آسودہ ہوئے۔ یہ تمام تفصیلات مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے اس میں قلم بند کی ہیں۔ اس مقالے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں حیات شبلی کے مقابلہ میں چند نئے واقعات اوران کی تفصیلات درج ہیں۔ مولانائے مرحوم نے علامہ شبلی کے ان تلامذہ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جو اعظم گڑھ کے باشندے تھے۔ مثلاً مولانا حمید الدین فراہی، مولانا اقبال احمد خاں سہیل، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا شبلی متکلم ندوی، مولوی عبدالعزیز ندوی، مولوی عبدالسلام ندوی وغیرہ۔ ان میں مولانا فراہی اور اقبال سہیل کے علاوہ کسی نے اعظم گڑھ میں ان سے تحصیل علم نہیں کیا۔ اس کا ذکر ہونا چاہئے تھا۔ آخرالذکر دونوں تلامذہ کا ذکر عموماً نہیں کیا جاتا ہے۔ حیات شبلی میں بھی ان کا ذکر نہیں ہے۔ ان کی نشاندہی مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کی تلاش وجستجو کا نتیجہ ہے۔ مولانا عبدالعزیز ندوی موضع راجہ پور سکرور اور مولوی عبدالسلام ندوی [م: ۱۹۷۵ء] موضع رواں کے رہنے والے تھے۔ دونوں نے ندوۃ العلماء میں علامہ شبلی سے علمی تشنگی بجھائی تھی۔

پھر مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے علامہ شبلی کے ان کاموں کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے اعظم گڑھ کی ترقی اور بہبودی کے لئے کئے تھے۔ اعظم گڑھ میں علامہ شبلی کی یادگاروں مثلاً شبلی نیشنل کالج، مدرسۃ الاصلاح اور دارالمصنفین کے ذکر میں بھی انہوں نے بعض نئی معلومات پیش کی ہیں۔ اس کے بعد بندول کا ذکر کیا ہے۔ اور شبلی کا یہ شعر بھی درج ہے:

فضل بندول اگر تو نہ شناسی   آدمی نیستی تو نسناسی

علامہ شبلی کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ان کا مقالہ الجزیہ ہے۔ جس میں انہوں نے انگریز مورخین کے اس الزام کی تردید کی ہے کہ جزیہ کا موجد اسلام ہے اور یہ ظالمانہ ٹیکس مسلمانوں نے اس لئے نافذ کیا تھا کہ غیر مسلموں کو بہ جبر اسلام میں داخل کیا جا سکے۔ علامہ شبلی نے انتہائی اہم مصادر اور مضبوط دلائل سے ثابت کیا ہے کہ جزیہ کا موجد اسلام نہیں بلکہ نوشیرواں تھا۔ اور یہ ایک ایسا آسان ٹیکس تھا جو معمولی سے معمولی شخص بھی بآسانی ادا کر سکتا تھا۔ علامہ شبلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ عورت، بچے، بوڑھے اور مجبور ولاچار اس ٹیکس سے بری تھے۔ اور یہ کوئی ظلم نہیں بلکہ غیر قوموں کے حق میں ایک رحمت تھا۔

علامہ شبلی کی اس تحقیق پر اس شبلی نمبر میں دو مقالے شامل ہیں۔ ایک پروفیسر سید عبدالباری، سابق صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا مقالہ ہے اور دوسرا ڈاکٹر علاء الدین خاں نے لکھا ہے۔ ڈاکٹر علاء الدین خاں شبلی کالج کے تاریخ کے استاذ ہیں۔ انہوں نے عہد عالمگیر کے علماء پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ، ڈی کی سند لی ہے۔ ان کا مطالعہ تاریخ وسیع ہے۔ انہیں لکھنے کا بھی اچھا سلیقہ ہے۔ اس مقالہ میں بھی یہ خوبیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔

ڈاکٹر شباب الدین صاحب صدر شعبہ اردو نے ''مقالات شبلی'' کی روشنی میں علامہ شبلی کی مقالہ نگاری کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب پختہ مشق اہل قلم، ادیب اور نقاد ہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی پر ان کا شاندار تحقیقی مقالہ شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ دارالمصنفین کی ادبی خدمات کا تعارف بھی ان کی ایک اہم کاوش ہے۔ انہوں نے متعدد ادبی وتنقیدی مقالات لکھے ہیں۔ زیر نظر مقالہ بھی ان کے گہرے تنقیدی مطالعہ وشعور کا پتہ دیتا ہے۔ انہوں نے سچ لکھا ہے کہ ''شبلی خواہ کسی موضوع پر مقالہ لکھیں اس کے ہر پہلو کا نہ صرف احاطہ کر لیتے ہیں بلکہ ہر ہر پہلو کے حسن وقبح کو نمایاں بھی کرتے جاتے ہیں۔ اور درست کو درست اور غلط کو غلط کہنے میں دریغ بھی نہیں کرتے۔'' (شبلی کالج میگزین شبلی نمبر ص ۹۸)

مولانا کلیم صفات اصلاحی رفیق دارالمصنفین نے علامہ شبلی کی تحریروں میں سائنسی

مباحث کی نشاندہی کی ہے۔ اس موضوع پر اس سے پہلے مشہور نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مقالے ''اردو سائنس اور مسلمان'' [مشمولہ جدیدیت کل اور آج] میں قدرے تفصیل سے فکری بحث کی ہے۔۔ ان کا خیال ہے کہ علامہ شبلی پہلے ایسے عالم ہیں جنہوں نے واضح کیا ہے کہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء سے پہلے بعض مسلمان فلاسفہ نے یہی نظریہ پیش کیا تھا اور یہ کہ اسے پیش کرنے میں کوئی مذہبی قباحت نہیں۔ فاروقی صاحب کے اس مقالہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید وقدیم فلسفہ پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ غالباً مولانا کلیم صفات اصلاحی کی نظر سے فاروقی صاحب کی یہ گراں قدر تحریر نہیں گذری، تاہم انہوں نے جس محنت سے یہ مقالہ لکھا ہے وہ قابل تحسین ہے۔

ڈاکٹر محی الدین آزاد نے علامہ شبلی کے قومی وملی افکار کو موضوع بنایا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بے حد اہم موضوع ہے۔ مقالہ نگار نے اچھا تجزیہ کیا ہے، خاص طور پر علامہ شبلی کی تحریک وقف علی الاولاد پر انہوں نے اچھی معلومات جمع کر دی ہیں۔

علامہ شبلی کے ۱۶ رسالہ قیام علی گڑھ کے بہت سے کارناموں میں ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایم اے او کالج میں مذہبی فضا قائم کی۔ اس سلسلہ کے کاموں میں ایک ان کا وہ درس قرآن بھی شامل ہے جو روزانہ کلاس شروع ہونے سے پہلے وہ دیا کرتے تھے۔ ان کا یہ درس قرآن بے حد مقبول تھا۔ اسی درس قرآن کے فیض یافتہ علی برادران [مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر] تھے۔ مولانا ظفر علی خاں اور سید سجاد حیدر یلدرم نے بھی اس درس قرآن میں شرکت کی تھی۔ ان کے علاوہ بھی بعض ممتاز اشخاص کو اس میں شرکت کا شرف حاصل تھا۔ پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب جو خود علی گڑھ میں درس قرآن کا اہتمام کرتے ہیں۔ انہوں نے علامہ شبلی کے درس قرآن کی تفصیلات اور خصوصیات اپنے مقالہ میں بڑی عمدگی سے لکھی ہیں۔

علامہ شبلی نے قرآن مجید کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھا۔ اس کے مطالعہ وتلاوت کا وہ خاص اہتمام کرتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ وہ مطبوعہ قرآن کے بجائے

قلمی نسخوں سے تلاوت قرآن پسند کرتے تھے۔اور اس کے لئے وہ ہمیشہ قیمتی نسخہ قرآن اپنے پاس رکھتے تھے۔مولانا سعود عالم قاسمی نے علامہ شبلی کے شغف قرآن اور ان کی قرآن فہمی پر ایک مستقل کتاب ''علامہ شبلی کی قرآن فہمی'' لکھی ہے۔جسے ۲۰۰۵ء میں فاران اکیڈمی علی گڑھ نے شائع کیا۔اس کا ایک ایڈیشن پاکستان سے بھی شائع ہوا ہے۔

تاریخ ترتیب قرآن، علامہ شبلی کا ایک مقالہ ہے۔ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی نے اس کا جائزہ پیش کیا ہے۔اس میں انہوں نے علامہ شبلی کے بعض خیالات سے اختلاف کیا ہے، مگر ان کا یہ اختلاف قابل اعتناء نہیں بلکہ ان کے کمزور مطالعے کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر شمیم احمد نے علامہ شبلی نعمانی اور علامہ اقبال کے فکری رویوں میں مماثلت کی نشاندہی کی ہے۔اور محنت سے مطالعہ وتجزیہ پیش کیا ہے۔خاص طور پر فکر وفلسفہ سے متعلق انہوں نے شبلی واقبال کے خطبات سے مشترک اقدار کی نمائندہ تحریروں سے استدلال کیا ہے، اور دونوں کی فکری ہم آہنگی دکھلائی ہے۔البتہ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''اقبال کی تحریروں میں شبلی سے اخذ واستنباط کا براہ راست ذکر نہیں ملتا۔'' (ص ۸۷) حالانکہ علامہ اقبال نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں الغزالی اور علم الکلام کے حوالے دئے ہیں۔اس سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاید انہیں شبلی واقبال کے تعلقات کا صحیح علم نہیں ہے۔

علامہ اقبال شبلی کے بڑے معتقد تھے۔ان کی خواہش تھی کہ شبلی ان کے وطن پنجاب میں قیام کریں۔(مشاہیر کے خطوط ص ۹۶) ان کی پہلی تصنیف علم الاقتصاد کی زبان و بیان کی تصحیح علامہ شبلی نے کی تھی۔(دیباچہ علم الاقتصاد، لاہور ۱۹۰۴ء) علامہ شبلی نے انہیں انجمن ترقی اردو کی اس کمیٹی میں شامل کیا تھا جس کی رپورٹ کے بعد مترجمہ کتب انجمن سے شائع ہونی تھیں۔علامہ شبلی نے وقف علی الاولاد کی تحریک چلائی تو علامہ اقبال کو اس میں شمولیت کے لئے خط لکھا۔علامہ اقبال اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس میں شامل نہ ہوسکے۔اس سلسلے میں انہوں نے علامہ شبلی کو جو خط لکھا تھا وہ ''کلیات مکاتیب اقبال'' میں شامل ہے۔

(کلیات مکاتیب اقبال جلد اول ص ۲۳۹)

اسی طرح ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی میں شبلی نے اقبال کو پھولوں کا ہار پہنایا تھا اوران کے بڑے شاعر ہونے کی پیشین گوئی کی تھی۔(اقبالیات اور قرۃ العین حیدر ص ۳۶۔ ۳۷) ان تعلقات کے پس منظر میں اگر شبلی و اقبال کے مماثل فکری رویوں کی نشاندہی کی جاتی اور ان کے افکار کا مطالعہ کیا جاتا تو اس مضمون کی نہ صرف افادیت بڑھ جاتی بلکہ موضوع کا زیادہ صحیح تجزیہ سامنے آتا۔

مولانا عمیر الصدیق ندوی دریابادی دارالمصنفین کے سینئر رفیق اور مشہور اہل قلم ہیں۔ان کا علم ومطالعہ وسیع وعمیق ہے۔ان کے مقالے کا عنوان ''شبلی اور چند ناموران علی گڑھ'' ہے۔یہ مقالہ اس خیال سے لکھا گیا ہے کہ

> ''شبلی شناسی میں علی گڑھ نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔شبلی کی عظمت کے ساتھ یہ علی گڑھ کی عظمت کا بھی آئینہ ہے اور آئینہ سے دوچار ہونے کی کوشش ان کو بھی کرنا چاہئے جو شبلی اور علی گڑھ کی کہانی پڑھتے اور بیان کرتے ہیں۔''
>
> (شبلی کالج میگزین، شبلی نمبر ص ۶۷)

فاضل مقالہ نگار نے علی گڑھ تحریک کے چار ممتاز اہل قلم پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر خلیق احمد نظامی اور ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کے مقالات کا تجزیہ کرکے ان کی شبلی فہمی اور شبلی شناسی کا ذکر کیا ہے۔ان چاروں اہل قلم کا میدان تنقید، تاریخ، ادب اور لسانیات ہے۔اس لحاظ سے یہ مطالعہ اہم ہے، لیکن کسی اہل قلم کی محض ایک تحریر پر اکتفا کرنا جبکہ دوسری تحریریں موجود ہوں موضوع سے انصاف نہیں۔اس مضمون سے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علی گڑھ کے بعض دیگر اہل قلم جنہوں نے شبلی پر متعدد مضامین ومقالات لکھے مثلاً پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی اور پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی وغیرہ۔انہیں فاضل مقالہ نگار نے کیوں کر نظر انداز کیا۔؟

علامہ شبلی کی یادگاروں میں شبلی کالج کی تعلیمی وسماجی خدمات بہت اہم ہیں۔اس خطہ اعظم گڑھ پہ شبلی کا یہ ایک بڑا فیضان ہے جس کے ذروں کی تابانی سے یہ خطہ منور ہے۔ڈاکٹر احمد

علی نے شبلی کالج اور اس کے مقاصد، خصوصیات اور خدمات کا ایک اجمالی مرقع پیش کیا ہے۔ تعلیم ہی سے متعلق ایک اور مقالہ پروفیسر طلعت عزیز استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے قلم سے ہے۔اس میں انہوں نے تعلیم نسواں سے متعلق شبلی کے افکار وخیالات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علامہ شبلی تعلیم نسواں کے ایک بڑے حامی تھے۔ وہ خواتین کی عزت و احترام اور ان کی ترقی کے خواہاں تھے۔انہوں نے اگرچہ خواتین کے لئے نہ کوئی ادارہ قائم کیا اور نہ اس طرح کے کسی ادارہ سے وابستہ رہے، تاہم ان کے مقالات اور بعض کتابوں میں خواتین سے متعلق جن افکار و خیالات کا اظہار ملتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خواتین کو مردوں کے شانہ بشانہ دیکھنے کے آرزومند تھے۔اس موضوع پر کلیم صفات اصلاحی نے ایک طویل مقالہ لکھا ہے جو ہماری زبان دہلی [۲۲ تا ۲۸/اپریل ۲۰۰۵ء وا تا ۷/مئی ۲۰۰۵ء] میں شائع ہوا ہے۔یہ اپنے موضوع پر ایک عمدہ مطالعہ ہے۔

علامہ شبلی کے ادب وانشا پر کون ہے جو ناز نہیں کرتا۔شبلی کالج میگزین کے اس نمبر میں مولانا سعید انصاری کا گراں قدر مقالہ مولانا شبلی اردو کے بہترین انشا پرداز قند مکرر کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔اور بلاشبہ یہ ایک بڑا اہم اور وقیع مقالہ ہے۔اس سے علامہ شبلی کی انشاپردازی کے تمام جوہر اور ان کے ادبی مقام کی بلندی سامنے آجاتی ہے۔

اس نمبر میں راقم کے دو مقالے شامل ہیں۔ پہلا مقالہ ''غالب وشبلی'' ہے۔یہ خاص اس نمبر کے لئے لکھا گیا تھا۔غالب وشبلی میں بعض قدریں مشترک ہیں۔اس مقالہ میں پہلے اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔پھر شبلی کی غالب شناسی کا مطالعہ ہے۔پروفیسر شعیب اعظمی نے اپنے ایک مقالہ [ماہنامہ جامعہ دہلی فروری، مارچ ۱۹۵۹ء] میں انہیں منکر غالب قرار دیا تھا۔یہ صحیح نقطہ نظر نہیں تھا۔اس لئے اس مقالہ میں شبلی کی غالب شناسی اور ان کے فکر وفلسفہ شاعری پر شبلی کے خیالات اور نقطہ نظر کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شبلی منکر غالب نہیں تھے۔شبلی نے خطوط نگاری میں غالب سے جس قدر اثر قبول کیا اس کا بھی ذکر ہے۔کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ علامہ شبلی نے بعض خطوط میں غالب کا تتبع کیا ہے۔یہ مفصل مقالہ اب میری

کتاب ''عکس واثر'' مطبوعہ ادبی دائرہ اعظم گڑھ [مطبوعہ: ۲۰۱۳ء] میں شامل ہے۔

راقم کا دوسرا مقالہ ''عالم اسلام میں شبلی شناسی'' ہے۔ جس میں علامہ شبلی نعمانی کی ان تصنیفات کا ذکر ہے جن کے دنیا کی مختلف زبانوں اور مختلف ممالک میں ترجمے ہوئے۔ ان ممالک میں ایران، افغانستان، پاکستان، آذربائیجان، بنگلہ دیش، ترکی، مصر اور استانبول وغیرہ شامل ہیں۔ زبانوں کے لحاظ سے کم از کم دس زبانوں میں یہ ترجمے ہوئے۔ اور جن ممالک میں یہ ترجمے ہوئے وہاں کے اہل علم اور ممتاز اشخاص نے یہ کارنامے انجام دئے۔ قدرے تفصیل سے ان کا ذکر کر کے علامہ شبلی کی عالمی مقبولیت اور ان کی تصنیفات کی ہمہ گیری اور شہرت و مقبولیت کی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ یہ اپنے موضوع پر پہلا مطالعہ تھا۔ ادھر چند برسوں میں عالمی سطح پر مطالعات شبلی کی متعدد کوششیں سامنے آئی ہیں۔ گذشتہ دنوں ''سیرۃ النبی'' کا فارسی ترجمہ ''فروغ جاویداں'' کے نام سے زاہدان ایران سے شائع ہوا۔ اسی طرح ''الغزالی'' اور ''سیرۃ النعمان'' کے پشتو ترجمے کابل و قندھار سے شائع ہوئے۔ یہ پشتو ترجمے بشیر احمد ریان کے قلم سے ہیں۔ پشاور سے ''سیرۃ النعمان'' کا پشتو ترجمہ ''حیات امام اعظم'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ترکی سے بھی بعض نئے تراجم کی اطلاع ہے۔ ترکی میں ''الغزالی'' کا بھی ترجمہ ہوا ہے۔ آکسفورڈ، لندن اور مصر میں قدیم تراجم کے علاوہ بعض کتابوں کے نئے ترجمے ہوئے ہیں۔ ان کی روشنی میں اب اس مقالہ کو ازسرنو لکھنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ عالمی پیانہ پر شبلی شناسی کا نیا منظر نامہ سامنے آجائے۔

مجموعی طور سے شبلی کالج میگزین کا یہ ''شبلی نمبر'' شبلی شناسی میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ البتہ چند امور کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اب تک رسائل کے جس قدر ''شبلی نمبر'' شائع ہوئے ہیں، ان میں چند ایک کو چھوڑ کر ضخامت کے لحاظ سے یہ کم تر ہے۔ گو اس میں چند نئے موضوعات پر بھی مقالے شامل ہیں لیکن شبلیات کے بہت سے ایسے گوشے ہیں جن کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ یہ میگزین شبلی کالج کا ترجمان ہے باوجود اس کے صدر انتظامیہ، پرنسپل اور منیجر کے تاثرات اور پیغامات سے بھی خالی ہے۔

استاذ گرامی ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی صاحب شبلی کالج کے قابل قدر استاذ، بزرگ اہل قلم، مصنف، قادر الکلام شاعر اور مدرسۃ الاصلاح کے ممتاز فرزند ہیں۔ علامہ شبلی علیہ الرحمہ سے عقیدت و شیفتگی ورثے میں ملی ہے۔ انہوں نے شبلی کالج میگزین کا یہ شبلی نمبر شائع کر کے نہ صرف علامہ شبلی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے بلکہ اعظم گڑھ کے تمام مدیران رسائل کی نمائندگی بھی کی ہے۔ گذشتہ صدی میں اعظم گڑھ اور اس کے قصبات و مواضعات سے متعدد رسائل نکلے اور اب بھی نکل رہے ہیں مگر کسی نے اس اہم کام کی طرف توجہ نہیں دی۔ خود شبلی نیشنل کالج میگزین ۶۰ - ۶۵ برس سے نکل رہا ہے مگر اس کے کسی مدیر کی توجہ اس کام کی طرف نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ مجلس دار المصنفین کے ماہوار علمی رسالہ معارف نے بھی اب تک شبلی نمبر شائع نہیں کیا، حالانکہ اس کا ایک شمارہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام اور ایک ضخیم شمارہ مولانا سید سلیمان ندوی نمبر کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ گویا شبلی کالج میگزین کا یہ شبلی نمبر ایک بڑی کمی کی تلافی بھی ہے۔

اسلام اور عصر جدید

خصوصی شمارہ

نذرِ شبلی نعمانی

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۲۵

اسلام اور عصر جدید شبلی نمبر کا سرورق

(۱۲)

اسلام اور عصر جدید، دہلی

[شبلی نمبر]

[مدیر: پروفیسر اختر الواسع، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، جولائی ۲۰۰۸ء]

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا سہ ماہی رسالہ ''اسلام اور عصر جدید'' ۱۹۶۹ء میں سید عابد حسین نے جاری کیا تھا۔ اپنے مشمولات کے لحاظ سے اردو کا یہ ایک منفرد رسالہ ہے۔ اس کے مدیر پروفیسر اختر الواسع نے جولائی ۲۰۰۸ء میں اس کا خصوصی شمارہ '' نذر شبلی'' شائع کیا۔ پروفیسر اختر الواسع صاحب کو علامہ شبلی سے عقیدت ہے۔ یہ شبلی نمبر اسی عقیدت کا ایک اظہار ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''شبلی نعمانی حقیقی معنی میں ایک مجتہد اور عبقری تھے۔ جنہوں نے بہت سی راہیں روشن کیں۔ اور پرانی راہوں میں نئے امکانات پیدا کئے۔ یہ خصوصی پیش کش ان کے بے پناہ ذہنی وعلمی کمالات اور عملی اکتسابات کو ہمارا ایک ادنیٰ خراج عقیدت ہے۔'' (اسلام اور عصر جدید شبلی نمبر ص ۱۴)

اس کا پہلا مقالہ ''علامہ شبلی نعمانی شخصیت، افکار اور کچھ نئی باتیں'' ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے قلم سے ہے۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کا شبلی شناسی میں قابل ذکر اور قابل قدر حصہ ہے۔ ابتک ان کے قلم سے درج ذیل کتابیں نکل چکی ہیں:

۱۔ شبلی ساہتیہ اکادمی دہلی، ۱۹۹۳ء

۲۔ مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار علی گڑھ ۲۰۰۵ء

۳۔شبلی معاصرین کی نظر میں لکھنو ۲۰۰۵ء

۴۔شبلی کی علمی وادبی خدمات علی گڑھ ۲۰۱۲ء

اس مقالہ میں انہوں نے پہلے شبلی کی عظمت و جامعیت کا ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں حکیم احسن اللہ خاں دہلوی کے امتحان الاطباء کے اردو ترجمہ کے سلسلے میں علامہ شبلی کے علمی تعاون کا ذکر مترجم کے حوالہ سے کیا ہے۔ ہندوستان میں امتحان الاطباء کا قلمی نسخہ ناقص تھا، مترجم کی فرمائش پر علامہ شبلی نے جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال سے خط وکتابت کر کے مصر سے وہ صفحات منگوائے جو ہندوستانی نسخہ میں نہیں تھے۔اس طرح انہوں نے حکیم احسن اللہ خاں کے لئے ترجمہ کا راستہ ہموار کیا۔ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے سچ لکھا ہے کہ علامہ شبلی اہل قلم اور مصنفین کے ساتھ علمی تعاون میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔حکیم احسن اللہ خاں کے مذکورہ ترجمے کے دیباچے میں علامہ شبلی سے متعلق جس علمی تعاون کی تصریح ہے وہ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کی ایک دریافت ہے۔

علامہ شبلی کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے تصنیف وتالیف کے نہ صرف نئے نئے منصوبے بنائے بلکہ متعدد اہل قلم کو نئے نئے عنوانات سے آگاہ کیا اور ان پر کتابیں لکھنے کے لئے ان کے حوصلے بڑھائے۔ان میں ان کے تلامذہ کے علاوہ بعض احباب اور معاصرین بھی شامل ہیں۔کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا سید عبدالحی حسنی [۱۸۶۹-۱۹۲۳] کو ان کی مشہور کتاب نزہۃ الخواطر لکھنے کا مشورہ علامہ شبلی نے دیا تھا۔ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے ماہنامہ الندوہ اپریل ۱۹۱۵ء کے حوالے سے اس کی نشاندہی کی ہے۔البتہ یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو کتاب علامہ شبلی کے مشورے سے لکھی گئی اس میں خود ان کا تذکرہ ان کی شخصیت پر ایک بدنما داغ ہے۔مولانا سید عبدالحی حسنی نے علامہ شبلی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ

’’ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ اپنے افکار وخیالات کے باب میں خود پسند بھی تھے۔کسی دوسرے کے دلائل کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں انہیں جھکا

نہیں سکتے تھے۔ان کے اندر کسی قدر تلون بھی تھا۔ان کی عادت تھی کہ جب بھی کسی مسئلے میں گفتگو کرتے تو اپنی بات پیرایہ بدل بدل کر کرتے۔ اسی طرح جب شعر پڑھتے تو اس کی تشریح اور ترجمہ بھی کرتے جاتے، گویا ان کا مخاطب عجمی ہے اور وہ عرب ہیں یا یہ کہ مخاطب جاہل ہے، اسے عربی آتی ہے نہ فارسی، اور وہ خود مختلف زبانوں اور دقیق مفاہیم سے واقف ہیں، اس لئے چاہتے ہیں کہ مخاطب کو بھی سمجھا دیں۔موصوف کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ کسی معاملے میں کسی شخص سے کوئی خیال اخذ کر لیتے پھر لوگوں کے درمیان اسے اپنی طرف منسوب کر کے پیش کر دیتے، بلکہ کبھی کبھی شخص مذکور ہی کے سامنے دلائل، زور بیان اور تمہید مقدمات کے ساتھ اس طرح پیش کرتے گویا وہ شخص اس باب میں ان کا مخالف ہے۔اصول عقائد کے سلسلے میں وہ معتزلی تھے۔اشاعرہ پر شدید نکیر کرتے تھے، اس موضوع پر ان کی کتابیں بھی ہیں اور رسائل بھی، مثلاً علم کلام اور تاریخ الکلام اور رسائل شبلی میں مضامین۔'' (نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۷۶-۱۷۷ اردو ترجمہ، شبلی معاصرین کی نظر میں ص ۱۰۴)

مولانا سید عبدالحی حسنی بلاشبہ بڑے عالم ومصنف تھے۔ندوہ کی ترقی میں ان کا بھی نمایاں حصہ ہے۔وہ علامہ شبلی کے معاصر تھے اور ندوہ میں علامہ شبلی کے مخالف گروپ کے ایک رکن بھی۔ انہوں نے علامہ شبلی کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اسے معاصرت اور مخاصمت کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا، اس لئے کہ اس بوالعجبی کی تصدیق شاید ہی کسی اور معاصر کی تحریر سے ہو سکے۔

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے امیر مینائی [۱۸۲۹-۱۹۰۰ء] کے مجموعہ مکاتیب مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقب پر شبلی کا ایک تبصرہ نقل کیا ہے۔اور اسے بھی نئی دریافت کے طور پر پیش کیا ہے، حالانکہ ان سے بہت پہلے اس کی نشاندہی ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اپنے مضمون ''نوادر

شبلی'' [مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین لاہور، ج ٦ شمارہ ا مسلسل نمبر۲۲۴] میں کی تھی۔ بہرحال یہ ایک اہم مضمون ہے۔

مولانا غطریف شہباز ندوی نے ''برصغیر میں اسلامی فکر کے ارتقاء میں مولانا شبلی کا حصہ'' کے عنوان سے مقالہ لکھا ہے۔ جس میں تفصیل سے علامہ شبلی کی مذہبی خدمات، تصنیفات بالخصوص الفاروق اور سیرۃ النبی، اسی طرح ندوہ اور ماہنامہ الندوہ اور اسلامی علوم وفنون پر ان کی تحریروں کا مطالعہ پیش کر کے یہ لکھا ہے کہ:

> ''واقعہ یہ ہے کہ برصغیر میں اسلامی فکر کے ارتقاء میں مولانا شبلی کا حصہ سب سے زیادہ اور سب سے نمایاں ہے۔ ان کے اپنے علمی وفکری، تصنیفی وعملی کارنامے تو اپنی جگہ چندے آفتاب چندے ماہتاب ہیں ہی ان کے بالغ نظر تلامذہ نے جو کارنامے انجام دئے ان کا غلغلہ بھی پورے برصغیر میں پڑ گیا ان کے ایک تلمیذ رشید مولانا حمیدالدین فراہی قرآنیات کے باب میں خود ایک مستقل مکتب فکر کے بانی ہیں۔ دوسرے شاگرد مولانا ابوالکلام آزاد کی شعلہ نوائی، فکری رہنمائی اور زریں علمی کارناموں سے ایک جہان نو پیدا ہوا۔ ان کے تیسرے تلمیذ سیدۃ الطائفہ سید سلیمان ندوی کے علمی اکتسابات پر پورا عالم اسلام فخر کر سکتا ہے گویا اگر شبلی کچھ اور نہ کرتے تب بھی صرف یہی تین تلامذہ ان کو زندہ وتابندہ رکھنے کے لئے کافی ہوتے۔'' (اسلام اور عصر جدید شبلی نمبر ص ۳۸)

پروفیسر کبیر احمد جائسی کا موضوع ''شبلی کا فکری اجتہاد'' ہے۔ اس میں علامہ شبلی کی علمی زندگی کے انقلابات کو ان کے فکری اجتہادات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی کا مقالہ ''علامہ شبلی اور خدمت دفاع اسلام'' خاصا اہم مقالہ ہے۔ علامہ شبلی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے اور جو ان کی اولیات میں بھی شامل ہے۔ مولانا شبلی ان ابتدائی لوگوں میں تھے جنہیں مستشرقین کی تدلیسات اور ان کی فریب کاریوں کا ادراک ہوا۔ ان کی بہت سی

دسیسہ کاریوں کو طشت از بام کر کے انہی کے اسلوب میں مسکت اور مدلل جواب دیا۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے اس کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں اور لکھا ہے کہ

''انہوں نے اپنی زندہ جاوید تحریروں اور موثر اسلوب کے ذریعہ دفاع اسلام کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اور انہیں بجا طور پر عہد نو کا متکلم اسلام کہا جاسکتا ہے۔'' (اسلام اور عصر جدید شبلی نمبر ص ۶۲)

راقم کا مقالہ ''عالم اسلام میں شبلی شناسی۔ ایک اجمالی جائزہ'' اضافہ کے ساتھ اس میں شامل ہے، جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ ''شبلی اور تعلیم'' میں محمد ارشد نے شبلی کے تعلیمی افکار و نظریات اور ان کی تعلیمی خدمات کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہ شبلی کے تعلیمی مشن پر ایک اچھا مضمون ہے۔

مصری اسکالر جناب جلال سعید حفناوی نے سوانح فاروقی کے دو مصنفین شبلی اور محمد حسین ہیکل کی تصنیفات کا موازنہ و تقابل کیا ہے۔ جس کا ترجمہ صہیب عالم کے قلم سے زیر نظر شبلی نمبر میں شامل ہے۔

جلال سعید حفناوی نے مصر میں رہ کر شبلی اور ان کی تصنیفات اور ان کی گراں قدر خدمات پر عربی میں مقالہ لکھا جس پر انہیں ڈاکٹریٹ کی سند تفویض ہوئی۔ انہوں نے شبلی و ہیکل کی سیرت فاروق اعظمؓ کا بڑی گہرائی اور باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ دونوں کے ایک ایک مباحث کا موازنہ اور ان کے مندرجات کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ اور بیشتر مقامات پر شبلی کی برتری اور عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ

۱۔ تحقیقی منہج کے اعتبار سے شبلی کو تفوق حاصل ہے، کیونکہ انہوں نے الفاروق کے مقدمے میں اپنے طریقہ کار کو واضح کر دیا ہے جبکہ محمد حسین ہیکل نے اپنا منہج واضح نہیں کیا ہے۔ (اسلام اور عصر جدید شبلی نمبر ص ۱۰۷)

۲۔ ''محمد حسین ہیکل نے بحیثیت قصہ نگار واقعات کا بیان قصے کے مانند کیا ہے جبکہ شبلی نے بحیثیت مورخ تاریخی حقائق پر زور دیا ہے۔ یہ بات روم و

فارس کی ہزیمت کے اسباب کا جائزہ لینے کے بعد اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔'' (اسلام اور عصر جدید شبلی نمبر ص ۱۰۸)

۳۔ ''شبلی نے فارس اور عجمی ممالک کے فتح کی مکمل تفصیل لکھی ہے۔ کیوں کہ وہ اس علاقے سے قریب تھے اور فارسی زبان پر قدرت حاصل تھی۔ اور اس زبان میں لکھی ہوئی تاریخی کتب ان کے دسترس میں تھیں اور اس سے مکمل استفادہ کیا ہے۔ جب کہ ہیکل نے فتح مصر کی تفصیل بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔'' (اسلام اور عصر جدید شبلی نمبر ص ۱۰۸)

ان کے علاوہ جلال سعید حفناوی نے دونوں کتابوں کی ترتیب وتدوین اور ان میں فرق اور مباحث کے اول وآخر یا مقدم وموخر کی تفصیل بھی قلم بند کی ہے۔ فاروق اعظمؓ کے سوانح اور نظام خلافت وغیرہ مباحث کا بھی تجزیہ بڑی عمدگی سے کیا ہے۔ بہر حال جلال حفناوی صاحب کی نظر دونوں کتابوں کے مشمولات پر بڑی گہری ہے۔ اور ان کا خیال ہے کہ دونوں مصنفین بڑی حد تک ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ الفاروق تقریباً نصف صدی پہلے لکھی گئی۔

البتہ حفناوی صاحب نے الفاروق کا سنہ اشاعت ۱۸۸۹ء لکھا ہے۔ لیکن صحیح ۱۸۹۹ء ہے۔ مترجم کو اس پر حاشیہ میں صحیح سنہ اشاعت کی نشاندہی کرنی چاہئے تھی۔

ڈاکٹر عمیر منظر نوجوان ادیب وشاعر اور ہونہار اہل قلم ہیں۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں کئی برس اردو ادب کے استاذ رہے اور اب یہی مشغلہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (لکھنو کیمپس) میں ہے۔ انہوں نے شبلی کی اردو شاعری کا عمدہ مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ اس نمبر کا آخری مقالہ ہے۔ اس کے بعد عامرہ خاتون کی مرتب کردہ کتابیات ہے۔

اسلام اور عصر جدید کے اس شبلی نمبر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں علامہ شبلی کے سات مقالات شامل کئے گئے ہیں۔ اس سے قبل شائع ہونے والے کسی شبلی نمبر میں اس کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ ان مقالات کے عناوین یہ ہیں:

۱۔ مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیوں کر رہنا چاہئے۔

۲۔ مسائل فقہیہ پر زمانہ کی ضرورتوں کا اثر

۳۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم

۴۔ اختلاف اور مسامحت

۵۔ تعلیم قدیم وجدید

۶۔ علم کلام پر ایک اجمالی نظر

۷۔ مسلمانو کی پولٹیکل کروٹ

عناوین ہی سے ان مضامین کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ مضامین ایک صدی قبل لکھے گئے مگر ان میں اب بھی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ مضامین آج بھی مسلمانوں کی عائلی اور معاشرتی زندگی میں ان کی رہنمائی کریں گے، اس لئے کہ کم از کم ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں آج بھی مسلمانوں کو اسی طرح کے مسائل کا سامنا ہے۔

اس میں چند مضامین ایسے ہیں جن کی افادیت شاید کبھی کم نہ ہو۔ جیسے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، اس کا ذکر ان تمام مقالات میں ہوتا رہا ہے جن میں علامہ شبلی کے نظریہ تعلیم یا تعلیمی خدمات کا ذکر ہوا ہے۔ یہ وہ مقالہ ہے جس میں پہلی بار مسلمانوں کی علمی عظمت و برتری کا ذکر آیا۔ یہ سرسید کی خواہش پر ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے لکھا گیا تھا اور ان کی موجودگی میں لکھنوکی شاہی بارہ دری میں پیش کیا گیا۔ یہ اصلاً مسلمانوں کے شاندار ماضی کی پہلی داستان تھی جو انگریزوں کے دور استبداد میں مسلمانوں کے کانوں میں گونجی۔

مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیوں کر رہنا چاہئے؟ شبلی کے اس مضمون کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت ملت جن مسائل سے دو چار ہے ان میں اس سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ چند سال قبل فقہ اکیڈمی آف انڈیا نے ایک سمینار منعقد کر کے غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے مسائل پر بحث کی اور اس سلسلہ میں علماء نے شریعت کے احکام واضح کیئے۔ اس کے مقالات کا مجموعہ ”غیر مسلم ممالک میں آباد

مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل‘‘ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

دیگر مقالات بھی کم اہم نہیں۔ خاص طور پر ’’مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ‘‘ جس کا ذکر سیاسیات شبلی کے ضمن میں بارہا آ چکا ہے۔ دراصل شبلی کے سیاسی افکار کو سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ اس میں شبلی کے سیاسی شعور اور نقطہ نظر کے ساتھ مسلمانوں بالخصوص مسلم لیگ کی حیثیت اور اس کی سیاست اور بیسویں صدی کے پہلے عشرے کے ہندوستان کی سیاسی صورت حال بھی سامنے آ جاتی ہے۔

---

(۱۳)______ضمیمہ

ماہنامہ لسان الصدق اور علامہ شبلی

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] کے حیرت انگیز کارناموں میں ماہنامہ لسان الصدق کی ادارت بھی شامل ہے۔ یہ رسالہ انہوں نے پندرہ/سولہ سال کی عمر میں کلکتہ سے جاری کیا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ نومبر ۱۹۰۳ء میں نکلا اور آخری شمارہ جو دستیاب ہے وہ مئی ۱۹۰۵ء کا ہے۔ جس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ رسالے کا آخری شمارہ ہے، اس لئے قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ماہنامہ لسان الصدق کب تک جاری رہا، ممکن ہے اس کے کچھ اور شمارے نکلے ہوں۔

لسان الصدق کے پہلے شمارے میں سرورق پر مولانا آزاد نے اس کے درج ذیل مقاصد لکھے ہیں:

۱۔ سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا۔

۲۔ ترقی اردو یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرہ کو وسیع کرنا۔

۳۔ علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگالہ میں۔

۴۔ تنقید یعنی اردو تصانیف پر منصفانہ ریویو کرنا۔

(ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ نومبر ۱۹۰۳ء ص ا، سرورق، دسنوی ص ۹)

پھر مولانا آزاد نے مذکورہ مقاصد کی تشریح کی ہے۔

آٹھ ماہ بعد [اگست، ستمبر ۱۹۰۴ء میں] مذکورہ مقاصد میں دو اور مقاصد اصلاح خیالات اور مذہبی مضامین کا مولانا ابوالکلام آزاد نے اضافہ کیا اور رسالہ کی ترتیب حسب ذیل قرار دی:

۱۔انیسویں صدی کے کسی مشرقی فاضل کی تصویر اور حالات

۲۔ایک مذہبی مضمون

۳۔علمی، تاریخی، اخلاقی اور سائنٹفک مضامین

۴۔انتقاد

۵۔کسی عمدہ کتاب کا مسلسل ترجمہ یا کوئی مفید علمی تصنیف۔(ایضاً اگست ستمبر۱۹۰۴ء ص ۱۶)

ان اہم مقاصد کے علاوہ ایک اور مقصد جو سر آغاز ہے اور سرورق ہی پر درج ہے۔ خاص طور پر قابل ذکر ہے:

"الصدق ینجک والکذب یھلک لسان الصدق کا دستور العمل ہے۔اس کا فرض ہے کہ یہ قوم کو کذب سے بچائے اور راستی پر لائے۔ جب اس کا فرض منصبی صرف حق گوئی قرار دیا گیا تو اس کی امید قوم کو اس سے نہیں رکھنی چاہئے کہ یہ انہیں ایسے ترانے سنائے گا جو نہایت شیریں معلوم ہوں گے۔ سچی بات ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہے، پھر سچائی کی زبان کیونکر شیریں معلوم ہوگی؟ یہ ہمیشہ تم کو کڑوی کسیلی باتیں سنائے گا جو اگر چہ تمہیں ناگوار معلوم ہوں گی لیکن اس زمانہ کو دور نہ سمجھو جب کہ صدق کا منجی ہونا اور کذب کا مہلک ہونا تم پر ظاہر ہو جائے گا۔"

(ماہنامہ لسان الصدق نومبر۱۹۰۳ء ص ۱)

لسان الصدق کے جو شمارے دستیاب ہیں ان کو اولاً جناب عبدالقوی دسنوی نے یکجا مرتب کر کے مکتبہ جامعہ دہلی سے اکتوبر ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔ یہ مجموعہ کتابت شدہ ہے۔ پھر جناب ابوسلمان شاہجہاں پوری [پ: ۳۰ رجنوری ۱۹۴۰ء] نے اس کے دستیاب شماروں کا عکسی ایڈیشن ۱۹۹۶ء میں مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کراچی سے گراں قدر مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے مذکورہ بالا مقاصد کا بہر حال خیال رکھا اور ان کی تکمیل کی کوشش کی، البتہ عکسی ایڈیشن میں ایک اسٹیچو کے سوا کسی شخص کی تصویر

دکھائی نہیں دیتی، گویا تصویریں شائع نہیں ہو سکیں۔

ماہنامہ لسان الصدق نے علمی و اصلاحی مضامین، تبصروں اور خبروں کی وجہ سے جلد ہی مقبولیت حاصل کر لی۔ اشاعت کے چند ماہ بعد معاصر رسائل اور بعض اہل قلم نے لسان الصدق کی اہمیت اور افادیت کا عمدہ پیرایہ میں اعتراف کیا۔ ان میں مخزن لاہور [ایڈیٹر سر شیخ عبدالقادر] عین الاخبار مراد آباد، دلچسپ کلکتہ، ایڈورڈ گزٹ شاہ جہاں پور، نظام الملک مراد آباد وغیرہ کے اعترافات خود لسان الصدق اپریل ۱۹۰۴ء کے صفحات [۲۱-۲۳] میں درج ہیں۔ محض پندرہ سال کی عمر میں مولانا آزاد کی یہ مدیرانہ صلاحیت اور رسالے کے مقاصد کا پاس ولحاظ ان کی عبقریت کا ایک ثبوت ہے۔

مولانا آزاد لسان الصدق کے اجراء سے پہلے کم عمری ہی میں علامہ شبلی سے واقف ہو چکے تھے اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی قائم ہو چکا تھا۔ اس کا آغاز ۱۹۰۱ء میں ہوا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں انہیں جدید علوم کی کتابوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا تو انہوں نے علامہ شبلی سے رجوع کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اب مصر و شام کی کتابوں کا شوق ہوا۔ مولانا شبلی کو ایک خط لکھا اور ان سے دریافت کیا کہ علوم جدیدہ کے عربی تراجم کون سے ہیں اور کہاں کہاں سے ملیں گے؟ یہ پہلا خط ہے جو میں نے مولانا [شبلی] کو لکھا۔ انہوں نے دو سطروں میں یہ جواب دیا کہ مصر و بیروت سے خط و کتابت کیجئے۔''
>
> (آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی ص ۳۵۷)

مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ شبلی کے یہ خطوط ان کے مجموعہ ہائے خطوط میں شامل نہیں ہیں۔ مولانا آزاد کے ابتدائی زمانہ کے جو خطوط شائع ہوئے ہیں، ان میں بھی وہ خطوط شامل نہیں۔

مکاتیب شبلی میں علامہ شبلی کے ۴۰ خطوط مولانا ابوالکلام آزاد کے نام شامل ہیں۔ اس میں پہلا خط ۲۱ راکتوبر ۱۹۰۵ء کا ہے اور یہ ماہنامہ الندوہ کی ادارت سے متعلق ہے۔ یہ

زمانہ مولانا آزاد کی الندوہ سے وابستگی کا زمانہ ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا آزاد سے علامہ شبلی کی خط وکتابت کا آغاز گویا ۱۹۰۵ء میں ہوا، لیکن یہ درست نہیں۔ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے مولانا ابوالکلام آزاد نے خود ۱۹۰۱ء میں خط وکتابت کا سلسلہ قائم ہونے کا ذکر کیا ہے۔ (آزاد کی کہانی ص ۳۵۷) لیکن اس عرصہ کے خطوط دستیاب نہیں۔ البتہ لسان الصدق ستمبر ۱۹۰۴ء کے شمارے میں شبلی کا ایک خط ۲۲ / مارچ ۱۹۰۳ء کا درج ہے۔ اس کی بنیاد پر آزاد کی شبلی سے معلوم خط وکتابت کا سال الندوہ کی وابستگی سے تین سال پہلے ۱۹۰۳ء قرار پاتا ہے۔

ماہنامہ لسان الصدق کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ شبلی و آزاد کے تعلقات لسان الصدق کی اشاعت کے زمانہ میں بڑے گہرے ہوگئے تھے۔ اس کے صفحات میں مولانا ابوالکلام آزاد نے علامہ شبلی کا جس والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے، وہ علامہ شبلی سے ان کی گہری عقیدت اور دلی شیفتگی کا پتہ دیتا ہے۔ علامہ شبلی نے بھی ماہنامہ لسان الصدق سے پوری دلچسپی لی، اس کی سرپرستی قبول کی، انجمن ترقی اردو کی رپورٹیں، مراسلے اور اطلاعات اشاعت کے لئے بھیجیں، یہاں تک کہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

> ''انجمن ترقی اردو نے اس کی (لسان الصدق) دلچسپی دیکھ کر اسے اپنا آرگن قرار دیدیا تھا اور مولانا (شبلی) مرحوم انجمن کے متعلق جس قدر مفید و دلچسپ باتیں ہوتی تھیں انہیں سب سے پہلے اس میں اندراج کے لئے بھیج دیتے تھے۔ اور تمام ممبران انجمن کے نام ایک اطلاع شائع کردی تھی کہ اس پرچے کو ضرور منگوائیں، اس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد متعلقین انجمن کی اس کی خریدار ہوگئی تھی۔'' (آزاد کی کہانی ص ۳۰۴)
>
> گویا لسان الصدق انجمن ترقی اردو کا پہلا ترجمان تھا۔

ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ کے کل ۱۳ / شمارے دستیاب ہیں۔ اور تقریباً ہر شمارہ میں علامہ شبلی کا ذکر براہ راست یا بالواسطہ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ ذیل میں علی الترتیب ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ا۔نومبر ۱۹۰۳ء(جلدا نمبرا)

یہ لسان الصدق کا پہلا شمارہ ہے۔اس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اولاً ماہنامہ لسان الصدق کے مقاصد بیان کئے ہیں اور مقصد اول یعنی سوشل ریفارم پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اس میں انہوں نے ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''بڑی مسرت کی بات ہے کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء نے اصلاح تمدن اور اصلاح مراسم پر توجہ دینی شروع کردی ہے۔ندوۃ العلماء نے آج تک جو کچھ کیا ہے اس پر ہمیں اس وقت بحث مقصود نہیں ہے لیکن دہلی کے جلسہ سے جو علمی کارروائی کانفرنس نے شروع کی ہے،وہ واقعی قابل توجہ ہے اور اسے دیکھ کر امید بندھتی ہے کہ یہ کوشش ضرور کوئی نتیجہ پیدا کرے گی۔''

(ماہنامہ لسان الصدق،نومبر ۱۹۰۳ء ص ۵-۶،دسنوی ص ۲۳)

یہ اگرچہ علامہ شبلی کا براہ راست تذکرہ نہیں ہے لیکن اس وقت علامہ شبلی ان دونوں تحریکوں سے پورے طور پر وابستہ تھے۔علامہ شبلی فکر وخیال کی ہم آہنگی کی بنا پر تحریک ندوہ کے پہلے اجلاس منعقدہ کان پور میں شریک ہوئے اور پھر اس قدر جوش وجذبہ کے ساتھ اس میں شریک رہے کہ انہیں بجا طور پر تحریک ندوہ کے بانیوں میں شامل کیا جانا چاہئے تھا مگر بوجوہ ایسا نہیں ہوا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

اسی طرح وہ سرسید احمد خاں کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آغاز [۱۸۸۶ء] ہی سے اس میں شامل رہے۔اس کے اجلاسوں میں اہتمام سے شریک ہوتے،تقریریں کرتے، مباحثوں میں حصہ لیتے،تجویزیں اور قراردادیں پیش کرتے۔ان کے بعض فارسی قصائد بھی انہی کانفرنس کے جلسوں کی بدولت کہے گئے۔کانفرنس سے یہ دیرینہ ربط وتعلق انہیں ورثہ میں

ملا تھا۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ اس کے نہ صرف رکن تھے بلکہ ۱۸۹۲ء میں کانفرنس نے انہیں ضلع اعظم گڑھ کا کرسپانڈنگ رکن بھی نامزد کیا تھا۔ (تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، مشاہیر علی گڑھ حصہ ۴ص ۲۷۴) چنانچہ ۱۹۰۳ء میں کانفرنس کے اجلاس دہلی میں جب انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا تو علامہ شبلی اس کے سکریٹری نامزد ہوئے۔ علامہ شبلی نے دو سال سے زاید مدت [۱۹۰۳-۱۹۰۵ء] تک اس کی ترقی کے لئے اس قدر انہماک سے کام کیا کہ اسے ایک منظم تنظیم اور فعال ادارہ بنا دیا۔ ان کے انہماک کا اندازہ محض اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ابتدائی تین ماہ میں انہوں نے ملک کے مختلف اہل علم کو انجمن سے متعلق ۱۱۹ خطوط لکھے۔ پھر اہل قلم کی ایک بڑی جماعت کو انجمن سے وابستہ کیا، اس کے ارکان بنائے۔ ترجمے کا منصوبہ بنایا، انعامات کا سلسلہ قائم کیا، ماہ بہ ماہ اس کی رپورٹ لکھی اور اس کے احوال سے قوم کو واقف کراتے رہے کہ انجمن کے مقاصد کیا ہیں اور اس کی ضروریات کیا ہیں اور انجمن کیا کام کر رہی ہے۔ یہاں ان کے خطوط سے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں جن سے ان کی سرگرمیوں کا کسی قدر اندازہ ہوگا:

۱۔ بنام مولانا حمید الدین فراہی

''اردو سکشن کی کارروائی زور وشور سے شروع کرتا ہوں۔''

(مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۱۳)

''اردو نے اب تک جو کام کیا ہے وہ علی گڑھ گزٹ میں اس ہفتہ چھپے گا، اس میں دیکھنا، تم بتاؤ عربی زبان کی کون سی کتابیں ترجمہ کے لائق ہیں۔''

(مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۱۵)

''میں اردو کے قصہ میں بہت عدیم الفرصت ہوگیا ہوں، جو وقت بچتا ہے بالکل خط وکتابت میں صرف ہوجاتا ہے۔'' (مکاتیب شبلی حصہ ۲ ص ۱۵)

۲۔ بنام مہدی افادی

''اردو ادب کے ساتھ آپ کو جو عشق ہے، اب اس کے اظہار کا موقع

ہے۔ دستور العمل ارسال ہے جو کچھ ہو سکے کیجئے۔''

(مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۱۷۲)

''بدقسمتی سے انجمن نے اب تک صرف ایک کتاب شائع کی یعنی گوتم بدھا اور شری کرشن کی سوانح اور فلسفہ، اچھی کتاب ہے۔''

(مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۷۲)

۳۔ بنام ابوالکمال سید عبدالحکیم دسنوی

''کتب مشتہرہ میں ہربرٹ اسپنسر کی کتاب چھپ گئی اور عنقریب شائع ہوگی، باقی زیر طبع ہیں۔'' (مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۲۹۰)

۴۔ بنام مولوی محمد سمیع

''انجمن ترقی اردو میں اب اس قدر ترمیم ہوئی کہ خریداران مستقل ارکان اعانت قرار دئے گئے ہیں۔ تم اپنے خریداروں کو بھی مطلع کر دو۔ انجمن کی تیار کردہ کتابیں زیر طبع ہیں۔'' (مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۰۷)

۵۔ بنام نواب علی حسن خاں

''انجمن کی طرف سے میں مصحفی اور میر تقی وغیرہ کی مصنفہ تذکرۃ الشعراء چھپوانا چاہتا ہوں، کیا آپ کے کتب خانہ میں ان تذکروں میں سے کوئی ہے؟۔'' (مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۱۴۷)

۶۔ بنام ریاض حسن خاں خیال

''خط پہنچا، مسودہ بوقت فرصت دیکھوں گا، کہیں کہیں تغیر و ترمیم کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ بوعلی سینا کے متعلق حبیب السیر وغیرہ میں جو کچھ ہے اور جس کی تقلید نامہ دانشوراں میں کی ہے، لغو محض ہے۔

طبقات الاطباء اور تاریخ الاطباء شہزوری جو نہایت معتبر کتابیں ہیں اور ابن سینا کا مفصل حال ان میں ہے اور خوارزم کے تعلقات اور مفارقت کا بھی

ذکر ہے، ان میں کہیں اس واقعہ کا پتہ نہیں، یہ شیعوں کی من گھڑت ہے۔''

(مکاتیب شبلی ج۲ص ۱۵۶-۱۵۷)

''مولوی شہباز کی سوانح عمری میں نے دیکھی ہے۔ بہت اچھی ہے لیکن ناتمام ہے اوران کا بیان ہے کہ تکمیل کا سامان نہیں۔ کمسٹری کی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں بلکہ صرف اصل الفاظ چھپوالئے گئے ہیں کہ مترجمین کے پاس الگ الگ جلدیں بھیج دی جائیں۔''

(مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۱۵۶)

۷۔ بنام نواب مزمل اللہ خاں

'' کیااب تک انجمن اردو اس قابل نہیں ہوا کہ آپ اس کی طرف توجہ فرمائیں۔''

(مکتوبات شبلی، ص ۱۰۱)

اس طرح کے علامہ شبلی کے متعدد خطوط ان کے مجموعہ مکاتیب میں موجود ہیں۔ اگران کا تاریخی لحاظ سے مطالعہ کیا جائے تو انجمن کی تاریخ کے بعض نئے اوراق سامنے آجاتے ہیں۔ جن کا مطالعہ ابھی تک نہیں کیا گیا۔

انجمن کے قیام کے ۹/ ماہ بعد مولانا آزاد نے لسان الصدق جاری کیا۔ اس کے صفحات احوال شبلی، تصنیفات شبلی، خیالات شبلی اور شبلی کے حوالے سے انجمن ترقی اردو کے مسلسل ذکر سے عبارت ہیں۔ اس کے پہلے شمارے میں انجمن کے آغاز وقیام کے ذکر کے بعد مولانا آزاد نے شیخ محمد عبدہ اوران کی روشن خیالی کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

''ہمارے مخدوم دوست مولانا شبلی نے بھی زمانہ سیاحت میں ان سے ملاقات کی تھی اوران کی روشن خیالی کا اعتراف کیا تھا۔ شیخ جمال الدین افغانی مرحوم سے بھی ان کی صحبتیں رہی ہیں اور بقول مولانا شبلی کے ان کی روشن دماغی کی اصل وجہ شیخ جمال الدین ہی کی صحبت ہے۔''

(لسان الصدق نومبر ۱۹۰۳ء ص ۱۲۔ دسنوی ص ۲۹)

مولانا آزاد [۱۸۸۸ء] علامہ شبلی [۱۸۵۷ء] سے عمر میں اکتیس سال چھوٹے تھے، اس کے باوجود انہوں نے مذکورہ اقتباس میں شبلی کو مخدوم دوست سے یاد کیا ہے۔ اس سے اس زمانہ میں ان عباقرہ کے درمیان اتفاق مذاق، انسیت اور بے تکلفی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

لسان الصدق جس وقت جاری ہوا علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری کی حیثیت سے طرح طرح کے علمی منصوبے بنا کر انجمن کو ترقی دینے میں کوشاں تھے۔ لسان الصدق کے اسی شمارے میں انجمن ترقی اردو اور اس کے منصوبوں کا مولانا ابوالکلام آزاد نے قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''انجمن ترقی اردو نے اردو زبان کے علمی دائرہ کو وسیع کرنے کی یہ صورت تجویز کی ہے کہ انگریزی، عربی، فارسی کی علمی اور فنی کتابیں شگفتہ اردو میں ترجمہ کر کے شائع کی جائیں، جن کی اشاعت سے قوم میں لغو اور بے نتیجہ ناولوں کے بجائے علمی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو، چنانچہ انگریزی، عربی، فارسی کی جو کتابیں انجمن نے انتخاب کی تھیں، ان کے ترجمہ اور طبع کا انتظام نہایت معقول طریقہ سے ہو رہا ہے اور امید ہے کہ بہت جلد کتابیں طبع ہو کر ملک میں روشنی پھیلائیں گی۔ ان کتابوں کے فروخت کی نہایت آسان اور موزوں صورت یہ تجویز کی گئی ہے کہ جو شخص انجمن کی چھپی ہوئی کتابوں کو لینا چاہے، وہ ایک سال میں پانچ روپیہ جیسی ایک قلیل رقم کی کتابوں کو لینے کا باضابطہ انجمن سے وعدہ کر لے، ایسی حالت میں وہ مجبور نہیں کیا جائے گا کہ ایک مشت پانچ روپیہ کی کتابیں خرید لے، بلکہ چار مرتبہ یا تین مرتبہ متفرق کتابوں کو منگوانے کا وہ مجاز ہے۔ ہماری رائے میں اس سے بہتر طریقہ کتابوں کے لینے کا، جس میں لینے والے کو کسی قسم کے بار کا احساس نہیں ہو، نہیں مل سکتا۔ ایک

سال کے عرصہ میں پانچ روپوں کی کتابوں کا لینا کس قدر غیر محسوس صرف ہے؟ ہماری گذارش بالخصوص اہل بنگالہ سے ہے جن کے کان انجمن کی آوازوں سے ابھی بہت کم آشنا ہوئے ہیں کہ وہ اپنی علمی زبان کی ترقی سے غافل نہ ہوں، اور نہیں تو کم از کم انجمن کی کتابوں کی مستقل خریداری ہی سے اس اہم کام کی مدد کریں۔

باقاعدہ کارروائی ہونے کے خیال سے درخواست خریداری کے چھپے ہوئے فارم ہر شخص انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مولانا شبلی نعمانی ''ناظم صیغۂ علوم وفنون حیدر آباد دکن'' سے یا دفتر ''لسان الصدق'' سے منگوا سکتا ہے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

ایڈیٹر لسان الصدق ورکن انتظامی ''انجمن ترقی اردو

(لسان الصدق نومبر ۱۹۰۳ء ص ۱۳-۱۴، دسنوی ص ۳۰-۳۱)

انجمن ترقی اردو کی تاریخ میں بصراحت یہ ذکر نہیں ملتا ہے کہ اس کے پہلے جلسہ انتخاب میں مولانا آزاد اس کے رکن انتظامی نامزد ہوئے تھے، لیکن مذکورہ تحریر میں خود مولانا آزاد کے قلم سے رکن انتظامی انجمن ترقی اردو لکھا ہوا ہے۔ دراصل انجمن سے ان کی دلچسپی کی بنا پر علامہ شبلی نے انہیں رکن انتظامی نامزد کیا تھا۔ خود مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ

''اس زمانے میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخ انجمن ترقی اردو قائم ہو چکی تھی اور مولانا شبلی مرحوم اس کے ناظم تھے۔ انجمن ہی کے سلسلے میں میں نے ان سے خط وکتابت کی تھی اور انہوں نے خط وکتابت کے بعد مجھے بڑا شائق اور کارکن سمجھ کر انجمن کے ارکان انتظامیہ میں چن لیا تھا۔''

(آزاد کی کہانی آزاد زبانی ص ۳۰۴)

اس شمارہ میں انجمن کی رپورٹ کی اشاعت کے ساتھ ہی مولانا آزاد نے ایک مختصر

سی خبر شائع کی ہے کہ:

''جناب مولانا شبلی نعمانی ناظم صیغۂ علوم وفنون حیدر آباد دکن آج کل تاریخ علم الکلام کا دوسرا حصہ لکھ رہے ہیں، جس میں جدید علم کلام پر بحث کی جائے گی۔'' (لسان الصدق، نومبر ۱۹۰۳ء ص ۱۴، دسنوی ص ۳۱)

۲۔ دسمبر ۱۹۰۳ء (جلد ا نمبر ۲)

۳۔ جنوری ۱۹۰۴ء (جلد ۲ نمبر ۱)

یہ دونوں شمارے ذکر شبلی سے خالی ہیں۔

۴۔ فروری ۱۹۰۴ء (جلد ۲ نمبر ۳)

اس شمارے کا آغاز علامہ شبلی اور ان کی انجمن ترقی اردو کے ذکر سے ہوا ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بمبئی میں انجمن ترقی اردو کی رپورٹ ۱۹۰۳ء جو جناب مولانا شبلی نعمانی سکریٹری انجمن نے پیش کی ہے، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس انجمن نے اپنے سکریٹری کی بدولت ان نو مہینوں میں جو کوشش کی ہے اور جس قدر عملی نتائج اس سے پیدا ہوئے ہیں وہ کانفرنس کی زندگی میں ''پہلی کوشش سے'' تعبیر کیے جا سکتے ہیں۔ اس انجمن کے مقاصد کی تعمیل میں جس قدر رکاوٹیں اور دقتیں پیش آئیں، ان کا سرسری اندازہ اس رپورٹ کے دیکھنے سے ہو سکتا ہے، لیکن باوجود ان مشکلات کے جس قدر کارروائی ہوئی ہے، اس کی ہرگز ہمیں توقع نہ تھی۔ اکثر علمی کتابوں کا ترجمہ ہو گیا ہے اور وہ پریس میں چھپنے کے لیے بھیج دی

گئی ہیں۔ بہت سی کتابوں کا ترجمہ ہورہا ہے اور بہت سی کتابیں زیر تجویز ہیں۔ اکثر مصنفین کو میٹریل بہم پہونچا کر ان کی مدد کی گئی ہے۔ بعض کتابیں اصلاح کر کے چھاپی جارہی ہیں اردو زبان کے قواعد صرف ونحو کا انتظام ہورہا ہے۔ ایک خاص کمیٹی علمی اصطلاحات کا لغت اردو میں تیار کر رہی ہے، جس کا آج تک سرانجام نہ پانا علمی تراجم میں سخت رکاوٹ پیدا کیے ہوئے تھا، اسی طرح اردو تصانیف کی ایک عمدہ فہرست بھی تیار ہورہی ہے جس کا حصہ تاریخ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ مستقل خریداروں کی تعداد بھی ۲۳۰ تک پہنچ گئی ہے۔ جو اگرچہ اک بڑی تعداد نہیں ہے لیکن تاہم غنیمت ضرور ہے۔ الغرض مولانا شبلی بالقابہ کی بے بہا کوشش ضرور قابل تحسین ہے، کاش کہ کانفرنس کی اور شاخیں بھی اسی طرح کوشش کرتیں تو کانفرنس کا وجود ہمارے لیے رحمت الٰہی سمجھا جاتا، لیکن افسوس اسی کا ہے کہ اشخاص کانفرنس کی غفلتوں سے کانفرنس پر لے دے ہوتی ہے اور سرے سے اس کا وجود ہی فضول قرار دیا جاتا ہے۔"

(لسان الصدق، فروری ۱۹۰۴ء ص ۱-۲، دسنوی ص ۶۴-۶۵)

اس کے بعد ایک دو علمی خبریں شامل اشاعت ہیں اور پھر علامہ شبلی کے قلم سے انجمن ترقی اردو کی رپورٹ بابت سال ۱۹۰۳ء شائع کی گئی ہے۔ یہ رپورٹ انہوں نے کانفرنس کے بمبئی کے اجلاس میں پیش کی تھی۔ اس رپورٹ میں پہلے انجمن ترقی اردو کی اہمیت وافادیت اور تراجم کتب کی ضرورت واضح کی گئی ہے، پھر انجمن کی کارگذاری کی تفصیل ہے۔ اس میں دستورالعمل تیار کرنا، ملک کو انجمن کے مقاصد سے روشناس کرانا، انجمن کی رکنیت قبول کرنے کے لئے مختلف اشخاص سے خط وکتابت کرنا، ہندوؤں کی ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا شامل ہے۔ آخر میں ان چند ممتاز لوگوں کے اسمائے گرامی درج ہیں جنہوں نے انجمن کی رکنیت منظور کی۔ چوں کہ اس سے ۱۹۰۳ء میں علامہ شبلی کی مصروفیات اور بعض خیالات کا اندازہ ہوتا ہے اس لئے

اس کا ایک طویل اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

''یہ انجمن ۴؍جنوری ۱۹۰۳ء کو بمقام دہلی ایجوکیشنل کانفرنس کے غیر معمولی اجلاس میں قائم ہوئی اور بزرگان ذیل اس کے عہدہ دار اور کارکن قرار پائے۔

صدر انجمن

ٹی ڈبلیو آرنلڈ اسکویر پروفیسر گورنمنٹ کالج، لاہور

نائب صدر

شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد خان صاحب، ال، ال، ڈی

مولانا الطاف حسین صاحب حالی

شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ صاحب

سکریٹری

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی

اسسٹنٹ سکریٹری

مولوی حامد علی صاحب صدیقی سہارن پوری

۵؍جنوری ۱۹۰۳ء کو کانفرنس ہی کے ایک پرویٹ اجلاس میں انجمن کے لئے ایک مختصر دستور العمل کا مسودہ طیار کیا گیا لیکن چونکہ یہ مسودہ محض سرسری طور پر طیار ہوا تھا اور اجلاس کانفرنس کے ختم ہونے کے ساتھ تمام ارکان دور دراز مقامات پر چلے گئے تھے، مسودہ کی درستی و اصلاح میں خط و کتابت کے ذریعہ سے ایک مدت صرف ہوگئی، یہاں تک کہ ۸؍اپریل ۱۹۰۳ء کو دستور العمل مذکور چھپ کر شائع ہوا اور دراصل انجمن کے قیام کی تاریخ اسی دن سے شمار کرنی چاہئے۔ اس لحاظ سے یہ رپورٹ سالانہ نہیں بلکہ ہشت ماہہ رپورٹ ہے۔

انجمن کا سب سے پہلا کام ملک کو اپنے مقاصد کی طرف متوجہ کرنا اور یہ دریافت کرنا تھا کہ جو مقاصد انجمن کے پیش نظر ہیں ملک اس کے لئے طیار ہے یا نہیں۔ چنانچہ نہایت کثرت سے خطوط چھپوا کر شائع کیے گئے۔ اخبارات وغیرہ سے مدد لی گئی ممتاز بزرگوں کی خدمت میں خاص طرح پر تحریک کی گئی۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ہر طرف سے لبیک کی صدائیں آئیں، ملک کے ہر فرقہ نے بلا تخصیص مقاصد انجمن کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی۔ ابتدا میں ہندو صاحبوں کو بطور خود یہ غلط خیال پیدا ہوا کہ ان کو انجمن کی شرکت سے علاحدہ رکھا گیا ہے، چنانچہ ایک ہندو اخبار نے اس کا اظہار بھی کیا لیکن جب اس کے جواب میں سکریٹری کی ایک تحریر اسی اخبار میں شائع ہوئی تو ہندو صاحبوں کے دل سے یہ شبہہ جاتا رہا۔ اور سب سے پہلے آنریبل رائے بہادر نہال چند صاحب رئیس مظفر نگر نے انجمن کی ممبری قبول کرنے کی اطلاع دی۔

ملک میں جس قدر ممتاز اور نام آور بزرگ ہیں مثلاً آنریبل نواب عماد الملک مولوی سید حسین صاحب بلگرامی ،نواب محسن الملک ، بدرالدین طیب جی صاحب جج ہائی کورٹ بمبئی ،مشیر الدولہ خلیفہ سید محمد حسین صاحب بیرسٹرایٹ لا ، خان بہادر سید اکبر حسین صاحب جج عدالت خفیہ، خان بہادر مولوی عبدالغفور صاحب وزیر ریاست رام پور۔

ان تمام بزرگوں نے خوشی کے ساتھ ممبری قبول کی۔ انگلش جنٹلمینوں نے بھی انجمن کی طرف توجہ ظاہر کی۔ چنانچہ ڈبلیو بیل صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے انجمن کا رکن اعزازی ہونا منظور کیا۔''

شبلی نعمانی

(لسان الصدق فروری ۱۹۰۴ء ص ۷-۸)

واضح رہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] کے مرتب کردہ مقالات وخطبات شبلی کی ۹ر جلدیں جو دارالمصنفین نے شائع کی ہیں، اس میں یہ رپورٹ شامل نہیں ہے۔شاید مولانا سید سلیمان ندوی کولسان الصدق میں شائع اس رپورٹ کی اطلاع نہیں تھی؟۔ حیات شبلی میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔البتہ انہوں نے لکھا ہے کہ علامہ شبلی انجمن کی رپورٹ ہر ماہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں شائع کرتے تھے۔(حیات شبلی ص ۳۲۳) انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی عدم دستیابی کی وجہ سے تصدیق نہیں ہوسکی کہ یہ رپورٹ ہر ماہ شائع ہوتی تھی یا سالانہ؟ اگر ماہ بہ ماہ بھی شائع ہوئی ہوگی تو بھی چارر پانچ ماہ سے زیادہ نہیں، حالانکہ وہ دوسال سے زاید مدت تک انجمن کے سکریٹری رہے۔

جناب مشتاق حسین صاحب جو مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ سے وابستہ تھے اور جنہوں نے شبلی وسرسید کی بعض نایاب تحریریں انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے نقل کرکے شائع کی ہیں انہوں نے اپنی کتاب باقیات شبلی میں درج ذیل رپورٹ شائع کی ہیں:

۱۔رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ اپریل ۱۹۰۳ء (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۳رمئی ۱۹۰۳ء ص ۷-۸)

۲۔رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ مئی ۱۹۰۳ء (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۳رجون و ۲۰رجون ۱۹۰۳ء)

۳۔رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ جون ۱۹۰۳ء (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۵رجولائی ۱۹۰۳ء)

۴۔رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ جولائی ۱۹۰۳ء (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۹اگست ۱۹۰۳ء)

۵۔رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ اگست ستمبر ۱۹۰۳ء (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۶راکتوبر ۱۹۰۳ء)

۶۔اعلان متعلق انجمن ترقی (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۶رجون ۱۹۰۳ء)

(باقیاتِ شبلی، آزاد کتاب گھر دہلی، ۱۹۶۴ء ص ۶۲-۱۱۱)

سرسید احمد خاں کے ایک بڑے شیدائی پروفیسر اصغر عباس صاحب سابق صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی نے ''سرسید کی صحافت'' کے عنوان سے ایک بڑا وقیع مقالہ لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا بڑی گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ اس کے ایک باب میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مضمون نگاروں کا اجمالی تذکرہ اور ان کے مضامین کی فہرست درج کی گئی ہے۔ (سرسید کی صحافت ص ۱۵۸-۱۹۲) مگر علامہ شبلی کے تذکرہ اور ان کے مضامین کی فہرست میں اس طرح کی کسی رپورٹ کا ذکر نہیں ہے۔ گویا علامہ شبلی کے حوالہ سے گزٹ کے مطالعے و جائزے کا کام بھی ابھی باقی ہے۔

لسان الصدق کے اس شمارے میں مذکورہ رپورٹ کے بعد درمیان میں انجمن سے متعلق مولانا شبلی کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے، چونکہ اس مراسلے کا ذکر اب تک کہیں نہیں آیا ہے، حتی کہ جن لوگوں نے انجمن کی تاریخ پر کتابیں لکھی ہیں، ان میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ راقم نے اپنی کتاب ''علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' کے دیباچے میں ان کے کئی مراسلوں کا ذکر کیا ہے، لیکن معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اس میں بھی اس کا ذکر نہیں، اس لئے یہ مراسلہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ مقام بمبئی (صیغۂ شعبہ علمیہ) میں کثرت آراء سے یہ فیصلہ ہوا کہ انجمن ترقی اردو کے کاموں کو اس قدر وسعت ہوگئی ہے کہ اب اس کے لیے جداگانہ ایک سرمایہ کے جمع کرنے کی ضرورت ہے، اس لئے عام چندہ کھولا جائے اور جو چندہ آتا جائے اخباروں کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً مشتہر کیا جائے۔ اس بنا پر عام چندہ کھول دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے جو رقم وصول ہوئی ہے وہ مولوی نظام الدین حسین صاحب ڈپٹی کمشنر برار کی عطیہ ہے۔ چنانچہ رقم مع ان چندوں کے جو علم دوست حضرات نے خود عطا کئے تھے حسب ذیل ہیں:

جناب مولوی نظام الدین حسین صاحب ۱۰۰روپے

جناب شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب ال ال ڈی ۱۰۰روپے

جناب نواب مزمل اللہ خان صاحب ۵۰روپے

جناب خان بہادر منشی الٰہی بخش صاحب رئیس دہلی ۵۰روپے

جناب مولوی عزیز مرزا صاحب بی اے کمشنر ۵۰روپے

واضح ہو کہ جو صاحب سو یا سو سے زاید چندہ عطا فرمائیں گے وہ انجمن کے ممبر اعزازی متصور ہوں گے۔ شبلی

سکریٹری انجمن ترقی اردو

حیدر آباد دکن

(لسان الصدق، فروری ۱۹۰۴ء ص ۱۹-۲۰، دسنوی ص ۸۱-۸۲)

شمارہ کے آخر میں دو تبصرے شامل ہیں۔ پہلا تبصرہ مسٹر ظفر علی خاں کے رسائل افسانہ و دکن ریویو پر ہے اور دوسرا تبصرہ رسالہ خدنگ نظر لکھنؤ پر۔ دکن ریویو کے مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ

''مضامین کی عمدگی کے متعلق صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی اور مولوی عزیز مرزا صاحب بی۔اے۔ جیسے فاضل کی تحریریں اس میں شائع ہوئی ہیں۔''

(لسان الصدق، فروری ۱۹۰۴ء ص ۲۳-۲۴، دسنوی ص ۸۵)

مولانا ظفر علی خاں [۱۸۷۰-۱۹۵۶ء] ایڈیٹر زمیندار علامہ شبلی کے شاگرد اور عقیدت کیش تھے۔ علامہ شبلی روم و مصر و شام کی سیاحت سے واپس آئے تو انہوں نے فارسی قصیدہ سے ان کا استقبال کیا تھا۔ (شبلی سخنوروں کی نظر میں ص ۶۷-۷۰) انہوں نے افسانہ و دکن ریویو اور زمیندار لاہور وغیرہ میں اپنے استاذ علامہ شبلی کی بعض تحریریں شائع کیں اور خود ان کی شخصیت پر مضامین لکھے۔ مذکورہ رسائل کی عدم دستیابی سے ہم اب تک ان کے مطالعے سے

محروم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان تحریروں کا اندراج کتابیات شبلی میں بھی نہیں ہو سکا ہے۔

مولانا آزاد نے لسان الصدق میں متعدد کتابوں پر تبصرے کیے ہیں۔ ان میں بعض تبصرے بڑے اہم ہیں، جیسے مولانا حالی کی ''حیات جاوید'' پر دو قسطوں میں ان کا بڑا وقیع تبصرہ شائع ہوا ہے۔ مولانا آزاد کے ہلالی تبصروں کا مجموعہ پروفیسر محمود الٰہی صاحب نے مرتب کر کے اردو اکادمی لکھنؤ سے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا ہے، ضرورت ہے کہ لسان الصدق کے تبصروں کو بھی یکجا شائع کر دیا جائے کہ یہ ان کی ابتدائی زندگی کے تبصرے ہیں اور پختگی کا یہ حال ہے کہ کسی وسیع المطالعہ عمر رسیدہ شخص کے قلم سے معلوم ہوتے ہیں۔

۵۔ مارچ ۱۹۰۴ء (جلد ۲ نمبر ۳)

اس شمارے میں ادارتی نوٹ کے بعد ملک میں عنقریب شائع ہونے والی کتابوں کا ذکر ہے، اس میں علامہ شبلی کی موازنہ انیس و دبیر کا پہلی بار ذکر کیا گیا ہے۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ

> ''جناب شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی ناظم علوم و فنون حیدر آباد دکن نے میر انیس مرحوم کے کلام پر ایک مفصل ریویو تحریر کیا ہے اور ان کے کلام کا دیگر شعراء سے مقابلہ کر کے ان کی خوبیوں کو دکھلایا ہے۔ عنقریب یہ کتاب چھپنے کے لئے مطبع میں جائے گی۔''

(لسان الصدق مارچ ۱۹۰۴ء ص ۶، دسنوی ص ۹۰)

مولانا آزاد نے جس موازنہ انیس و دبیر کا ذکر کیا ہے، وہ شائع نہ ہو سکی اور نہ اس کا مسودہ حیدر آباد سے واپس ملا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اسے دوبارہ لکھا اور ۱۹۰۷ء میں لکھنو سے شائع کیا۔ اس کے بعد لسان الصدق میں ''زیر ترجمہ'' کی سرخی کے تحت پانچ کتابوں کا ذکر ہے۔ اس میں ہیرو ورشپ: اسٹوری آف پلانٹ، نامہ دانشوراں، معارف ابن قتیبہ اور لکچرز بائی میکس مولر کے اردو تراجم اور مترجمین کا ذکر ہے۔ چونکہ ان سے علامہ شبلی کی انجمن ترقی

اردو کے سلسلہ کی ابتدائی سرگرمیوں، کوششوں اور کاوشوں کا اندازہ ہوتا ہے، اس لئے مولانا آزاد کی لکھی ہوئی ان علمی خبروں کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

۱۔ ہیرو ورشپ

''انجمن ترقی اردو کی تحریک سے جناب مولوی عبدالغفور شہباز کارلائل کی مشہور کتاب ہیرو ورشپ کا ترجمہ کر رہے ہیں۔''

(لسان الصدق مارچ ۱۹۰۴ء ص ۶، دسنوی ص ۹۱)

۲۔ اسٹوری آف پلانٹ

''انجمن ترقی اردو کی تحریک سے اسٹوری آف پلانٹ (علم النبات) کا ترجمہ بھی مولوی محمد اکبر صاحب بی اے کر رہے ہیں۔''

(لسان الصدق مارچ ۱۹۰۴ء ص ۶، دسنوی ص ۹۱)

۳۔ نامہ دانشوراں

''نامہ دانشوراں زمانہ حال کی ایک مستند کتاب ہے، جسے شاہ ناصر الدین مرحوم کے امر سے علمائے ایران نے تصنیف کرنا شروع کیا تھا، ابھی تک صرف اس کی دو جلدیں شائع ہو سکی ہیں، انجمن ترقی اردو نے اس کے ترجمہ کے لئے اعلان کیا تھا، چنانچہ مولوی ریاض حسن خاں صاحب اس کا ترجمہ کر رہے ہیں، جسے اراکین انجمن نے نہایت پسند کیا ہے۔''

(لسان الصدق مارچ ۱۹۰۴ء ص ۶، دسنوی ص ۹۱)

۴۔ المعارف

''علامہ ابن قتیبہ کی معارف عربی کی نہایت عمدہ کتاب ہے۔ جس کا اردو میں ترجمہ ہونا نہایت ضروری تھا۔ رسالہ البیان لکھنو کے فاضل اور ادیب ایڈیٹر جناب مولوی عبداللہ عمادی اس کے ترجمہ میں مشغول ہیں۔''

(لسان الصدق مارچ ۱۹۰۴ء ص ۶، دسنوی ص ۹۱)

۵۔ہیبرٹ لکچرز بائی میکس مولر

''پروفیسر میکس مولر السنہ مشرقی کا ایک مشہور فرانسیسی فاضل گذرا ہے۔ ہندوؤں کی مقدس کتاب وید سے سب سے پہلے اسی نے یورپ کو شناسا کیا۔اسی کے متعلق ایک کتاب ہیبرٹ لکچرز بائی میکس مولر ہے۔انجمن ترقی اردو نے اس کا ترجمہ بھی اردو میں ہونا ضروری قرار دیا تھا، چنانچہ مولوی عبدالقادر صاحب ایم اے پروفیسر علی گڑھ وایڈیٹر حصہ اردو علی گڑھ منتھلی اس کا ترجمہ کررہے ہیں۔''

(لسان الصدق مارچ ۱۹۰۴ء ص ۶،دسنوی ص ۹۱)

آخر میں ''زیرطبع'' کے عنوان سے ہربرٹ اسپنسر کی کتاب کے ترجمہ کا ذکر ہے۔یہ ترجمہ غلام الحسنین صاحب بی.اے. نے کیا ہے۔اور یہ بھی اطلاع دی گئی ہے کہ یہ ترجمہ انجمن ترقی اردو کے زیراہتمام رفاہ عام پریس لاہور میں طبع ہورہا ہے۔(لسان الصدق مارچ ۱۹۰۴ء ص ۶،دسنوی ص ۹۲) چنانچہ یہ ترجمہ فلسفہ تعلیم کے نام سے ایک سال بعد ۱۹۰۴ء میں علامہ شبلی نے شائع کیا۔اس کا دوسرا ایڈیشن بابائے اردو مولوی عبدلحق کے زمانہ نظامت میں شائع ہوا۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا تراجم دراصل علامہ شبلی کے منصوبہ تراجم کا حصہ ہیں، جو انہوں نے ترقی اردو کے لئے تیار کیا تھا،مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں ان کتابوں کی ایک فہرست درج کی ہے جس میں چودہ کتابوں کے نام درج ہیں۔راقم نے اس کی تصدیق کے لئے انجمن کی روداد دیکھی تو ان کی تعداد ۲۳ نکلی۔اس میں محض دو کتابیں علامہ شبلی کے دور نظامت میں شائع ہوئیں،بقیہ کتب وتراجم میں سے چند ایک مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولوی عزیز مرزا اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کے زمانہ نظامت میں شائع ہوئیں۔بقیہ کے احوال سے واقفیت نہیں۔

لسان الصدق کے اس شمارے کے آخری صفحہ پر انجمن ترقی اردو سے متعلق علامہ شبلی کے قلم سے دو اطلاعات چھپی ہیں:

۱۔ انجمن ترقی اردو

''۱۴ رفروری ۱۹۰۴ء کو انجمن کا ایک غیر معمولی اجلاس ہوا۔ سکریٹری نے بیان کیا کہ چونکہ مسٹر آرنلڈ صاحب بوجہ ترک تعلق ہندوستان انجمن ہذا کی پریسیڈینٹی سے علٰحدہ ہونے والے ہیں اس لئے انجمن کی طرف ان کی توجہ اور سرگرمی کے شکریہ میں جو انہوں نے انجمن کی ترقی کے متعلق برابر مبذول رکھی، کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ باتفاق یہ طے ہوا کہ جناب ممدوح کی خدمت میں ایک ایڈریس انجمن کی طرف سے پیش کیا جائے جس کو سکریٹری اور بعض ممبر بمبئی میں جناب ممدوح کی خدمت میں حاضر ہوکر پیش کریں گے۔

اس کے بعد جدید پریسیڈنٹ کے انتخاب کے متعلق بحث ہوئی اور قرار پایا کہ باہر کے ارکان سے بھی رائے طلب کی جائے۔

(لسان الصدق، مارچ ۱۹۰۴ء ص ۲۴، دسنوی ص ۱۰۶)

۲۔ جدید پریسیڈنٹ انجمن ترقی اردو

''خیر خواہان انجمن اس خبر کو خوشی سے سنیں گے کہ جناب مسٹر آرنلڈ کے بجائے جو کہ بوجہ ترک تعلق ہندوستان انجمن کی پریسیڈینٹی سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ مسٹر ڈبلیو بیل صاحب سی آئی ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب نے انجمن کی پریسیڈنٹی منظور فرمائی ہے۔ جناب مسٹر آرنلڈ صاحب کی علاحدگی کا اگرچہ انجمن کو نہایت صدمہ ہے لیکن امید ہے کہ جناب مسٹر بیل صاحب کا اس عہدہ کا قبول کرنا اس صدمہ کو کم کردے گا۔ شبلی نعمانی

(لسان الصدق، مارچ ۱۹۰۴ء ص ۲۴، دسنوی ص ۱۰۶)

۶۔اپریل ۱۹۰۴ء (جلد ۲ نمبر ۴)

اس شمارہ میں علامہ شبلی کا ذکر نہیں ہے۔

۷۔مئی ۱۹۰۴ء (جلد ۲ نمبر ۵)

اس شمارہ میں براہ راست علامہ شبلی کا ذکر نہیں ہے، لیکن اس میں سید محمد سعید بلگرامی کا ایک مضمون ''حقوق نسواں اور اس کے متعلق ایک بڑی غلط فہمی کی اصلاح'' شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے تعلیم نسواں پر بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ تعلیم نسواں نہ ہونے کی وجہ سے معاشرے میں متعدد خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔اس مضمون کے ادارتی نوٹ میں مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ:

> ''منجملہ اور خرابیوں کے جو تعلیم نسواں کے نہ ہونے سے پیدا ہو رہی ہیں ایک بہت بڑی خرابی اصلاح معاشرت کے متعلق ہے۔مولانا شبلی عصر جدید کے قابل ایڈیٹر کو لکھتے ہیں کہ سب سے عمدہ ذریعہ بیجا اصراف کے روکنے کا عورتوں کو تعلیم دینی ہے۔فی الحقیقت مولانا کی رائے بالکل صحیح ہے اور واقعات اس کی شہادت دے رہے ہیں۔''

(لسان الصدق جون ۱۹۰۴ء ص ۳۹-۴۰، دسنوی ص ۱۸۸-۱۸۹)

ماہنامہ عصر جدید لکھنؤ خواجہ غلام الثقلین [۱۸۷۲-۱۹۱۵ء] نے جاری کیا تھا۔وہ جب لکھنؤ سے میرٹھ منتقل ہوئے تو عصر جدید کا دفتر بھی میرٹھ منتقل ہو گیا اور وہاں سے غالباً 1915 ان کی وفات تک نکلتا رہا۔مولانا آزاد کے مذکورہ نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم نسواں کے سلسلے میں علامہ شبلی نے عصر جدید میں اپنی کوئی رائے لکھی تھی، یہ تحریر یا خط کہیں دستیاب نہیں ہے۔واضح رہے کہ خواجہ غلام الثقلین علامہ شبلی کے علی گڑھ میں شاگرد رہ چکے تھے۔یہ خط یا تحریر اگر دستیاب ہو تو تعلیم نسواں کے متعلق علامہ شبلی کے موقف کی مزید وضاحت ہو سکتی ہے۔

۸۔ جون جولائی ۱۹۰۴ء (جلد ۲ نمبر ۶-۷)

اس شمارے میں ''ہم اور ہمارے ہم عصر'' کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد نے دکن ریویو حیدر آباد مئی ۱۹۰۴ء [ایڈیٹر: مولانا ظفر علی خاں] پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ تبصرہ کیا ہے محض علامہ شبلی کے ایک مضمون کا ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مئی [۱۹۰۴ء] کا ''دکن ریویو'' اپنی معمولی ضخامت سے کچھ زائد صفحات پر شایع ہوا ہے، جس میں سب سے زیادہ قابل توجہ ہمارے مخدوم مولانا شبلی کا مضمون ہے، جو احیاے علوم عربیہ کے متعلق ایک حد سے گذاری ہوئی تحریر کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اخبار کے ناظرین میں سے شاید ہی کوئی اس طول طویل بحث سے واقف نہ ہو جو مسٹر ماریسن کی جدید اسکیم کے متعلق علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے نکل کر ہندوستان کے تمام اردو اخباروں میں پھیل گئی تھی اور جس کا خاتمہ حال میں نواب لفٹنٹ گورنر کی ملاقات پر ہوا ہے۔ ایک تحریر اسی بحث کے متعلق علی گڑھ منتھلی میں شایع ہوئی تھی جس میں علوم عربیہ کے متعلق نہایت دریدہ دہنی کے ساتھ ایک زبان دراز نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ''عربی زبان میں علوم وفنون کے کسی عمدہ ذخیرہ کا ہونا بالکل بعید از قیاس ہے۔'' اور نیز یہ کہ ''ہمیں اس رائے سے قطعی اختلاف ہے کہ عربی میں ایسے علوم موجود ہیں۔ جن کی تعلیم ہمارے دماغوں میں روشنی، دلوں میں صفائی، خیالات میں پاکیزگی ارادوں میں بلندی، طبیعتوں میں استقلال پیدا کردے گی۔''

پہلا دعویٰ جس قدر لغو اور بے دلیل ہے وہ صرف اس سے ظاہر ہے کہ آج یورپ کے مستند فلاسفر اور مشہور مصنف عربی زبان کی خوشہ چینی کے قائل ہیں۔ عربی کا فلسفہ، عربی کا اخلاق، عربی کی شاعری، مدتوں یورپ کے

مدرسوں میں مغربی دنیا کا کورس رہی ہے۔ اس دعویٰ کے لئے اگرچہ کسی تفصیل کی ضرورت نہ تھی مگر مولانا نے اس کا مفصل جواب لکھ کر اس بین دعویٰ کو اور مدلل کر دیا ہے۔ رہا ریڈیکل صاحب کا دوسرا دعویٰ کہ ''عربی علوم سے روشن دماغی، خیالات کی بلندی وغیرہ نہیں حاصل ہوسکتی ہے'' تو اس کا غلط ہونا بھی ظاہر ہے۔ آخران لوگوں نے کس زبان کی تعلیم پائی تھی اور کون سے علوم پڑھے تھے جو خیالات بلند دماغ روشن دل صاف طبیعت مستقل رکھتے تھے اور جنہوں نے عرب کی خاک سے پیدا ہو کر آج یورپ کو اپنا مداح بنایا ہے؟ لیکن ریڈیکل صاحب اگر اس دعوے کو ان لفظوں میں بیان کرتے کہ ''مشرقی علوم ہمیں آج پڑھائے جاتے ہیں اور جن کی طرف ہمیں بلایا جاتا ہے۔ ان سے نہ ہمارے دماغ روشن ہوسکتے ہیں، نہ خیالات میں بلندی اور آزادی آسکتی ہے اور نہ طبیعت میں استقلال پیدا ہوسکتا ہے''، تو یہ قول ان کا بالکل ٹھیک اور اصلیت کے موافق ہوتا۔ یہ نہ صرف ریڈیکل صاحب کا قول ہوتا بلکہ مرحوم سرسید بھی ان کے ہم زبان نظر آتے ہیں۔'' (لسان الصدق مئی ۱۹۰۴ء ص ۱۱، دسنوی ص ۱۲۷)

مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کا یہ مقالہ مقالات شبلی جلد سوم [ص ۱۶۴-۱۷۶] میں شائع کیا ہے۔

۹۔ اگست ستمبر ۱۹۰۴ء (جلد نمبر ۸-۹)

اس شمارے کا آغاز اس خبر سے ہوا ہے:

''الندوہ یعنی مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار علمی رسالہ جس کا مقصد علوم اسلامیہ کا احیاء، تطبیق معقول و منقول اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ ہے، جمادی الاول ۱۳۲۲ھ [اگست ۱۹۰۴ء] سے شائع ہوگیا۔ اس کے ایڈیٹر

شمس العلماء مولانا شبلی اور مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی ہیں۔ قیمت سالانہ قسم اول مع محصول [چارروپئے] اور قسم دوم [چھ روپئے] درخواست خریداری منیجر کے نام دفتر ندوۃ العلماء شاہ جہاں پور کے پتہ پر کی جائے۔ مفصل ریویو آئندہ نمبر میں درج ہوگا۔ایڈیٹر

(لسان الصدق اگست ستمبر۱۹۰۴ء ص۱، دسنوی ص۹۱)

اس شمارہ کا پہلا مضمون مولانا آزاد کے قلم سے ''ترقی اردو اور تراجم علوم وفنون'' کا سلسلہ نمبر-۱ ہے۔اس میں انہوں نے علمی قومی ترقی کے لئے مختلف علوم وفنون کے تراجم کی اہمیت وافادیت بیان کی ہے۔واضح رہے کہ مولانا آزاد کے مطابق ایک خاص پس منظر میں سرسید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] تراجم سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔علامہ شبلی نے علی گڑھ کالج سے وابستگی کے ابتدائی زمانہ میں اپنا معرکہ آراء مقالہ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم لکھا تو اس میں تراجم کے سلسلہ میں سرسید کے موقف کی تائید کی تھی۔مولانا آزاد نے علامہ شبلی سے اس سلسلہ میں استفسار کیا اور ان کا خیال معلوم کیا،اس کے جواب میں علامہ شبلی نے لکھا کہ

''مکرمی!

آپ کا دلچسپ والا نامہ پہنچا..........

ترجمہ کا میں مخالف نہیں ہوں۔''گذشتہ تعلیم'' میں سرسید نے مجھ سے وہ عبارت بہ جبر لکھوادی تھی۔ میں نے سخت انکار کیا تھا لیکن ان کا اصرار غالب آیا۔ میں تو ترجمہ کو اصلی علمی خدمت سمجھتا ہوں، بلکہ انشاءاللہ اس کا ایک باضابطہ سررشتہ قائم کروں گا۔ شبلی

۲۲رمارچ ۱۹۰۳ء

(لسان الصدق اگست ستمبر۱۹۰۴ء ص۹، دسنوی ص۲۰۰-۲۰۱)

علامہ شبلی کی یہ رائے اور ان کا یہ خط لسان الصدق کے علاوہ اب تک کہیں اور شائع نہیں ہوئے۔مولانا آزاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''مولانا کے اس اختلاف کی حقیقت یہ ہے جو انہوں نے اس خط میں ظاہر فرمائی ہے۔ سرسید کو ہائی ایجوکیشن کی حمایت میں جو جوش پیدا ہوا تھا وہ تراجم کے سلسلے کا سخت مخالف تھا۔ انہیں خوف تھا کہ کہیں تعلیمی ضرورتوں سے بالکل چشم پوشی نہ کر لی جائے اور صرف تراجم کے سلسلے کو قایم کرنا قوم کی علمی ترقی کے لیے کافی نہ سمجھ لیا جائے۔ یہی خیال ان کو بار بار آمادہ کرتا تھا کہ وہ اس امر کو زور کے ساتھ ظاہر کریں اور قوم کی تمام طاقت پہلے تعلیم کی طرف متوجہ کرالیں۔ اسی خیال کا اثر تھا کہ ''گذشتہ تعلیم'' میں مولانا کے قلم سے بھی مخالفت ظاہر کرائی گئی، ورنہ درحقیقت مولانا کی رائے وہی ہے جو انہوں نے اس خط میں ظاہر کی ہے۔''

(لسان الصدق اگست ستمبر ۱۹۰۴ء ص ۹--۱۰، دسنوی ص ۲۰۱)

تراجم کے سلسلے میں اس وقت سرسید احمد خاں کا موقف جو بھی رہا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے علامہ شبلی کی علی گڑھ کی وابستگی سے بہت پہلے سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی تھی، جس کا بنیادی مقصد مغربی علوم و تصنیفات کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا۔ چنانچہ سوسائٹی نے چالیس کتابوں کے ترجمے شائع کیے۔ (اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ ص ۱۱۳)

لسان الصدق کے اسی شمارے میں عنقریب شائع ہونے والی کتابوں کا ذکر مولانا آزاد کے قلم سے ہے۔ اس میں علامہ شبلی کی دو کتابوں الکلام اور سوانح مولانا روم کا نام شامل ہے۔ الکلام کا ایک سطری ذکر ہے۔ البتہ سوانح مولانا روم کا کسی قدر تفصیلی۔ مولانا آزاد نے اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

''مولانا روم کی مثنوی فارسی لٹریچر کی جان سمجھی جاتی ہے اور صوفیا تو اپنے مقدس لہجہ میں اس کو ''قرآن پہلوی'' کے خطاب سے یاد کرتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ مثنوی کی یہ مقبولیت یا تو شاعرانہ حیثیت سے ہے یا اس لئے کہ اس کو تصوف و معارف کا مجموعہ تسلیم کر لیا گیا ہے، حالانکہ مولانا

شاعر تھے اور نہ انہوں نے مفروضہ تصوف کے وہ خیالات اس میں بھرے ہیں جن سے اس کی وقعت کی جاتی ہے۔ بلکہ درحقیقت ایک اعلیٰ درجہ کی فلسفیانہ تصنیف ہے، جس کو زمانہ کے عام رجحان کا اندازہ کرکے صوفیانہ پیرایہ میں اور شاعرانہ صورت میں فاضل مولوی نے پیش کیا ہے۔ اسی راز کی طرف وہ اشارہ ہے جس پر بہت کم لوگوں نے غور کیا ہوگا، ''گفتہ آید در حدیث دیگران''

حواشی و شروح جتنے لکھے گئے ہیں ان میں اکثر تشریحات من چہ سرائم و طنبورۂ من چہ سرآید کے مصداق ہیں، اس لئے ایک ایسے ریویو کی سخت ضرورت تھی جو اگر مفصلاً نہیں تو مجملاً ہی مثنوی کی اس اصلی تہہ پر لوگوں کو متوجہ کرے۔ مولانا شبلی نعمانی نے اسی خیال سے مولانا کی سوانح عمری ترتیب دی ہے اور مثنوی کے فلسفیانہ پہلو کو نظائر و امثال کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ یہ کتاب نہایت سرعت سے چھپ رہی اور غالباً الکلام کے بعد شائع ہوگی۔ ان دونوں کتابوں کے لئے خود مصنف سے ''صیغۂ علوم و فنون حیدرآباد دکن'' کے پتے سے درخواست کیجئے۔''

(لسان الصدق اگست ستمبر ۱۹۰۴ء ص ۲۸، دسنوی ص ۲۱۹)

اس کے بعد کے لسان الصدق [اکتوبر تا سمبر ۱۹۰۴ء اور جنوری تا مارچ ۱۹۰۵ء] کے شمارے دستیاب نہیں، غالباً شائع نہیں ہوئے۔

۱۰۔ اپریل، مئی ۱۹۰۵ء (جلد ۳ نمبر ۱-۲)

یہ لسان الصدق کی دوسری جلد کا پہلا شمارہ ہے۔ اس میں مولانا آزاد نے اس کے اسباب و مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کی مقبولیت اور معاصر رسائل اور اہل قلم کے تاثرات بھی نقل کئے ہیں۔ اسی سلسلہ کلام میں انہوں نے ان بزرگوں کا ذکر کیا ہے جنہوں

نے لسان الصدق کی قلمی سرپرستی منظور کی ہے۔ اس میں علامہ شبلی نعمانی کا نام سرفہرست ہے۔

(لسان الصدق اپریل مئی ۱۹۰۵ء ص ۱۴، دسنوی ص ۲۳۸)

اس زمانہ میں علامہ شبلی دو بڑے حادثوں سے دوچار ہوئے۔ ایک کم سن بیٹے اور ایک صاحب اولاد بیٹی نے اچانک انتقال کیا۔ مولانا آزاد نے گہرے تعلق اور لسان الصدق کے سرپرست کے ساتھ ہوئے ان حادثوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے بہ لحاظ اس خاص شغف وعنایت کے جو ایک عرصہ سے ہمارے حال پر فرمارہے ہیں اور (بہ لحاظ اس خصوصیت کے جو ہم کو مولانا کے تمام خادموں میں حاصل ہے) وعدہ فرمایا تھا کہ جنوری کے نمبر کے لئے کوئی مضمون ضرور عنایت فرمائیں گے لیکن افسوس ہے کہ لسان الصدق کے سادے صفحات ادھر تو اس مضمون کا انتظار کررہے تھے اور ادھر مولانا مختلف پریشانیوں میں مبتلا ہو کر ایفائے وعدے پر مجبور ہورہے تھے۔ مضمون پہنچا اور یہ پہنچا کہ ایک غیرسن بچہ اور ایک صاحب اولاد صاحبزادی کے انتقال نے مولانا کے دل ودماغ کو سخت صدمہ پہنچایا ہے۔ یہ ایک ایسا افسوس ناک واقعہ تھا جس پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ مختلف بیماریوں نے پیشتر ہی مولانا کے دل ودماغ کو کچھ کم صدمہ نہ پہنچایا تھا جس پر اس جانگزا واقعہ نے اور اضافہ کردیا۔ خدا کرے کہ اس صدمہ کا ہوش یا اثر ان کے دل ودماغ سے بہت جلد دور ہوجائے تاکہ وہ پھر اپنی اس ڈیوٹی کے ادا کرنے پر آمادہ ہوجائیں جو کلک قدرت نے ان کے لئے مخصوص کردی ہے۔ ممکن تھا کہ اگر ہمارا اصرار بڑھتا تو وہ ہمارے ناکام امید کے کامیاب کرنے کی کوشش کرتے، لیکن درحقیقت وہ خادم سخت نالائق ہے جو اپنے قابل احترام مخدوم کو ایسی پریشانیوں میں تکلیف دینے کی جرأت کرے۔ اس لئے ہم مولانا کی آیندہ عنایتوں کے امیدوار

ہو کر اس بے جا جرأت سے باز رہے۔''

(لسان الصدق اپریل مئی ۱۹۰۵ء ص ۱۸-۱۹، دسنوی ص ۲۴۲)

علامہ شبلی کے اکلوتے بیٹے حامد حسن نعمانی [ڈپٹی کلکٹر] کی پیدائش کے ۲۴ رسال بعد ان کے یہاں دوسرا بیٹا پیدا ہوا تھا، علامہ شبلی کو اس سے کس قدر لگاؤ تھا اس کا اندازہ ان کے ایک خط کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

''اس پیرانہ سالی میں خدا نے مجھ کو پھر باپ بنایا، کتاب سے گھبراتا ہوں تو اس سے جی بہلاتا ہوں۔'' (مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۱۷۳)

اس کے انتقال سے وہ بے حد افسردہ وملول ہوئے۔اسی ماہ میں ان کی چھوٹی بیٹی رابعہ نے جو بندول ہی میں بیاہی تھیں اور صاحب اولاد تھیں یکا یک انتقال کیا۔ان حادثات کا ذکر غالباً مولانا آزاد کے علاوہ کسی اور مدیر نے نہیں کیا۔مولانا آزاد کے مذکورہ بالا اقتباس میں صرف ان حادثات کی اطلاع ہی نہیں ہے بلکہ علامہ شبلی سے ان کے جذباتی تعلق کا اظہار بھی ہے۔حالانکہ اب تک دونوں کے درمیان خط وکتابت ہی کے ذریعہ رابطہ تھا، ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔واضح رہے کہ مولانا آزاد کی شبلی سے ۱۹۰۵ء میں بمبئی میں ملاقات ہوئی۔اس وقت لسان الصدق کی اشاعت بند ہو چکی تھی۔اس کے کئی ماہ بعد علامہ شبلی نے انہیں ماہنامہ الندوہ کی ادارت کے لئے راضی کیا اور جب وہ لکھنؤ آئے تو علامہ شبلی کی دوسری بیوی [جو موضع خاص ڈیہہ، ضلع اعظم گڑھ کے نعیم الرحمٰن صاحب کی بیٹی اور مولوی محمد سمیع صاحب کی ماموں زاد بہن تھیں] اعظم گڑھ میں سخت علیل تھیں۔مولانا آزاد ان کی عیادت کے لئے اعظم گڑھ آئے، مگر وہ جس وقت اعظم گڑھ پہونچے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔یہ پہلا موقع تھا جب مولانا آزاد اعظم گڑھ تشریف لائے۔چندروز قیام کے بعد دونوں ساتھ ہی لکھنؤ واپس گئے۔اس زمانہ میں ماہنامہ الندوہ بڑے آب وتاب سے نکل رہا تھا، لیکن علامہ شبلی کی اہلیہ کے انتقال کی خبر اس میں شائع نہیں ہوئی اور نہ ان سے متعلق کسی قسم کی معلومات دستیاب ہیں۔حتیٰ کہ حیات شبلی میں بھی ان کے متعلق کچھ درج نہیں ہے۔

اس سے پہلے اپریل ۱۹۰۴ء کے شمارے میں علامہ شبلی کی کتاب الکلام کا ایک سطری ذکر تھا، اس شمارے میں مولانا آزاد نے اس کا مختصر تعارف لکھا ہے:

"شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی جدید تصنیف الکلام جس کا پبلک نہایت بے چینی سے انتظار کر رہی تھی، نامی پریس کان پور سے اس خوبی اور خوش نمائی کے ساتھ چھپ کر نکلی جس کی نظیر اردو کی کوئی کتاب پیش نہیں کر سکتی۔ کہا جا سکتا ہے کہ بلحاظ اہمیت مضمون کتاب کی معنوی حالت جس قدر باعظمت ہے اسی قدر کتاب کی ظاہری صورت بھی دلفریبی اور دلآویزی میں بے مثل اور بے نظیر ہے۔ مجلد کی قیمت [تین روپیہ آٹھ آنہ] اور غیر مجلد [دو روپیہ آٹھ آنہ] قرار دی گئی ہے۔ دفتر معتمد تعمیرات عامہ حیدر آباد دکن سے درخواست پر مل سکتی ہے۔"

(لسان الصدق اپریل مئی ۱۹۰۵ء ص ۲۹، دسنوی۔ ۲۵۱)

مولانا آزاد نے انجمن ترقی اردو پر لکھنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ دراصل علامہ شبلی اور انجمن سے تعلق کی بنیاد پر قائم تھا۔ اس شمارہ میں ان کے مضمون "ترقی اردو" کی دوسری قسط بھی شائع ہوئی ہے۔ اسی شمارہ پر لسان الصدق کا خاتمہ ہو گیا۔

لسان الصدق کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی علامہ شبلی سے گہری وابستگی، والہانہ شیفتگی اور دلی عقیدت کا زمانہ لسان الصدق کی اشاعت کا زمانہ ہے۔ ماہنامہ الندوہ لکھنو سے وابستگی اور لکھنؤ کا قیام بعد کا قصہ اور قدیم تعلقات کا نتیجہ ہے۔

لسان الصدق کے صفحات میں علامہ شبلی کی علمی سرگرمیوں اور اس زمانہ کی تصنیفات کا بھرپور ذکر ملتا ہے۔ ان کے علاوہ انجمن ترقی اردو کی [جس میں علامہ شبلی نے سکریٹری کی حیثیت سے اپنا فریضہ انجام دیا] مدون تاریخ کے بعض نئے اوراق سامنے آتے ہیں۔ مثلاً علامہ شبلی نے محض تصنیفات وتراجم ہی کا منصوبہ نہیں بنایا تھا بلکہ اس کے ذریعہ سے علماء وفضلا اور مترجمین کی ایک جماعت کو انجمن سے وابستہ کر لیا تھا۔ تراجم کی جانچ پڑتال کے لئے بھی

ایک حلقہ قائم کیا تھا جس میں علامہ اقبال وغیرہ شامل تھے۔اس کے علاوہ انہوں نے صرف ونحو اور وضع اصطلاحات کے لئے بھی کوشش کی، جس کی اہمیت کے پیش نظر مولانا آزاد نے لسان الصدق میں اس کا ذکر کیا اور علامہ شبلی کی کوششوں کو استحسان کی نظر سے دیکھا ہے۔

علامہ شبلی کے انجمن سے ۱۹۰۵ء میں مستعفی ہو جانے اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولوی عزیز مرزا کی نظامت [علی الترتیب ۱۹۰۵-۱۹۰۹ء اور ۱۹۰۹-۱۹۱۲ء] کے بعد انجمن کی باگ ڈور بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ہاتھوں میں آئی اور انہوں نے انجمن کی ترقی کے لئے بے انتہا کوشش کی۔ نہ صرف کتابوں کی تصنیف واشاعت کا سلسلہ قائم رکھا بلکہ انہوں نے کئی رسائل جاری کئے، انجمن کا پریس قائم کیا، اردو کے حقوق کی بازیابی کے لئے جدو جہد کی، اردو کے اسکول وکالج قائم کئے، اردو یونیورسٹی کا منصوبہ بنایا لیکن انجمن ترقی اردو کی علمی و تصنیفی بنیاد وہی رہی جو شبلی نے رکھی تھی۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے ہولناک فسادات نے انجمن کو برباد کر دیا۔اس وقت تک انجمن نے جو کتابیں اور تراجم شائع کئے یا جن بنیادی منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچایا گیا وہ بیشتر علامہ شبلی نعمانی کے منصوبے کا حصہ اور ان کے تخیلات کا نتیجہ ہیں۔مثلاً علامہ شبلی نے وضع اصطلاحات اور اس کی تدوین کو ضروری قرار دیا تھا۔ چنانچہ انجمن کی فہرست مطبوعات میں اس سے متعلق متعدد کتابیں شامل ہیں۔اسی طرح انہوں نے اردو صرف ونحو کی ترتیب پر توجہ دی تھی۔انجمن نے پہلے مولانا حمیدالدین فراہی کی مشہور کتاب اسباق النحو شائع کی، پھر بابائے اردو کی کتاب قواعد اردو شائع ہوئی۔انجمن ترقی اردو نے بنیادی طور پر ادب، سائنس، قواعد اور وضع اصطلاحات پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ یہ تمام امور علامہ شبلی کے پیش نظر تھے۔(ملاحظہ رپورٹ انجمن ترقی اردو از علامہ شبلی نعمانی، مشمولہ باقیات شبلی ص ۶۲-۱۱۰) یہ الگ بات ہے کہ بابائے اردو نے اس کا اعتراف نہیں کیا ہے۔

اردو کی ترقی کے لئے علامہ شبلی نعمانی نے تصنیف وتالیف اور تراجم کا جو منصوبہ بنایا تھا اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی انہوں نے بے انتہا کوششیں کیں۔ان کے عہد میں مالی

دشواریوں کے سبب محض دو کتابیں ہی شائع ہوسکیں، البتہ کئی کتابیں اور ترجمے مکمل ہو کر دفتر میں آ چکے تھے، مگر ان میں چند ہی کتابیں انجمن نے شائع کیں اور بعض دوسرے اداروں سے شائع ہوئیں جیسے تاریخ التاریخ از مولانا محمد مرتضیٰ [مطبوعہ روز بازار اسٹیم پریس امرتسر، ۱۹۱۱ء] وغیرہ۔ فہارس کا کام بھی علامہ شبلی کے پیش نظر تھا۔اس سلسلہ کی پہلی کاوش مولوی سجاد مرزا بیگ دہلوی نے ''الفہرست'' کے نام سے انہیں کے ایما پر تیار کی تھی۔

(وضاحتی کتابیات ص ۲۵، ترقی اردو بیورو دہلی)

ان امور میں بعض کا ذکر لسان الصدق کے صفحات میں ضمناً آیا ہے اور بعض کا نہیں، ضرورت ہے کہ لسان الصدق، مکاتیب شبلی اور انجمن ترقی اردو کی ابتدائی رودادوں کی روشنی میں انجمن سے متعلق علامہ شبلی کی گراں قدر خدمات کا مفصل جائزہ لیا جائے، اس لئے کہ انجمن کی تاریخ میں ان کا ذکر ضمنی ہو کر رہ گیا ہے۔

کتابیات

کتابیات

کتب

۱۔ آثار شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء

۲۔ آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۵۸ء

۳۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، ڈاکٹر منظر اعظمی اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو ۱۹۹۶ء

۴۔ افادات مہدی، بیگم مہدی افادی، شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور، ۱۹۴۹ء

۵۔ افکار ذاکر، پروفیسر اختر الواسع، مکتبہ جامعہ دہلی، ۲۰۰۵ء

۶۔ اقبال اور مشاہیر، طاہر تونسوی، مکتبہ نعیمیہ، دہلی، ۱۹۸۱ء

۷۔ اقبالیات اور قرۃ العین حیدر، نسیم عباس چودھری، اقبال اکیڈمی لاہور، ۲۰۰۹ء

۸۔ المامون، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء

۹۔ الفاروق، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء

۱۰۔ الفاروق ایک مطالعہ، پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۲۰۰۲ء

۱۱۔ باقیات شبلی، مشتاق حسین، آزاد کتاب گھر دہلی، ۱۹۶۴ء

۱۲۔ تذکرہ ماہ وسال، مالک رام، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۱ء

۱۳۔ تاریخ التاریخ، مولانا محمد مرتضٰی، روز بازار اسٹیم پریس امرت سر، ۱۹۱۱ء

۱۴۔ جامعات میں اردو تحقیق، رفیع الدین ہاشمی، ہائر ایجوکیشن کمیشن اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

۱۵۔ حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء

۱۶۔ خفتگان خاک لاہور، پروفیسر محمد اسلم، ادارہ تحقیقات پاکستان، لاہور، ۱۹۹۱ء

۱۷۔ خفتگان کراچی، پروفیسر محمد اسلم، ادارہ تحقیقات پاکستان، لاہور، ۱۹۹۳ء

۱۸۔ سرسید اوران کے نامور رفقاء، ڈاکٹر سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۴ء

۱۹۔ سرسید کی صحافت، پروفیسر اصغر عباس، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۲ء

۲۰۔ سیرۃ النبی جلد اول، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ طبع جدید، ۲۰۰۳ء

۲۱۔ شبلی سخنوروں کی نظر میں، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

۲۲۔ شبلی معاصرین کی نظر میں، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، اردو اکادمی لکھنو، ۲۰۰۵ء

۲۳۔ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ ۲۰۱۳ء

۲۴۔ علامہ شبلی معنویت کی بازیافت، ڈاکٹر شباب الدین، شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ ۲۰۰۸ء

۲۵۔ علم الاقتصاد، علامہ اقبال، لاہور، ۱۹۰۴ء

۲۶۔ عکس واثر، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

۲۷۔ کاروان خیال، مولانا ابوالکلام آزاد، مدینہ پریس بجنور

۲۸۔ کتابیات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء

۲۹۔ کلیات مکاتیب اقبال، سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۰ء

۳۰۔ متعلقات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء

۳۱۔ مجموعہ نظم شبلی مع سوانح عمری، سید ظہور الحسن، جی اینڈ سنس دہلی، ۱۹۱۶ء

۳۲۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل، سید طفیل احمد منگلوری، حماد الکتبی، لاہور

۳۳۔ مقالات سرسید جلد ۷، محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور

۳۴۔ مقالات شبلی، حصہ دوم، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء
۳۵۔ مقالات یوم شبلی، حافظ نذر احمد، مسلم اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۸ء
۳۶۔ مکاتیب شبلی حصہ اول، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء
۳۷۔ مکاتیب شبلی حصہ دوم، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء
۳۸۔ مکتوبات شبلی، مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء
۳۹۔ وضاحتی کتابیات، ترقی اردو بیورونئی دہلی، ۱۹۸۰ء
۴۰۔ وفیات اہل قلم، منیر احمد سلیچ، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء

رسائل

۴۱۔ ادیب، جامعہ اردو علی گڑھ [ماہنامہ] شبلی نمبر، مدیر ڈاکٹر ابن فرید، ستمبر ۱۹۶۰ء
۴۲۔ اردو ادب، دہلی [سہ ماہی] شبلی نمبر، مدیر ڈاکٹر خلیق انجم۔ ۱۹۹۶ء
۴۳۔ اسلام اور عصر جدید، دہلی، شبلی نمبر، مدیر: پروفیسر اختر الواسع، جولائی ۲۰۰۸ء
۴۴۔ البصیر، اسلامیہ کالج چنیوٹ، شبلی نمبر، مدیر: غلام دستگیر، ۱۹۵۷ء
۴۵۔ ماہنامہ ایوان اردو دہلی، مارچ ۲۰۰۸ء
۴۶۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، مشاہیر علی گڑھ، حصہ چہارم، مدیر ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
۴۷۔ ماہنامہ جامعہ دہلی، فروری ۱۹۵۹ء، اپریل ۱۹۶۸ء
۴۸۔ خاور، ڈھاکہ [ماہنامہ] شبلی نمبر، مدیر: عندلیب شادانی، اپریل ۱۹۵۳ء
۴۹۔ خضر راہ، لکھنؤ [ماہنامہ] شبلی نمبر، مدیر: حامد ندوی، مارچ ۱۹۳۰ء
۵۰۔ درس، جامعہ اردو، علی گڑھ [ماہنامہ]
۵۱۔ شبلی نیشنل کالج میگزین، اعظم گڑھ، شبلی نمبر، مدیر: ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی، ۲۰۰۷-۸ء

۵۲۔ شبلی نیشنل کالج میگزین، اعظم گڑھ، ۷۶-۱۹۷۵ء

۵۳۔ صبا، حیدر آباد، شبلی نمبر، مدیر: سلمان اریب، ۱۹۵۸ء

۵۴۔ فکر و نظر، علی گڑھ [سہ ماہی] شبلی نمبر، مدیر: پروفیسر شہریار، جون ۱۹۹۶ء

۵۵۔ کریسنٹ، لاہور، شبلی نمبر، مدیر: خالد بزمی، جنوری ۱۹۷۱ء

۵۶۔ ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ، مرتبہ ابو سلمان شاہجہاں پوری، مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کراچی، ۱۹۹۶ء

۵۷۔ ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ، مرتبہ عبد القوی دسنوی، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۸۸ء

۵۸۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ: مئی ۱۹۸۸ء، جون ۱۹۹۷ء، فروری ۲۰۰۷ء، جون ۲۰۱۰ء دسمبر ۲۰۱۳ء

۵۹۔ ہماری زبان دہلی [شبلی نمبر] مدیر، ڈاکٹر خلیق انجم، ۱۵-تا ۲۲ اپریل ۱۹۹۵ء

۶۰۔ ہماری زبان دہلی ۲۲-۲۸/ اپریل ۲۰۰۵ء و ۱-۷/ مئی ۲۰۰۵ء

۶۱۔ ہمایوں مئی ۱۹۳۰ء۔ میاں بشیر احمد

ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی اپنی نگارشات سے اردو زبان و ادب اور شبلی اور دبستان شبلی کی خدمت میں ایک عرصہ سے مسلسل مصروف ہیں۔ان کی دو درجن سے زاید کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔جن میں بعض بے حد اہم ہیں۔ان کی بنیادی دلچسپی شبلی اور دبستان شبلی سے ہے۔انہوں نے شبلی سے متعلق جو کام بھی کیا ہے وہ محنت، دل جمعی اور سنجیدگی سے کیا ہے۔اس میں فکر کی گہرائی بھی ہے اور خلوص کی گرمی بھی۔

ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی نے متعلقات شبلی، کتابیات شبلی، شبلی سخنوروں کی نظر میں، مکتوبات شبلی، شبلی کے نام اہل علم کے خطوط اور آثار شبلی تحریر کر کے شبلیات کے ذخیرہ میں گراں قدر اضافہ اور ماہر شبلیات کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔اس سے ان کی فکر و تحقیق کے نئے زاویے بنتے ہیں۔وہ ہمارے عہد کے وسیع المطالعہ ناقدین میں سے ہیں۔

دبستان شبلی کے علاوہ بعض دوسرے ادباء و شعراء اور ان کی ادبی کاوشوں کا انہوں نے جو تجزیہ کیا ہے، اس میں بھی ان کا محققانہ انداز اور تنقیدی بصیرت نمایاں ہے۔ جدید ادبی تقاضے بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں ۔ ان کے رواں، سلیس اور سادہ اسلوب بیان سے ان کی تحریریں دلچسپ بھی ہیں اور قابل مطالعہ بھی۔ان کی نئی کتاب ''شبلی شناسی کے سو سال'' یقین ہے شبلی شناسی میں سنگ میل ثابت ہوگی۔

پروفیسر عبدالستار دلوی

ADABI DAIRA, AZAMGARH
email : azami408@gmail.com
Website : www.drmiazmi.webs.com
Mob.: 9838573645